جھوٹن

(خودنوشت سوانح عمری)

ہندی سے اردو ترجمہ

راھین شمع

اوم پرکاش والمیکی

جھوٹن

(خودنوشت سوانح عمری)

مصنف

اوم پرکاش والمیکی

ہندی سے اردو ترجمہ

راھین شمع

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

"JHOOTAN"

(AUTOBIOGRAPHY)

by: OMPRAKASH WALMIKI

Translated by
RAHEEN SHAMA

Year of Edition 2016
ISBN 978-93-5073-901-3

₹ 200/-

نام کتاب : جھوٹن (مصنف اوم پرکاش والمیکی)

مترجم : راہین شمع

سن اشاعت : ۲۰۱۶ء

تعداد : ۲۰۰

قیمت : ۲۰۰ روپے

کمپوزنگ : محمد آصف جمال (7838794869)

طبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کے پتے

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23214465, 23216162, Fax: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

اِنتساب

اپنے والدین

کے نام

جن کی محبت ،شفقت ،محنت اور حوصلہ افزائی قدم قدم پر

مجھے حاصل رہی

پیش لفظ

غصّہ اور نفرت انسان کی فطری جبلّت ہے اور تعصّب اسی جبلّت کا ایک روپ ہے۔ اس کی ماہیت پیاز کی پرتوں کی طرح ہے کہ جتنا ہی اتارتے جایئے اُتنی ہی باریک قاشیں ہاتھ آتی ہیں ۔ یہ باریکی بڑی معنی خیز ہے۔ استحصال زدہ اور ستم رسیدہ انسانوں کی کہانی ادب کی کسی بھی صنف کے حوالے سے پڑھیں تو یہی تاثر ملتا ہے کہ محنت کش کو سر ابھارنے کا موقع نہ دینا سرمایہ دار کی بنیادی حکمتِ عملی ہے جس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا رہا ہے۔

سماجی و معاشرتی ، مذہبی و مسلکی ، طبقاتی اور گروہی تمام سطحوں پر کہیں واضح طور پر تو کہیں در پردہ تعصّب کی ضرور کارفرمائی نظر آئے گی۔ تعصب اپنی سرشت میں تسلّط پسندی کا مظاہرہ ہے۔ وہ معاشرے بھی جن کی مذہبی اور اخلاقی تعلیمات میں انسانی ، ہمدردی ، کارِ خیر اور احترام آدمیت کا باب خاصہ وسیع ہے وہ بھی اس سے خالی نہیں ہے۔

اودھ کے متمول خاندان کے چشم و چراغ نے شہر کے باہنر درزی سے شیروانی سلوائی تھی ۔ اتفاق سے اس کے ایک دامن میں کچھ کمی رہ گئی ۔نواب زادے نے درزی سے کوئی جرمانہ تو وصول نہیں کیا اور ڈانٹ ڈپٹ پر ہی اکتفا کی ۔لیکن اس سے انتقام دوسری شکل میں لیا۔ درزی شعر و ادب کا ذوق رکھتا تھا اور مقامی مشاعروں میں اسے کلام سنانے کا موقع مل جاتا تھا۔ وہ صاحبزادے اپنی شیروانی کا دامن دکھا دکھا کر باور کراتے تھے کہ شاعری شیروانی کی سلائی کی ہی طرح مشکل فن ہے۔

ہندی کے معروف ادیب اوم پرکاش والمیکی کی خودنوشت سوانح 'جھوٹن' کا راوی اپنی زندگی کے سفر میں اس اذیت سے نہ جانے کتنی بار گذرا ہوگا جو اس مثال کے مقابلے میں کہیں زیادہ سفاک ہے۔ جب چودھری کا بیٹا اس سے کہتا ہے کہ ابے چوہڑے کے! چاہے کتنا بھی پڑھ لکھ جا، رہے گا چوہڑا ہی تو اس کی اس دھمکی میں اقتدار پسند طبقے کا وہ غرور باآوازِ بلند بول رہا ہے جو مظلوم و محکوم انسانوں کو مستحکم اور آسودہ زندگی گذارتے دیکھنے

کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ہماری ادبی روایت میں دلت ادب اپنی شناخت قائم کر چکا ہے اور جوں جوں یہ سلسلہ آگے بڑھے گا قاری شاید یہ سوال کرے کہ کیا دلت طبقے کی تشکیل میں بنیادی کردار خاص پیشے اور مذہب کا ہی رہے گا اور دیگر محکوم و مقہور انسان اس حصار سے باہر رکھے جائیں گے۔

خود نوشت فطری زبان کا تقاضا کرتی ہے یعنی ایسی زبان جس میں انسان خواب دیکھتا ہے۔ اوم پرکاش نے اس تقاضے کا پورا لحاظ رکھا ہے اس لیے 'جھوٹن' کا یہ اردو ترجمہ بنیادی طور پر خط بدلی کا عمل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں بعض تہذیبی، معاشرتی اور محاوراتی نزاکتوں کے پیش نظر مترجم نے اپنے باشعور ہونے کا ثبوت خاصی حد تک پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ

نئی دہلی۔25

مقدمہ

اوم پرکاش والمیکی کا شمار ہندی ادب کی مشہور شخصیات میں ہوتا ہے۔ انھوں نے نثر اور نظم دونوں میں ہی طبع آزمائی کی۔ نظم میں ان کے شعری مجموعے 'صدیوں کا سنتاپ'، 'بس بہت ہو چکا'، 'اب اور نہیں' منظر عام پر آچکے ہیں۔ اور نثر میں افسانوی مجموعے 'سلام'، 'گھس پیٹھیا' شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ جس چیز نے ان کو مقبول و معروف بنایا وہ ان کی خود نوشت آپ بیتی 'جھوٹن' ہے جو ہندی ادب کی خود نوشتوں میں بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کو مختلف اعزازت سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر امبیڈکر سمان، جے شری سمان، ساہتیہ بھوشن، نیو انڈیا بک انعام، کتھا کرم سمان، اتر پردیش ہندی سنستھا کا سمان وغیرہ وغیرہ۔

اوم پرکاش والمیکی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری 'جھوٹن' کے لکھنے کی تاریخ کہیں بھی درج نہیں کی ہے کہ انھوں نے اس کو لکھنا کب شروع کیا۔ اس کو مکمل کب کیا۔ ان تمام چیزوں کی وضاحت کہیں نہیں ملتی ہے۔ راج کشوری جی (مشہور صحافی جو اس وقت نو بھارت ٹائمس میں تھے)، کی کتاب 'ہریجن اور دلت' جس کی منصوبہ بندی 1993ء میں کی گئی تھی۔ 1994ء میں جب یہ کتاب شائع ہوئی اسی میں اوم پرکاش والمیکی کا آپ بیتی والا مضمون 1994ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ والمیکی نے 'جھوٹن' کو 1994ء کے بعد ہی لکھنا شروع کیا ہوگا۔

خود نوشت سوانح حیات عام طور پر عمر کی آخری حصے میں ہی لکھی جاتی ہے لیکن اوم پرکاش والمیکی نے جب اپنی آپ بیتی لکھی تو اس وقت ان کی عمر 47/سال تھی۔ یہ اوم پرکاش والمیکی کی خود نوشت سوانح حیات 'جھوٹن' کا پہلا حصہ ہے۔ جس کا ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے 'جھوٹن' آٹھ مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ مثلاً: انگریزی، جرمن، سویڈش، پنجابی، تامل، ملیالم، کنڑ اور تیلگو وغیرہ۔ 7/نومبر 2003ء کو اوم پرکاش والمیکی کا انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کے دو سال کے عرصے کے بعد ان کی بیوی چندر

کلا عرف چندر عرف چندا نے خودنوشت سوانح عمری 'جھوٹن' کے دوسرے حصے کو بھی شائع کروا دیا ہے۔ رادھا کرشنن پبلی کیشن نے ہی 2015ء میں اس کو شائع کیا ہے۔

لغت میں دلت لفظ کے معنی: تباہ کیا ہوا، برباد کیا ہوا، ٹکڑے کیا ہوا، ستایا ہوا، ٹوٹا ہوا، مسلا ہوا، روندا ہوا اور دبایا ہوا کے ہیں۔ اس کے معنی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دلت ایک ایسا طبقہ ہے، جو ہمارے سماج میں صدیوں سے کچلا اور دبایا جا رہا ہے، جس پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے ہیں اور ذات کے نام پر ان کا استحصال ہوتا رہا ہے۔ جن کو ہمارے سماج میں سب سے نچلے درجے پر رکھا گیا، جن کو شودر اور اچھوت کہا گیا ہے۔ جس کو ہندوستان کے الگ الگ شہروں میں مختلف قسم کے ناموں سے جانا جاتا ہے۔ مثلاً: مہار، چمار، بھنگی، دلت، ہریجن، چوہڑا وغیرہ وغیرہ۔

ہندی میں دلت ادب پر بہت کام ہو چکا ہے۔ مراٹھی ادب نے دلت ادب کو ایک نیا موڑ دیا مگر اردو میں دلت ادب کی طرف بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے۔ اردو میں دلت ادب کی تھوڑی تھوڑی جھلک افسانوں میں دکھائی دیتی ہے۔ ان میں سب سے پہلے پریم چند کا نام آتا ہے، جنھوں نے اپنے افسانوں میں دلت کرداروں کو برتا ہے۔ پریم چند نے دیہی زندگی کو بہت ہی قریب سے دیکھا اور اس کو محسوس کیا ہے۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں جا بجا دلتوں کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانے اور ناولوں میں ذات پات اور چھوا چھوت پر مبنی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا ناول 'گئو دان'، افسانہ 'دودھ کی قیمت'، 'ٹھاکر کا کنواں'، 'کفن' وغیرہ ایسی تحریریں ہیں، جن میں دلتوں کی زندگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے علاوہ علی عباس حسینی کا افسانہ 'ہمارا گاؤں'، کرشن چندر کا 'کالو بھنگی'، سعادت حسن منٹو کا 'بھنگن' خواجہ احمد عباس کا 'تین بھنگی' وغیرہ دلتوں پر قابلِ ذکر افسانے ہیں۔ جنھوں نے دلتوں کی زندگی کو اجاگر کیا ہے۔

خودنوشت سوانح عمری کا مرکزی کردار سوانح نگار کی ذات ہی ہوا کرتی ہے۔ مگر قابلِ قدر سوانح وہ ہوتی ہے جس میں سوانح نگار اپنے ساتھ ساتھ اطراف و جوانب پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اوم پرکاش والمیکی کی سوانح حیات اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ اس میں

مرکزی کردار والمیکی تو ہیں ہی مگر انھوں نے اپنے قرب وجوار کی بھرپور عکاسی کی ہے۔
'جھوٹن' کسی ایک فرد کی کہانی نہیں بلکہ پورے اس عہد کی کہانی ہے۔ صدیوں سے ذات پات کی وجہ سے دلتوں کے ساتھ چھوا چھوت کا برتاؤ کیا جاتا رہا ہے۔ والمیکی لکھتے ہیں:

''چھوا چھوت کا ایسا ماحول کہ کتے، بلّی، گائے، بیل، بھینس کو چھونا برا نہیں تھا لیکن اگر چوہڑے سے چھو جائے تو پاپ لگ جاتا تھا۔ ان کو سماجی سطح پر انسانی درجہ نہیں دیا جاتا تھا۔ وہ صرف ضرورت کی چیز تھے۔ کام پورا ہوتے ہی ضرورت ختم۔ استعمال کرو دور پھینکو!...''

اونچی ذات والوں کی نیچی ذات والوں کے ساتھ بدسلوکی کے واقعات 'جھوٹن' میں جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ صدیوں سے ذات کے نام پر انسان ہی انسان کو دباتا چلا آرہا ہے۔ اگر کسی کی ذات سماج میں کم تر درجہ رکھتی ہے کیا اس کو زندگی میں تمام طرح کی محرومیوں کو جھیلنا پڑے گا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہمارا سماج ہم سے کر رہا ہے۔ کیا ذات چھوٹی ہونے کی وجہ سے انسان کے حق کو مارا جائے گا۔ آخر جب بھنگی ذات والا اپنی طرف سے تمام ذمہ داریاں نبھاتا رہا ہے، ہر کام کو کما حقہ ادا کرتا ہے تو اس کو اس کے کام کی اجرت کیوں نہیں ملتی؟ اور اس کام کے بدلے میں ملتی ہیں تو گالیاں۔ صرف اس لیے کہ وہ بھنگی ہے یا چمار ہے۔ اوم پرکاش والمیکی آزاد ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے تب بھی یہی سوال قائم تھا اور تھوڑے بہت ردوبدل کے بعد بھی پھر یہی سوال قائم ہے بس ذلیل کرنے کا طریقہ بدل گیا ہے۔ اکیسویں صدی ہونے کے باوجود ہندوستان ابھی تک ذات پات کے خول سے باہر نکل ہی نہیں پایا ہے۔

اوم پرکاش والمیکی سماج سے یہی سوال قائم کرتے ہیں کہ:

''اپنی محنت کی قیمت مانگنا گناہ کیوں ہے؟ جمہوری حکومت کی دہائی دینے والے لوگ سرکاری مشنری کا استعمال رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کرتے ہیں جیسے کہ ہم اس ملک کے شہری ہی نہیں۔ کمزور اور بے بسوں کو ہزاروں سالوں سے اسی طرح

دبایا گیا ہے۔''

اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ہمارے سماج میں انسان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بلکہ ذات کی اہمیت ہے۔ ذات کی بنیاد پر ہی انسان کی قدر و قیمت متعین کی جاتی ہے۔

اوم پرکاش والمیکی خود ایک ادیب ہیں اور ادیب عام انسانوں سے زیادہ حساس ہوتا ہے اور دوسروں کے مقابلے چیزوں کو زیادہ قریب سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ اسی لیے اوم پرکاش والمیکی نے ذات کے نام پر ملنے والی ذلالت، جبر و تشدد، ظلم و زیادتی، دھتکار خود بھی جھیلی ہیں اور دوسروں کو سہتے ہوئے دیکھا ہے۔

'جھوٹن' اوم پرکاش والمیکی کی ہی زندگی کا پرتو نہیں ہے بلکہ پورے دلت سماج کا آئینہ ہے۔ ادب سماج اور زندگی کا ہی ترجمان ہوتا ہے۔ والمیکی نے اپنی زندگی کی حقیقت کو سماج کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

سعادت حسن منٹو کی تحریروں پر لوگوں نے طرح طرح کے سوالات قائم کیے تھے۔ ان کی تحریروں پر فحاشیت کا الزام لگایا گیا اور ان پر مقدمے بھی چلے۔ منٹو ان تمام باتوں کا دفاع کرتے ہوئے ایک ہی جواب دیا کرتے کہ میں وہی لکھتا اور دکھاتا ہوں جو سماج میں ہو رہا ہے۔ بالکل اسی طرح ہندی ادبا نے بھی اوم پرکاش والمیکی کی خود نوشت سوانح عمری 'جھوٹن' پر بھی طرح طرح کے سوال اٹھائے ہیں کہ وہ خود ذات کو سب کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں یا وہ ذات کے خول میں قید ہیں۔ منٹو کی طرح والمیکی بھی یہی کہتے ہیں کہ:

''جو سچ ہے اسے سب کے سامنے پیش کرنے میں جھجھک کیسی؟''

اوم پرکاش والمیکی نے وہی دکھانے کی کوشش کی ہے جو اس وقت سماج میں ہو رہا تھا۔ یہ المیہ صرف ان کی ہی زندگی کا نہیں ہے بلکہ ان کی آپ بیتی تمام دلت سماج کا مرثیہ ہے۔ 'جھوٹن' ہمارے ذہن میں یہ سوال قائم کرتی ہے کہ ہم دیکھیں کس طرح کے سماج میں سانس لے رہے ہیں، جہاں انسانیت تو برائے نام دیکھنے کو ملتی ہے۔

اوم پرکاش والمیکی نے یہ سوانح لکھ کر گویا سماج کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی ہے کہ ہم ایسے ملک اور ایسے سماج میں زندگی گذار رہے ہیں جہاں انسانیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے

جبکہ انسانیت کا کوئی مذہب یا اس کی کوئی ذات نہیں ہوتی۔ ہمارے سامنے والمیکی نے جس ہندوستانی سماج کو پیش کیا ہے وہ ایک آزاد ہندوستان ہے لیکن وہ آزادی سارے انسانوں کے لیے نہیں بلکہ صرف اونچی ذات والوں تک ہی محدود ہے۔

اوم پرکاش والمیکی خود ایک ڈرامہ نگار تھے اور ساتھ ہی اداکاری اور ہدایت کاری بھی کیا کرتے تھے، جس کا پورا پورا اثر ان کی خودنوشت سوانح عمری 'جھوٹن' میں جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ یعنی جس کردار کو جو زبان بولنی چاہیے والمیکی نے اس کردار سے وہی زبان بلوائی ہے۔ 'جھوٹن' کی زبان سے علاقائیت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ہریانوی اور کھڑی بولی کا پورا پورا اثر دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر:

''ابے چوہڑے کے... آجا... دو اچّھر کیا پڑھ لیے سوہرے (سور) دماغ چڑھ گیا ہے... ابے اوکات مت بھول۔''

''کیوں مدرسے جاڑا چھوڑ دیا... آگے نی پڑھے گا؟''

اخیر میں میں پروفیسر اے جے ناوریہ کا شکر ادا کرتی ہوں جنہوں نے میری اس کتاب کے ترجمے کی طرف رہنمائی کی۔ ترجمے کے اس سفر میں میری حوصلہ افزائی اور رہنمائی کے لیے میں استاد محترم ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی صاحب کی تہہ دل سے شکر گذار ہوں کہ انہوں ترجمہ کے اس کام کو باریک بینی سے نہ صرف دیکھا ہے بلکہ میری اصلاح بھی کی ہے۔ ان کے بعد محمد آصف جمال صاحب کی ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے ابتدا سے آخیر تک میری معاونت کی۔

راہین شمع

ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ

نئی دہلی۔25

سوانحی خاکہ: اوم پرکاش والمیکی

نام :اوم پرکاش والمیکی (شاعراورادیب)

پیدائش :30/جون1950ء۔گاؤں: برلا۔ضلع:مظفرنگر (اترپردیش)ہندوستان

تعلیم :ایم۔اے(ہندی ادب)

شادی :27/دسمبر1973ء۔بیوی چندرکلاعرف چندر،عرف چندا

شائع شدہ کتب

:جھوٹن۔۱۹۹۷میں سب سے پہلی بار۔"رادھا کرشنن پیپربیکس" سے شائع ہوئی

ہندی کے علاوہ انگریزی، جرمن، سویڈش، پنجابی، تامل، ملیالم، کنڑاور تیلگو میں ترجمہ ہوچکی ہے۔

شعری مجموعہ

:صدیوں کا سنتاپ،1989ء

:بس بہت ہوچکا،1997ء

:اب اورنہیں،2009ء

افسانوی مجموعے

:سلام،2000ء

:گھس پیٹھا 2004ء

تحقیقی مضامین

:دلت ساہتیہ کا سوندریہ شاستر 2001ء

:مکھیہ دھارااوردلت ساہتیہ

:صفائی دیوتا،2009ء

:دلت ساہتیہ:انوبھو، سنگھرش اور یتھارتھ

- ''سائرن کا شہر''۔ مصنف۔ ''ارون کالے''، شعری مجموعہ کا مراٹھی زبان میں ترجمہ کیا۔
- ''میں ہندو کیوں نہیں''۔ کا چا ایلیا کی انگریزی کتاب کا ہندی ترجمہ۔
- اس کے علاوہ لوک ناتھ یشونت کی بہت سی مراٹھی نظموں کا ہندی میں ترجمہ کیا۔
- تقریباً 60 سے زائد ڈراموں میں اداکار اور ہدایت کار کی حیثیت سے کام کیا۔
- 'دو چہرے' اور 'جھوٹن' کو بھی مختلف شہروں میں اسٹیج کیا۔
- مختلف سیمینار میں شرکت۔
- علی گڑھ نصاب میں مختلف توضیحات۔
- اس کے علاوہ مختلف یونیورسٹیوں میں ان کی تحریریں شامل نصاب ہیں۔
- 28/ویں اِسمتا درشن ساہتیہ کانفرنس 2008، (جبل پور)
- شملہ سوسائٹی کے ممبر
- دلت لیکھک ساہتیہ کانفرنس، 1993ء
- سرکاری انسٹی ٹیوٹ میں ملازمت
- ناگپور کے صدر
- 8/واں عالمی وشو ہندی کانفرنس۔ 2007ء

انعامات

:ڈاکٹر امبیڈکر سمان 1993ء

:جے شری سمان 1996ء

:پریویش سمان 1995ء

:ساہتیہ بھوشن سمان 2008ء

:نیو انڈیا بک انعام 2004ء

:کتھا کرم سمان 2001ء

:نیویارک، امریکن سمان، اتر پردیش ہندی سنستھا کا سمان

مصنف کی طرف سے

دلت زندگی کی مصیبتیں نا قابل برداشت تجربات سے بھری ہوئی ہیں، ایسے تجربات جنہیں ادیبوں نے بیان نہیں کیا ہے۔ ایک ایسے سماجی آئین میں ہم نے سانسیں لی ہیں جو بے حد نفرت بھرا، بے رحم اور انسانیت شکن ہے۔ اور دلتوں کے تئیں بے حس بھی۔

اپنے دکھ کی کہانی کو تحریری شکل دینے کا خیال میرے ذہن میں کافی پہلے سے تھا لیکن بہت کوشش کے باوجود میں ناکام رہا۔ کتنی ہی بار لکھنا شروع کیا اور ہر بار صفحات کو پھاڑتا رہا۔ کہاں سے شروع کروں اور کیسے کروں؟ بس یہی مشکل درپیش تھی۔ کچھ دوستوں کی رائے تھی کہ خودنوشت کے بجائے ناول لکھوں۔ اچانک دسمبر 1993ء کو راج کشوری جی کا خط آیا۔ وہ 'آج کے پرشن' کے سلسلے میں 'ہریجن سے دلت' کتاب کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے اس کتاب کے لیے دس گیارہ صفحات میں، میں اپنے تجربات کو آپ بیتی کے پیرایے میں لکھوں۔ ان کی گزارش تھی کہ تجربات سچے اور معتبر و مستند ہوں۔ کرداروں کے نام چاہیں تو بدل بھی سکتے ہیں۔ راج کشوری جی کے اس خط نے میرے دل میں بے چینی پیدا کر دی۔ کچھ دن تو اسی کشمکش میں گذر گئے۔ اور ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ اسی دوران راج کشوری کا دوسرا خط آیا اس تاکید کے ساتھ کہ جنوری 1994ء کے آخر تک مسودہ بھیجو، کتاب پریس میں جانے کے لیے تیار ہے۔ معلوم نہیں کشوی جی کے اس خط میں ایسا کیا تھا، میں نے اسی رات اپنے ابتدائی دنوں کے کچھ صفحات لکھ ڈالے۔ اور اگلے ہی دن راج کشوری جی کو بھیج دیے۔ ایک ہفتہ تک ان کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ فون پر بات ہوئی تو پتا چلا کہ اس مسودے کو وہ چھاپ رہے ہیں۔

'ہریجن اور دلت' اس کتاب کا پہلا ہی عنوان تھا۔ 'ایک دلت کی آپ بیتی' کتاب کے شائع ہوتے ہی پڑھنے والوں کے خطوط کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دور دراز دیہاتی علاقوں سے پڑھنے والوں کی رائے مجھ تک پہنچی۔ دلت طبقہ کے پڑھنے والوں کو ان صفحات میں اپنی تکلیفیں دکھائی دے رہی تھیں۔ تمام لوگوں کی گزارش تھی کہ میں اپنے تجربات کو تفصیل سے لکھوں۔

ان تجربات کو لکھنے میں مختلف قسم کی پریشانیاں تھیں۔ لمبی جدّ و جہد کے باوجود میں نے

سلسلہ وار لکھنا شروع کیا۔ تمام تکلیفوں، درد اور ذلّت کو ایک بھر جینا پڑا۔ اس دوران میں نے ذہنی سختیاں برداشت کیں۔ خود کو پرت در پرت اُدھیڑتے ہوئے کئی بار لگا کہ یہ سب کتنا درد بھرا ہے۔ کچھ لوگ اس پر یقین نہیں کرتے ان کو بس مبالغہ آمیز باتیں لگتی ہیں۔

کئی دوست تو اس بات پر حیران تھے کہ تم ابھی سے آپ بیتی لکھ رہے ہو۔ ان سے میری درخواست ہے کہ اگر وہ لوگ میری کامیابی کو ترازو پر رکھ کر اس مشکلوں بھری کہانی کو تولیں گے تو ان کو کچھ ہاتھ نہیں لگے گا۔ ایک دوست کی یہ بھی صلاح تھی کہ میں اپنی آپ بیتی لکھ کر اپنے تجربات کی پونجی کھا رہا ہوں۔ ایک دوست کا یہ بھی کہنا تھا کہ اپنے آپ کو ننگا کر کے آپ سماج میں نفرت کو بڑھاوا دیں گے۔ ایک بے حد قریبی دوست کو خوف ستا رہا ہے کہ انھوں نے لکھا ہے کہ اپنی آپ بیتی لکھ کر آپ اپنی شہرت و ناموری ہی نہ کھو دیں۔

جو سچ ہے اسے سب کے سامنے پیش کرنے میں جھجک کیسی؟ جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا، ان میں اپنے آپ کو بڑا دکھانے کا خیال ہے۔

ان سے میری درخواست ہے کہ اس درد کو وہی جانتا ہے جس نے اس کو برداشت کیا ہے۔ اس عمل میں بہت کچھ ایسا ہے جو لکھا نہیں گیا، یا میں لکھ نہیں پایا ہوں۔ شاید وہ میری قوت سے باہر تھا۔ اسے آپ میری کمزوری مان سکتے ہیں۔

کتاب کا عنوان رکھنے میں میری راجیندر یادو جی نے بہت مدد کی۔ اپنی مشغولیت بھری زندگی سے وقت نکال کر مسوّدے کو پڑھا اور بہتر مشورے بھی دیے۔ انھوں نے ہی مشورہ دیا کہ اس کتاب کا نام 'جھوٹن' رکھا جائے۔ یہاں پر ان کا شکریہ ادا کرنا رسماً ہوگا۔ بلکہ ان کے مشورے اور ان کی رہنمائی میرے لیے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

کنول بھارتی اور ڈاکٹر شیوراج سنگھ نے اس دوران مجھے ذہنی سہارا دیا۔ اور آخر میں اشوک مہیشوری جی جن کے بغیر شاید یہ کتاب مکمل ہی نہ ہو پاتی۔ اس کو چھاپنے میں جو دلچسپی انھوں نے دکھائی، اس سے میری بہت سی مشکلوں کا حل خود ہی نکل آیا۔

اوم پرکاش والمیکی

4 نیو روڈ اسٹریٹ

کلالو نوالی گلی، دہرادون۔ 248001۔ (اتر پردیش۔ موجودہ اتراکھنڈ)

جھوٹن

(خودنوشت سوانح عمری)

ہمارا گھر چندر بھان تگا کے گھیر سے ملا ہوا تھا۔اس کے بعد کچھ گھرانے مسلمان بنکروں کے تھے۔چندر بھان تگا کے گھر کے ٹھیک سامنے ایک چھوٹی سی جوہڑی تھی جس نے چوہڑوں کے باغ اور گاؤں کے درمیان ایک فاصلہ بنا دیا تھا۔جوہڑی کا نام ڈبو والی تھا۔یہ بتانا مشکل ہے کہ ڈبّو والی نام کیسے پڑا۔ہاں!...اتنا ضرور ہے کہ اس ڈبّو والی جوہڑی کی شکل ایک بڑے گڑھے کی طرح تھی۔جس کے ایک طرف تگاؤں کے پکّے مکانوں کی اونچی دیواریں تھیں۔مثلث نماں دیواریں جو دو تین جھوپڑوں کے کچے مکانوں کی تھیں پھر اس کے بعد تگاؤں کے مکان تھے۔

جوہڑی کے کنارے پر چوہڑوں کے مکان تھے۔جن کے پیچھے گاؤں بھر کی عورتیں، جوان لڑکیاں، بڑی بوڑھیاں یہاں تک کہ نئی نویلی دلہنیں بھی اسی ڈبّو والی کے کنارے کھلے میں فراغت حاصل کرنے بیٹھ جاتی تھیں۔رات کے اندھیرے میں ہی نہیں بلکہ دن کے اجالے میں بھی پردوں میں رہنے والی تیاگی عورتیں گھونگھٹ کاڑھے، دوشالے اوڑھے اس عام جائے ضرورت (عام بیت الخلا) میں سکون پاتی تھیں۔تمام شرم لحاظ چھوڑ کر وہ ڈبّو والی کے کنارے جسم کے پوشیدہ حصّوں کو اگھاڑ کر بیٹھ جاتیں تھیں۔اسی جگہ گاؤں بھر کے لڑائی جھگڑے گول میز کانفرنس کی شکل میں ہوتے تھے۔چاروں طرف گندگی بھری ہوتی تھی۔ایسی بدبو کہ منٹ بھر میں سانس گھٹ جائے۔تنگ گلیوں میں گھومتے سور، ننگ دھڑنگ بچے، کتّے، روزمرہ کے جھگڑے، بس یہ تھا وہ ماحول جس میں بچپن گذرا۔اس ماحول میں اگر ذات پات والے نظام کو مثالی نظام کہنے والون کو دو چار دن بھی رہنا پڑ جائے تو ان کی رائے بدل جائے گی۔

اسی باگڑ میں ہمارا کنبہ رہتا تھا۔پانچ بھائی، ایک بہن، دو چاچا، اور ایک تاؤ کا گھر۔چاچا اور تاؤ الگ رہتے تھے۔گھر میں سبھی کوئی نہ کوئی کام کرتے تھے۔لیکن دوجن کی روٹی ٹھیک ڈھنگ سے نہیں چل پاتی تھی۔تگاؤں کے گھروں میں صاف صفائی سے لے کر کھیتی باڑی، محنت مزدوری سب ہی کام کرتے تھے۔اوپر سے رات بے رات بیگاری بھی کرنی پڑتی تھی۔بیگار کے بدلے کوئی پیسہ یا اناج نہیں ملتا تھا۔بیگار کے لئے نہ کہنے کی ہمّت کسی

میں نہیں تھی۔گالی گلوچ اور تکلیف دینا الگ...نام لے کر پکارنے کی تو کسی کو عادت ہی نہیں تھی۔عمر میں بڑا ہو تو 'او چوہڑے' اگر ہم عمر یا چھوٹا ہے تو 'ابے چوہڑے کے' یہی طریقہ تھا بلانے کا۔

چھوا چھوت کا ایسا ماحول کہ کتّے ،بلّی ،گائے بھیس کو چھونا برا نہیں تھا۔لیکن اگر چوہڑے سے چھو جائے تو پاپ لگ جاتا۔ان کو سماجی سطح پر انسانی درجہ نہیں دیا جاتا تھا۔وہ صرف ضرورت کی چیز تھے۔کام پورا ہوتے ہی ضرورت ختم۔استعمال کرو دور پھینکوں!...

ہمارے محلّے میں ایک عیسائی آتے تھے۔نام تھا سیوک رام مسیحی۔جو بڑوں کے بچوں کو گھیر کر بیٹھے رہتے۔ان کو پڑھنا لکھنا سکھاتے تھے۔سرکاری اسکول میں تو کوئی اندر جانے نہیں دیتا تھا۔سیوک رام مسیحی کے پاس صرف مجھے ہی بھیجا گیا تھا اور بھائی تو کام کرتے تھے۔بہن کو اسکول بھیجنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ماسٹر سیوک رام مسیحی نے کھلے،بنا کمروں،بنا ٹاٹ چٹائی والے اسکول میں پڑھانا شروع کیا تھا۔ایک دن سیوک رام مسیحی اور میرے والد میں کچھ کھٹ پٹ ہوگئی تھی۔والد صاحب مجھے لے کر بیسک پرائمری اسکول گئے ،جو پانچویں کلاس تک کا تھا۔وہاں ماسٹر ہر پھول سنگھ تھے۔ان کے سامنے میرے والد صاحب نے گڑگڑا کر کہا تھا:

''ماسٹر جی ،تھاری مہربانی ہوجاگی جو مہارے اس جاتک (بچہ) کو بی دوا چھر سکھا دو گے۔''

ماسٹر ہر پھول سنگھ نے اگلے دن آنے کو کہا تھا۔والد صاحب اگلے روز پھر گئے۔کئی دن تک اسکول کے چکّر کاٹتے رہے۔آخر ایک روز اسکول میں داخلہ مل ہی گیا۔ان دنوں ملک کو آزادی ملے آٹھ سال ہوگئے تھے۔چھوا چھوت کے خلاف گاندھی جی کی آواز سنائی پڑ رہی تھی۔سرکاری اسکولوں کے دروازے اچھوتوں کے لیے کھلنے شروع ہوگئے تھے۔لیکن عام لوگوں کی سوچ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔اسکول میں دوسروں سے دور بیٹھنا پڑتا تھا...وہ بھی زمین پر!...اپنے بیٹھنے کی جگہ تک آتے آتے چٹائی چھوٹی پڑ جاتی تھی۔کبھی کبھی تو ایک دم پیچھے دروازے کے پاس بیٹھنا پڑتا تھا۔جہاں سے بورڈ پر لکھے

الفاظ بھی دھندلے دکھائی دیتے تھے۔

تیاگیوں کے بچے 'چوہڑے کا' کہہ کر چڑھاتے تھے۔ کبھی کبھی بلا وجہ پٹائی بھی کر دیتے تھے۔ عجیب تکلیفوں بھری زندگی تھی جس نے مجھے چڑچڑا اور تنک مزاج بنا دیا تھا۔ اگر اسکول میں پیاس لگی ہو تو ہینڈ پمپ کے پاس کھڑے رہ کر کسی کے آنے کا انتظار کرنا پڑتا۔ ہینڈ پمپ چھونے پر تو وبال ہی کھڑا ہو جاتا۔ لڑکے تو پیٹتے ہی تھے، ماسٹر لوگ بھی ہینڈ پمپ چھونے پر سزا دیتے تھے۔ طرح طرح کے ہتھکنڈے اپنائے جاتے تاکہ میں اسکول چھوڑ کر کر بھاگ جاؤں اور میں ان ہی کاموں میں لگ جاؤں جس کے لئے میں پیدا ہوا ہوں۔ ان کے مطابق، اسکول آنا ایسی خواہش تھی جس پر میرا کوئی حق نہیں تھا۔

میرے ہی کلاس میں رام سنگھ اور سکھن سنگھ بھی تھے۔ رام سنگھ ذات کا چمار تھا اور سکھن سنگھ جھیور (دھیمر)۔ رام سنگھ کے ماں باپ کھیتوں میں مزدوری کرتے تھے۔ سکھن سنگھ کے والد انٹر کالج میں چپراسی تھے۔ ہم تینوں ایک ساتھ پڑھے، بڑے ہوئے اور بچپن کے کھٹے میٹھے تجربات سمیٹے تھے۔ تینوں پڑھنے میں ہمیشہ آگے رہے۔ لیکن ذات کا چھوٹا پن قدم قدم پر فریب دیتا رہا۔

کچھ مسلمان تیاگی برلا گاؤں میں بھی تھے۔ تیاگیوں کو ہی تگا کہتے تھے۔ مسلمان تگاؤں کا سلوک بھی ہندؤں جیسا ہی تھا۔ کبھی کوئی اچھا صاف ستھر کپڑا پہن کر اگر نکلے تو طرح طرح کی باتیں سننی پڑتی تھیں۔ ایسی چوٹیں جو مجھے تیر کی طرح اندر تک اتر جاتی تھیں۔ ایسا ہمیشہ ہی ہوا کرتا تھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہن کر کلاس میں جاؤ تو ساتھ کے لڑکے کہتے:

''ابے چوہڑے کا، نئے کپڑے پہن کر آیا ہے...''

میلے پرانے کپڑے پہن کر اسکول جاؤ تو کہتے:

''ابے چوہڑے کا، دور ہٹ... بدبو آرہی ہے۔''

عجیب حالات تھے۔ دونوں ہی حالت میں بے عزت ہونا پڑتا تھا۔ چوتھی کلاس میں تھے۔ ہیڈ ماسٹر بشمبر سنگھ کی جگہ کلی رام آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک اور ماسٹر آئے تھے۔ ان

کے آتے ہی ہم تینوں کے بہت برے دن آ گئے تھے۔ بات بے بات پر پٹائی ہو جاتی۔ رام سنگھ تو کبھی کبھی بچ بھی جاتا۔ لیکن سکھن سنگھ اور میری پٹائی تو عام بات تھی۔ ان دنوں میں ویسے بھی کافی کمزور اور دبلا پتلا تھا۔

سکھن کے پیٹ پر پسلیوں کے ٹھیک اوپر ایک پھوڑا ہو گیا تھا۔ جس سے ہر وقت پیپ بہتی رہتی تھی۔ کلاس میں وہ اپنی قمیص اوپر کی طرف اس طرح موڑ کر رکھتا کہ پھوڑا کھلا رہے۔ ایک تو قمیص پر پیپ لگنے کا ڈر، دوسرے ماسٹر کی پٹائی کے وقت پھوڑے کو کیسے بچایا جا سکے؟

ایک دن ماسٹر نے سکھن سنگھ کو مارتے وقت اس پھوڑے پر ایک گھونسا دے مارا۔ سکھن کی دردناک چیخ نکلی، پھوڑا پھوٹ چکا تھا۔ اسے تڑپتے دیکھ مجھے بھی رونا آ گیا۔ ماسٹر ہم لوگوں کو روتا دیکھ کر لگاتار گالیاں بک رہا تھا۔ ایسی گالیاں جنھیں اگر لفظوں میں بیان کردوں تو ہندی زبان پر دھبّہ لگ جائے گا۔ کیونکہ میری ایک کہانی ''بیل کی کھال'' میں ایک کردار کے منھ سے گالی دلوا دینے پر ہندی کے بڑے ادیبوں نے ناک بھوں سکوڑی تھی۔ اتفاق سے گالی دینے والا کردار برہمن تھا۔ برہمن یعنی برہمہ کا عالم اور گالی؟

اساتذہ کا مثالی نمونہ جو میں نے دیکھا وہ ابھی تک میرے ذہن سے مٹا نہیں ہے۔ جب بھی کوئی مثالی استاد کی بات کرتا ہے تو مجھے وہ تمام اساتذہ یاد آجاتے ہیں جو ماں بہن کی گالیاں دیتے تھے۔ خوبصورت لڑکوں کے گال سہلاتے تھے اور انھیں اپنے گھر بلا کر ان سے واہیات پن کرتے تھے۔

ایک روز ماسٹر کلی رام نے اپنے کمرے میں بلا کر پوچھا: ''کیا نام ہے بے تیرا؟''

''اوم پرکاش'' میں نے ڈرتے ڈرتے دبی آواز میں اپنا نام بتایا۔

ہیڈ ماسٹر کو دیکھتے ہی بچے سہم جاتے تھے۔ پورے اسکول میں ان کی دہشت تھی۔

''چوہڑے کا ہے؟'' ہیڈ ماسٹر کا دوسرا سوال اچھلا۔

''جی''

''ٹھیک ہے... وہ جو سامنے شیشم کا پیڑ کھڑا ہے۔ اس پر چڑھ جا اور ٹہنیاں توڑ کے جھاڑو بنڑا لے۔ پتوں والی جھاڑو بنڑانا اور پورے اسکول کو ایسے چمکا

دے جیسا سیسہ، تیرا تو یو کھاندانی کام ہے، جا پھٹا پھٹ لگ جا کام پے۔''

ہیڈ ماسٹر کے حکم پر میں نے اسکول کے کمرے، برآمدے صاف کر دئے۔ تب وہ خود چل کر آئے اور بولے:

''اس کے بعد میدان بھی صاف کر دے۔''

لمبا چوڑا میدان میرے وجود سے کئی گنا بڑا تھا، جسے صاف کرنے سے میری کمر درد کرنے لگی تھی۔ دھول سے چہرہ، سراٹ گیا تھا۔ منھ کے اندر دھول گھس گئی تھی۔ میری کلاس کے باقی بچے پڑھ رہے تھے اور میں جھاڑو لگا رہا تھا۔ ہیڈ ماسٹر اپنے کمرے میں بیٹھے تھے لیکن ان کی نظر مجھ پر ٹکی تھی۔ پانی پینے تک کی اجازت نہیں تھی!... پورا دن میں جھاڑو لگاتا رہا۔ تمام تجربات کے باوجود کبھی اتنا کام نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی گھر میں بھائیوں کا میں لاڈلا تھا۔

دوسرے دن اسکول پہنچا۔ جاتے ہی ہیڈ ماسٹر نے پھر جھاڑو کے کام پر لگا دیا۔ پورے دن جھاڑو دیتا رہا۔ دل میں ایک تسلّی تھی کہ کل سے کلاس میں بیٹھ جاؤں گا۔ تیسرے دن میں کلاس میں جا کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی دہاڑ سنائی پڑی

''ابے، او چوہڑے کے، مادر چود کہاں گھس گیا... اپنی ماں...''

ان کی دہاڑ سن کر میں تھر تھر کانپنے لگا۔ ایک تیاگی لڑکے نے چلاّ کر کہا:

''ماس ساب! وہ بیٹھا ہے کوڑے میں۔''

ہیڈ ماسٹر نے لپک کر میری گردن دبوچ لی۔ ان کی انگلیوں کا دباؤ میری گردن پر پڑ رہا تھا۔ جیسے کوئی بھیڑیا بکری کے بچّے کو دبوچ کر اٹھا لیتا ہے۔ کلاس سے باہر کھینچ کر اس نے مجھے برآمدے میں لا پٹکا، چیخ کر بولے:

''جا لگا پورے میدان میں جھاڑو... نہیں تو گاڑ میں مرچی ڈال کے اسکول کو باہر کاڑ (نکال) دوں گا۔''

خوف زدہ ہو کر میں نے تین دن پرانی وہی شیشم کی جھاڑو اٹھالی۔ میری طرح اس کے بھی پتّے سوکھ کر جھڑنے لگے تھے۔ بچی تھی صرف پتلی پتلی ٹہنیاں۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ روتے روتے میدان میں جھاڑو لگانے لگا۔ اسکول کے کمروں کی کھڑکی،

دروازوں سے اساتذہ اور لڑکوں کی آنکھیں چھپ کر تماشا دیکھ رہی تھیں۔ میرا رواں رواں تکلیف کی گہری کھائی میں لگا تار گر رہا تھا۔

میرے بابا اچانک اسکول کے پاس سے گذرے۔ مجھے اسکول کے میدان میں جھاڑو لگاتا دیکھ ٹھٹھک گئے۔ باہر سے ہی آواز دے کر بولے:

''منشی جی، یو کیا کررا ہے۔''

وہ پیار سے مجھے منشی جی کہا کرتے تھے۔ انھیں دیکھ کر میں زاروقطار رونے لگا۔ وہ اسکول کے میدان میں میرے پاس آ گئے۔ مجھے روتا دیکھ کر بولے:

''منشی جی... روتے کیوں ہو؟ ٹھیک سے بول کیا ہوا ہے؟''

میری ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ ہچک ہچک کر پوری بات بابا کو بتا دی کہ تین دن سے جھاڑو لگوا رہے ہیں۔ کلاس میں پڑھنے بھی نہیں دیتے۔

بابا نے میرے ہاتھ سے جھاڑو چھین کر دور پھینک دی۔ ان کی آنکھوں میں جیسے آگ اتر آئی۔ ہمیشہ دوسروں کے سامنے نشانہ بنے رہنے والے میرے بابا کی لمبی لمبی گھنی مونچھیں غصّہ سے پھڑ پھڑانے لگیں۔ چیختے ہوئے بولے:

''کوڑ سا ماسٹر ہے وہ دروڑ اچاریہ کی اولاد، جو میرے لڑکے سے جھاڑو لگواوے ہے۔''

بابا کی آواز پورے اسکول میں گونج رہی تھی، جسے سن کر ہیڈ ماسٹر کے ساتھ تمام ٹیچرس باہر آ گئے۔ کلی رام ہیڈ ماسٹر نے گالی دے کر میرے بابا کو دھمکایا بھی لیکن ان پر دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس روز جس ہمّت اور حوصلے سے بابا نے ہیڈ ماسٹر کا سامنا کیا، میں اس بات کو کبھی نہیں بھول پایا۔ والد صاحب میں کئی طرح کی کمزوریاں تھیں لیکن میرے مستقبل کو جو موڑ اس روز انھوں نے دیا، اس کا اثر میری شخصیت پر بھی پڑا۔

ہیڈ ماسٹر نے تیز آواز میں کہا تھا:

''لے جا اسے یہاں سے... چوہڑا ہو کے پڑھانے چلا ہے... جا چلا جا... نہیں تو ہاتھ پیر تڑوا دونگا۔''

بابا نے میرا ہاتھ پکڑا اور گھر کی طرف چل دئے۔ جاتے جاتے ہیڈ ماسٹر کو سنا کر بولے:

''ماسٹر ہو اس لئے جا رہا ہوں... پر اتنا یاد رکھیے ماسٹر... یو چوہڑے کا یہیں پڑھے گا...اسی مدرسے میں اور یو ہی نہیں اس کے بعد اور بھی آویں گے پڑھنے کو۔''

بابا کو یقین تھا کہ گاؤں کے تیاگی ماسٹر کلی رام کی اس حرکت پر اسے شرمندہ کریں گے۔لیکن ہوا بالکل الٹا۔جس کا دروازہ کھٹکھٹایا یہی جواب ملا:

''کیا کرو گے اسکول بھیج کے۔''یا''کوا بھی ہنس بن سکے،تم ان پڑھ گنوار لوگ کیا جانو،ودیہ(علم)ایسے حاصل نہ ہوتی۔''

''ارے!چوہڑے کے بچے کو جھاڑو لگانے کو کہہ دیا تو کون سا جلم ہو گیا۔''

''یا پھر جھاڑو ہی تو لگوائی ہے،درونہ چاریہ کی تریوں گرو دکھشنا میں انگوٹھا تو نہیں مانگا۔''

وغیرہ وغیرہ۔

بابا تھک ہار کر لوٹ آئے۔بنا کھائے پیئے رات بھر بیٹھے رہے۔پتہ نہیں کون سی سختی کو جھیل رہے تھے۔صبح ہوتے ہی انہوں نے مجھے ساتھ لیا اور پردھان سگوا سنگھ تیاگی کی بیٹھک میں جا پہنچے۔

بابا کو دیکھتے ہی پردھان بولا:

''ابے چھوٹن...کیا بات ہے؟تڑکے تڑکے آلیا۔''

''چودھری صاحب،تم تو کہوں تے سرکار نے چوہڑوں کے جاتکو(بچو)کے لئے مدرسوں کے دروازے کھول دیے ہیں۔اور یہاں وہ ہیڈ ماسٹر میرے اس جاتک کو پڑھانے کے بجائے کلاس سے باہر لا کے دن بھر جھاڑو لگواوے ہے۔جب یو دن بھر مدرسے میں جھاڑو لگاوے گا تو اب تم ہی بتاؤ پڑھے گا کب؟''

بابا پردھان کے سامنے گڑگڑا رہے تھے۔ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔میں پاس کھڑا بابا کو دیکھ رہا تھا۔

پردھان نے مجھے اپنے پاس بلا کر کہا:

''کونسی کلاس میں پڑھے ہے؟''

''جی، چوتھی میں''

''مہارے مہیندر کی کلاس میں ہی ہو؟''

''جی''

پردھان جی نے بابا سے کہا:

''فکر نہ کر، کل مدرسے میں اسے بھیج دیڑا۔''

اگلے روز ڈرتے ڈرتے میں اسکول پہنچا، ڈرا ہوا کلاس میں بیٹھا رہا۔ ہر لمحہ یہی لگتا تھا اب آیا ہیڈ ماسٹر...اب آیا۔ ذرا سی آہٹ پر دل گھبرانے لگتا تھا۔ اسکے بعد حالات تھوڑے بہتر ہو گئے تھے۔ لیکن کلی رام ہیڈ ماسٹر کو دیکھتے ہی میری روح کانپ جاتی تھی۔ لگتا جیسے سامنے سے ماسٹر نہیں کوئی جنگلی سور منھ اٹھائے چیچیاتا چلا آرہا ہے۔

گیہوں کی فصل کٹنے کے وقت محلّے کے سبھی لوگ گاؤں کے کھیتوں میں گیہوں کاٹنے جاتے۔ تپتی دوپہری میں گیہوں کاٹنا بہت تکلیف دہ اور مشکل بھرا ہوتا ہے۔ سر پر برستی دھوپ، نیچے تپتی زمین، ننگے پاؤں میں کٹے پودوں کی جڑیں کانٹوں کی طرح تلووں میں چبھتی تھیں۔ ان سے بھی زیادہ چبھن سرسوں اور چنے کی جڑوں سے ہوتی تھی۔ کاٹنے میں ایک اور مشکل تھی۔ چنے کے پتوں پر کھٹائی ہوتی ہے جو کاٹتے وقت پورے جسم پر چپک جاتی ہے۔ نہانے پر بھی کم نہیں ہوتی ہے۔ کٹائی کرنے والے زیادہ تر چوہڑے یا چمار ہی ہوتے تھے۔ جن کے جسم پر کپڑے برائے نام ہی ہوتے تھے۔ پاؤں میں جوتا ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ ننگے پاؤں فصل کٹنے تک بری طرح زخمی ہو جاتے تھے۔

فصل کٹائی کو لے کر اکثر کھیتوں میں بڑی حجّت ہوتی تھی۔ مزدوری دینے میں زیادہ تر تگا کنجوسی کرتے تھے۔ کاٹنے والوں کی مجبوری تھی، جو بھی ملتا تھوڑا بہت، منع کرنے کے بعد اسے ہی لے کر گھر لوٹ آتے۔ گھر آکر کڑھتے رہتے یا تگاؤں کو کوستے رہتے۔ لیکن بھوک کے سامنے مخالفت دم توڑ دیتی۔ ہر سال فصل کٹائی کو لے کر محلّے میں بیٹھکیں ہوا کرتی تھیں۔ سولہ پولی پر ایک پولی اُجرت لینے کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔ لیکن کٹائی شروع

ہوتے ہی بیٹھکوں کے تمام فیصلے، قسمیں ناپید ہو جاتے تھے۔ ایک پولی پر ایک پولی مزدوری ملتی تھی۔ ایک پولی میں ایک کلو سے بھی کم گیہوں نکلتا۔ بھاری سے بھاری پولی میں بھی ایک کلو گیہوں نہیں نکلتا تھا۔ یعنی دن بھر کی مزدوری ایک کلو گیہوں سے بھی کم۔ کٹائی کے بعد بیل گاڑی یا چھوٹی بگھی (بھینسا بگھی) میں لدائی، اترائی الگ۔ اس کا کوئی پیسہ یا اناج نہیں ملتا تھا۔ دیر سویر کھیتوں میں بیل ہانکنے کی بیگار سبھی کو کرنی پڑتی تھی۔ ان دنوں گیہوں صاف کرنے والے 'تھریشر' نہیں ہوا کرتے تھے۔ بیلوں کو گولائی میں گھما گھما کر گیہوں کی بالیوں کو بھوسے کی شکل میں بدلا جاتا۔ پھر بھوسے سے گیہوں چھاج سے ہوا میں اڑا کر الگ کیا جاتا۔ یہ کافی لمبا اور تھکا دینے والا کام تھا، جسے زیادہ تر چمار یا چوہڑے ہی کیا کرتے تھے۔

میری ماں ان سب محنت مزدوریوں کے ساتھ ساتھ آٹھ دس تگاؤں (ہندو، مسلمان) کے گھر اور گھیر (مردوں کے بیٹھنے کی جگہ اور مویشی باندھنے کی جگہ) میں صاف صفائی کا کام کرتی تھی۔ اس کام میں میری بہن، بڑی بھابھی اور جسبیر اور جنیسر (دو بھائی) ماں کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ بڑا بھائی سکھبیر تگاؤں کے یہاں سالانہ نوکر کی طرح کام کرتا تھا۔

ہر ایک تگا کے گھر میں دس پندرہ مویشی (گائے، بھینسیں اور بیل) ہونا عام بات تھی۔ ان کا گوبر اٹھا کر گاؤں سے باہر کرڑیوں (کوڑے کا ڈھیر) یا اپلے بنانے کی جگہ ڈالنا پڑتا تھا۔ ہر ایک گھیر سے روز پانچ، چھ ٹوکرے گوبر نکلتا تھا۔ سردی کے مہینوں میں یہ کام اور تکلیف دہ ہوتا۔ گائے بھینس اور بیلوں کو سردی سے بچانے کے لئے بڑے بڑے دالانوں میں باندھا جاتا۔ جن میں گنّے کی سوکھی پاتی یا پھوس بچھا دی جاتی تھی۔ رات بھر جانوروں کا موت اور گوبر پورے دالان میں پھیل جاتا۔ دس پندرہ دنوں میں ایک بار پاتی بدلی جاتی یا ان کے اوپر سوکھی پاتی بچھا دی جاتی تھی۔ دالانوں میں اتنے دنوں بھری بدبو سے گوبر ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنا بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ بدبو سے سر گھوم جایا کرتا۔

ان سب کاموں کے بدلے ملتا تھا ہر دو جانور پر فصل کٹائی کے وقت پانچ سیر (ساڑے چار کلو) اناج۔ دس مویشی والے گھر سے سال بھر میں 25 سیر (لگ بھگ 21-22 کلو) اناج۔ دوپہر کو ہر ایک گھر سے بچی کچی روٹی، جو خاص طور سے چوہڑوں کو

دینے کے لیے آٹے میں بھوسا ملا کر بنائی جاتی تھی۔ کبھی کبھی جھوٹن بھی بھنگن کی ٹوکری میں ڈال دی جاتی تھی۔

شادی کے موقعوں پر جب مہمان یا باراتی کھانا کھا رہے ہوتے تو چوہڑے دروازوں کے باہر بڑے بڑے ٹوکرے لے کر بیٹھے رہتے۔ بارات کے کھانا کھا لینے کے بعد جھوٹی پتلوں کو ان ٹوکروں میں ڈال دیا جاتا جنھیں گھر لے جا کر وہ (چوہڑے) جھوٹن جمع کر لیتے۔ پوڑیوں کے بچے کچے ٹکڑے، ایک آدھ مٹھائی کا ٹکڑا یا تھوڑی بہت سبزی پتّل پر پا کر باچھیں کھل جاتی تھیں۔ جھوٹن چٹخارے لے کر کھائی جاتی۔ جس بارات کی پتّلوں سے جھوٹن کم اترتی تھی، کہا جاتا تھا کہ بھکّڑ (بھوکے) لوگ آ گئے ہیں بارات میں جنھیں کبھی کھانے کو کچھ نہیں ملا، سارا چٹ کر گئے۔ اکثر ایسے موقعوں پر بڑے بزرگ ایسی باراتوں کا ذکر بہت ہی مزے لے لے کیا کرتے کہ اس بارات سے اتنی جھوٹن آئی تھی کہ مہینوں تک کھاتے رہے۔

پتّلوں سے جو پوریوں کے ٹکڑے جمع ہوتے تھے انھیں دھوپ میں سکھا لیا جاتا۔ چارپائی پر کوئی کپڑا ڈال کر انھیں پھیلایا جاتا۔ اکثر مجھے پہرے پر بٹھایا جاتا کیونکہ سوکھنے والی پوریوں پر کوے، مرغیاں، کتے اکثر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ذرا سی آنکھ بچی کہ پوریاں صاف۔ اس لئے ڈنڈا لے کر چارپائی کے پاس بیٹھنا پڑتا تھا۔ یہ سوکھی پوریاں برسات کے مشکل دنوں میں بہت کام آتی تھیں۔ انھیں پانی میں بھگو کر ابال لیا جاتا۔ ابلی ہوئی پوریوں پر باریک پسی ہوئی مرچیں اور نمک ڈال کر کھانے میں بڑا مزا آتا تھا۔ کبھی کبھی گڑ ڈال کر لگدی جیسا بنا لیا جاتا، جسے سب ہی بہت شوق سے کھاتے تھے۔

آج جب میں ان سب باتوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں کانٹے اگنے لگتے ہیں کہ کیسی زندگی تھی؟ دن رات مر کھپ کر بھی ہمارے پسینے کی قیمت تھی صرف جھوٹن۔ پھر بھی کسی سے کوئی شکایت نہیں؟ کوئی شرمندگی نہیں؟ کوئی پچھتاوا نہیں؟

میں جب چھوٹا تھا ماں اور بابا کا ہاتھ بٹانے ان کے ساتھ جایا کرتا۔ تگاؤں (تیاگیوں) کے کھانے کو دیکھ کر اکثر سوچا کرتا کہ ہمیں ایسا کھانا کیوں نہیں ملتا؟ آج جب سوچتا ہوں تو جی متلانے (مچلانے) لگتا ہے۔

گاؤں سے میرا پتہ لے کر ابھی پچھلے سال میرے گھر پر سکھ دیو سنگھ تیا گی کا پوتا سریندر آیا تھا، کسی انٹرویو کے سلسلے میں۔ رات میں رکا۔ میری بیوی نے اسے جتنا ہو سکتا تھا اتنا اچھا کھانا کھلایا۔ کھانا کھاتے کھاتے وہ بولا:

''بھابھی جی اپ کے ہاتھ کا کھانا تو بہت ذائقے دار ہے۔ ہمارے گھر میں تو کوئی بھی ایسا کھانا نہیں پکا سکتا۔''

اس کی بات سن کر میری بیوی تو خوش ہوئی۔ لیکن میں کافی دیر تک بے چین رہا۔ بچپن کے واقعات میرے ذہن کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔

سریندر تب پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی بڑی بوا یعنی سکھ دیو سنگھ تیا گی کی لڑکی کی شادی تھی۔ ان کے یہاں میری ماں صفائی کیا کرتی تھی۔ شادی کے دس بارہ دن پہلے سے ماں، بابا نے سکھ دیو سنگھ تیا گی کے گھر آنگن سے لے کر باہر تک کے تمام کام کیے تھے۔ بیٹی کی شادی کا مطلب گاؤں بھر کی عزت کا سوال تھا۔ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ والد صاحب نے گاؤں بھر سے چارپائیاں ڈھوڈھو کر گھر میں اکٹھی کی تھیں۔

بارات کھانا کھا رہی تھی۔ ماں ٹوکرا لیے دروازے سے باہر بیٹھی ہوئی تھی، اس سے میں اور میری چھوٹی بہن مایا چپکے ہوئے بیٹھے تھے۔ اس امید میں کہ اندر سے جو مٹھائی اور کھانوں کی خوشبو آ رہی ہے، وہ ہمیں بھی کھانے کو ملیں۔ جب سب لوگ کھانا کھا کر چلے گئے تو میری ماں نے سکھ دیو سنگھ تیا گی کو دالان سے باہر آتے دیکھ کر کہا:

''چودھری جی، اب تو سب کھاڑا کھا کے چلے گئے... مہارے جاتک (بچے) کو بھی ایک پتّل پر دھر کے کچھ دے دو۔ وہ بھی اس دن کا انتجار کر رے رتے۔''

سکھ دیو سنگھ نے جھوٹی پتّلوں سے بھری ٹوکری کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''ٹوکرا بھر کے جھوٹن لے جا رہی ہے... اوپر سے جاتکوں کے لئے کھاڑا مانگ ری ہے؟ اپڑی اوقات میں رہ چوہڑی! اٹھا ٹوکرا دروجّے سے اور چلتی بن۔''

سکھ دیو سنگھ کے یہ الفاظ میرے سینے میں نشتر کی طرح اتر گئے۔ جو آج بھی اپنی جلن سے مجھے جھلسا رہے ہیں۔ اس روز ماں کی آنکھوں میں درگا اتر آئی تھی۔ ماں کی ویسی کیفیت

میں نے پہلی بار دیکھی تھی ۔ ماں نے ٹوکرا وہیں بکھیر دیا۔اور سکھ دیو سنگھ سے کہا:

''اسے ٹھا کے اپنے گھر میں دھر لے،کل تڑ کے باراتیوں کا ناشتے میں کھلا دیڑا...''

ہم دونوں بھائی بہن کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے اٹھ کر چل دی تھی ۔سکھ دیو سنگھ ماں پر ہاتھ اٹھانے کے جھپٹا بھی تھا۔لیکن میری ماں نے بنا ڈرے شیرنی کی طرح سامنا کیا تھا۔اس کے بعد ماں کبھی ان کے دروازے پر نہیں گئی اور جھوٹن کا سلسلہ اس واقعہ کے بعد بند ہوگیا۔

وہی سکھ دیو سنگھ میرے گھر پر ایک بار آیا تھا۔میری بیوی نے گاؤں دیہات کے بزرگ کے ناتے ان کی خاطر تواضع کی۔اس نے میرے گھر میں کھانا بھی کھایا۔لیکن جب وہ چلا گیا تو میرے بھتیجے بنجے خیروال،(جو بی۔ایس۔سی۔کا طالب علم ہے) نے بتایا کہ چاچا جی انھوں نے اپ کے گھر کھایا ہے، ہمارے گھر تو پانی تک نہیں پیا تھا۔

میرے بڑے بھائی سکھبیر سوچیت تگا کے یہاں سالانہ نوکری کرتے تھے۔میں ان دنوں پانچویں کلاس میں تھا۔ان کی عمر تقریباً 25-20 سال رہی ہوگی۔گہرے سانولے رنگ کے لمبے چھریرے کسرتی بدن کے تھے۔ایک روز ایک جنگلی سانڈ گاؤں میں گھس آیا تھا۔کئی لوگوں کو اس نے اپنے نوکیلے سینگھوں سے زخمی کر دیا تھا۔تگاؤں کے گھیروں (جہاں مویشی باندھے جاتے ہیں) میں گھس کر بیلوں،بھیسوں اور گایوں کو زخمی کر چکا تھا۔لوگ چھتوں پر چڑھ کر تماشا دیکھ رہے تھے۔کسی بھی تگا میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ جنگلی سانڈ کو گاؤں سے باہر نکال دے۔سکھبیر اس وقت سوچیت کے کھیت سے واپس آرہا تھا۔شور سن کر اس نے چھت پر چڑھ کر تگاؤں سے پوچھا تو سانڈ کے بارے میں سنا،سکھبیر نے سانڈ کو صرف ایک لاٹھی کے بھروسے ہی گاؤں سے بھگایا تھا۔اسکے حوصلے اور طاقت کی پورے گاؤں میں دھاک بیٹھ گئی تھی ۔ بہت دنوں تک گاؤں میں اس واقعہ کی چرچا ہوتی رہی تھی۔

ایک دن کام سے واپس آئے تو بخار سے پورا بدن تپ رہا تھا۔ایک ہفتے بھر تک بستر پر پڑے رہے۔بہتر دوا اور علاج کے نہ ہونے کی وجہ سے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔گھر پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔سب کچھ بکھر گیا تھا۔اس حادثہ سے بابا بری طرح ٹوٹ گئے۔ماں کا یہ حال تھا کہ ذرا ذرا سی دیر میں بے ہوش ہو جاتی ۔ بھابھی کم عمری میں ہی بیوہ ہوگئیں۔گھر

کی حالت جو بھائی کی وجہ سے بہتر ہو رہی تھی، اچانک ایک خطرناک موڑ پر آ گئی۔ جب سے بھائی نے کام کرنا شروع کیا تھا، کوئی بھی چھوٹا بھائی بہن، بھابھی کسی بھی تگا کے یہاں کام نہیں کرتا تھا۔ بابا اور چاچا سڑک بنانے والے ٹھیکے داری یا کوئی ایسا ہی کام کرنے لگے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، بھائی کے رہتے میری بڑی بھابھی اور چھوٹی بہن کبھی گھر سے باہر نہیں نکلیں۔ میں نے بھی کبھی کسی کے گھر جا کر جھاڑو نہیں لگائی۔

ہماری برادری میں بیوہ عورتوں کی شادی کو شروع سے ہی منظوری ملی ہوئی تھی۔ ہندو رسم ورواج کی طرح بیوہ عورتوں کی شادی کو بری نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ گاؤں کے بزرگوں اور رشتے داروں کی موجودگی میں میرے مرحوم بھائی سکھبیر کے سسر نے اپنی بیوہ بیٹی کا رشتہ سکھبیر سے چھوٹے جسبیر سے طے کر دیا تھا۔ جسے سماجی طور پر سبھی نے قبول کیا۔ مرحوم بھائی کا بڑا لڑکا نریندر تقریباً ڈیڑھ سال کا تھا اور بھابھی حمل سے تھی۔ اور دیویندر بھائی کی موت کے چھ سات ماہ بعد پیدا ہوا تھا۔

اس حادثہ کے بعد گھر کا سارا بوجھ جسبیر کے کندھوں پر آ گیا۔ گاؤں سے جو ملتا اس سے گذارا نہیں ہو پا رہا تھا۔ گھر کی معاشی حالت بہت نازک تھی۔ ایک دن 'تیرتھ رام اینڈ کمپنی' کے ساتھ جسبیر آدم پور چلا گیا۔ ان دنوں آدم پور (پنجاب) میں ہندوستانی فضائی فوج کے لئے ہوائی اڈّا بن رہا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ کمپنی باگ ڈوگرا (بنگال) کا ہوائی اڈّا بنانے چلی گئی۔ کئی مہینوں بعد باگ ڈورا سے جسبیر کا خط آیا تھا۔

بنگال کا نام سنتے ہی ماں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ ماں کے ذہن میں بنگال کے بارے میں مختلف قسم کے خیالات تھے۔ اس وقت وہ رابندر ناتھ ٹیگور جیسے متحرک شخص کا بنگال نہیں تھا۔ کالے جادو، ٹونے، ٹوٹکے کا بنگال تھا۔ جہاں عورتیں آدمی کو جادو سے بکرا بنا کر آنگن میں باندھ لیتی تھیں۔ جس دن سے خط ملا تھا، ماں دن رات روتی رہتی تھی۔

''ایک بیٹا دنیا سے چلا گیا، دوسرا پردیس۔''

گھر پر تو جیسے منحوسیت چھا گئی تھی۔ بھابھی بیمار رہنے لگیں۔ گھر میں روٹی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ جو بھی مل جاتا کھا لیتے۔ نہ کوئی ہنستا اور نہ کوئی ایک دوسرے سے بات

چیت کرتا۔ بھابھی گم سم گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہتی۔ جیسے ہر کوئی اپنے اپنے خول میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

میں پانچویں کلاس پاس کر چکا تھا۔ چھٹی کلاس میں داخلہ لینا تھا۔ برلا ہی میں 'تیاگی انٹر کالج' تھا، جس کا نام بدل کر 'برلا انٹر کالج، برلا' کر دیا گیا۔ اس وقت گھر کے جو حالات تھے، ان میں داخلہ لینے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جہاں روٹی ہی نصیب نہ ہو، وہاں پڑھائی کے بارے میں کوئی کیسے سوچ سکتا ہے؟

اسکول کے ساتھیوں کو کتابیں لے جاتے دیکھتا تو دل بھر آتا۔ مجھ سے بڑے بھائی جنیسر تھے۔ ہم دونوں بھائی صبح ہی گھر سے نکل جاتے، کھیتوں میں گھوم گھوم کر جنگلی گھاس اپنی بھینس کے لئے جمع کرتے تھے۔ انتقال سے کچھ دن پہلے سکھبیر نے ایک بھینس سوچیت تگا سے بٹائی پر لی تھی۔ ممکن تھا کہ بیانے پر کچھ نہ کچھ آمدنی ہو جائے۔ اس لیے ہم دونوں بھائی اس کی خدمت میں لگے رہتے۔ دوپہر بعد میری سور چرانے کی ذمہ داری تھی۔ سور ہمارے زندگی کا اہم حصہ تھے۔ شادی، بیماری، زندگی اور موت سبھی میں سور کی اہمیت تھی۔ یہاں تک کہ پوجا بھی سور کے بغیر، نامکمل تھی۔ آنگن میں گھومتے سور گندگی نہیں تھے بلکہ خوشحالی کی علامت تھے، جو آج بھی ویسے ہی ہیں۔ ہاں تعلیم یافتہ طبقے (جس کی فیصد شرح اب بھی کم ہے) نے خود کو ان عقائد سے الگ کر لیا ہے۔ یہ تبدیلی کسی خاص نظریہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ اس کو حقیر سمجھتے ہیں۔ ایسے گندے خیالات پڑھے لکھے لوگوں میں کچھ زیادہ ہی ہیں، وہ بھی سماجی دباؤ کی وجہ سے۔

ایک دن میں سور چرا کر گھر لوٹ رہا تھا۔ راستہ میں سکھن سنگھ مل گیا۔ اس نے روک کر پوچھا:

''کیوں مدرسے جاڑا چھوڑ دیا، آگے نی پڑھے گا؟''

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ بہت دیر تک اسکول میں ہونے والی تبدیلیوں کی بات کرتا رہا کہ جہاں پہلے پرائمری اسکول میں چٹائی پر بیٹھتے تھے، اب وہاں کرسی اور ڈیسک ہیں۔ استاد پٹائی بھی کم کرتے ہیں۔ ہر ایک موضوع کا الگ استاد ہے۔

جب میں گھر لوٹا تو میرا دل بہت اداس تھا۔ میں اندر ہی اندر پگھل رہا تھا۔ اسکول نہ جا پانے کی مجبوری نے مجھے مایوس کر دیا تھا۔ بار بار انٹر کالج کی بڑی عمارت آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ گھر پہنچتے ہی میں نے ماں سے کہا:

''ماں، میتنے اسکول جاڑا ہے۔''

میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ میری آنسوؤں سے بھری آنکھیں دیکھ کر ماں کو بھی رونا آ گیا۔ ماں جب روتی تھی تو ایک ہی سانس میں شکوے شکایتیں کرنے لگتی تھی۔ جسے سن کر آس پڑوس کی عورتیں ماں کے ارد گرد جمع ہو جاتیں۔ وہ جتنا ماں کو سمجھانے کی کوشش کرتیں، ماں اتنا ہی زور سے روتی تھی۔ بھابھی الگ بیٹھی سسک رہی تھی۔ ویسے بھی بھائی کی موت کے بعد سب سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ بھابھی کے پاس زیورات کے نام پر چاندی کی ایک پازیب تھی۔ جسے وہ ہمیشہ اپنی شادی کے کپڑوں کے ساتھ سنبھال کر رکھتی تھی۔ ماں کا رونا دھونا تو جاری ہی تھا۔ بھابھی نے اپنا ٹین کا بکس کھولا اور پازیب نکال کر ماں کے ہاتھ میں رکھ دی۔

''اسے بیچ کے للا جی کا داکھلا کرا دو۔''

آس پڑوس کی عورتیں میری بھابھی کے اس پیار کو دیکھ کر حیران ہو گئی تھیں۔ میں خود بھی بھابھی سے لپٹ کر رو یا۔ اس وقت مجھے اپنے بڑے بھائی سکھبیر کی بہت یاد آئی تھی۔ وہ دن آج بھی میرے اندر حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ بابا نے بھابھی کو بہت منع کیا:

''نہ بہو...اسے نہ بیچ...میں کچھ نہ کچھ کر کے اسے اسکول بھیجونگا، تو پھکر نہ کر...ایک ہی تو چیج ہے تیرے پاس...اسے بھی بیچ دے...رکھ لے اسے۔''

بھابھی نہیں مانی اور ضد کر کے ماں کے ہاتھ میں وہ پازیب دے دی۔ ویدھ ستیہ نارائن شرما مذہبی رسومات ادا کرنے کے ساتھ ساتھ چاندی سونے کے زیورات گروی رکھنے، خریدنے اور سود پر پیسہ دینے کا دھندا کرتے تھے۔ ماں نے پازیب ان کے پاس گروی رکھ دی اور اس طرح چھٹی کلاس میں میرا داخلہ ہو گیا۔

رام سنگھ، سکھن سنگھ دوسرے سیکشن میں تھے میرا رول نمبر سب سے آخری تھا۔ اس

لئے سب سے پیچھے بیٹھتا تھا۔ میرے پاس والی سیٹ شرون کمار شرما کی تھی۔ ویسے تو پہلی کلاس میں ہم لوگ ساتھ تھے۔ لیکن پاس پاس بیٹھنے سے دوستی اور بڑھ گئی۔ شرون کمار خوبصورت اور بے حد دلکش تھا۔ بالکل لڑکیوں جیسا نازک۔ ہم دونوں کے بیچ کبھی ذات نہیں آئی۔ یہ ایک الگ تجربہ تھا۔ میرے ساتھیوں میں رام سنگھ اور سکھن سنگھ بھی تھے۔ لیکن سکھن سنگھ میرے گھر کبھی نہیں آیا۔ اکثر میں اس کے گھر جایا کرتا تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ بعد میں ہمارے تعلقات گھریلو سطح پر بھی بن گئے۔ آج ان کا بڑا بیٹا رجنیش مجھے اور میری بیوی کو بہت عزت دیتا ہے۔

شاید سکھن سنگھ میں جھجھک تھی جو کہ شرون کمار میں نہیں تھی۔ ان دنوں شرون کمار اور میرے بیچ ایک تیسرا دوست اور جڑ گیا تھا۔ جس کا نام چندر پال ورما تھا۔ جو مانڈلا گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ذات سے گوجر تھا۔ وہ ہمیشہ شرون کمار کو تنگ کیا کرتا۔ کبھی اس کے گال نوچ لیتا، کبھی اسے دھکا مار دیتا، کبھی اس کی کتابیں چھپا دیتا۔ ایسا تقریباً ہر روز ہوا کرتا تھا۔

ایک دن کلاس سے باہر نکلتے ہوئے اس نے شرون کمار کو کس کے پکڑا اور اس کے گال پر کاٹ لیا۔ پوری کلاس نے یہ تماشا دیکھا۔ کوئی کچھ نہ بولا، سب لوگ زور زور سے ہنس رہے تھے۔ شرون کمار رونے لگا۔ چندر پال سنگھ ورما بھی ہنس رہا تھا۔ اس لمحہ پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔ اپنے سے قد کاٹھی میں دوگنے چندر پال کی گردن میں نے اپنے بازو میں دبوچ لی اور اسے نیچے گرا دیا۔ چندر پال گردن چھڑانے کے لئے کسمساتا رہا لیکن میری گرفت سے نہیں چھوٹا۔ اس روز چندر پال مجھ پر ناراض نہیں ہوا۔ صرف ہنستا رہا اور شرون کمار سے بھی معافی مانگ لی۔

اس واقعہ کے بعد ہم تینوں اچھے دوست بن گئے تھے۔ یہ دوستی ایسی تھی کہ ایک دوسرے کے بغیر ادھورا پن لگتا تھا۔ چھٹی ہونے پر میں اور شرون کمار سڑک کے راستہ گھر نہیں جاتے بلکہ کھیتوں، پگڈنڈیوں سے گھوم کر گھر پہنچتے تھے۔ یہ ہر روز کا اصول بن گیا تھا۔

چندر پال سے دوستی کا اثر اتنی جلدی دکھائی دیا کہ تیاگی لڑکوں کی چھینٹا کشی، دھتکار سے چھٹکارا مل گیا۔ اب پانی پینے کے لیے نل پر انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ چندر پال کے

سامنے سب کی ہوا ٹائٹ ہو جاتی تھی۔ وہ جسے چاہے مار دیتا تھا۔ ویسے بھی تیاگی لڑکے گوجر لڑکوں سے ڈرتے تھے۔

ششماہی امتحان میں میں اپنے سیکشن میں فرسٹ آیا تھا۔ اس نتیجہ نے میرے اندر خود پر خود اعتمادی پیدا کر دی۔ امتحان کے بعد مجھے اپنے کلاس کا مانیٹر بنا دیا گیا۔ اب پیچھے بیٹھنے کے بجائے آگے بیٹھنے لگا۔ اساتذہ کا برتاؤ اب بھی ٹھیک نہیں تھا۔ ان کا رویہ نفرت بھرا تھا۔

مجھے ثقافتی پروگراموں سے دور رکھا جاتا۔ ایسے مواقع پر صرف سامعین کی حیثیت سے کھڑا رہتا۔ اسکول کے سالانہ جشن میں، جب ناٹک وغیرہ کی مشق ہوا کرتی، میری بھی خواہش ہوتی کہ اداکاری کا کا موقع مل جائے۔ لیکن ہمیشہ دروازے کے باہر کھڑا رہنا پڑتا ۔ دروازے کے باہر کھڑے رہنے کے اس درد کو کہانی لکھنے والے سمجھ نہیں سکتے۔

تمام اساتذہ تیاگی تھے۔ طالب علموں میں تیاگیوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ ان کے خلاف بولنے کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔ امتحان کے دنوں میں پیاس لگنے پر ہم گلاس میں پانی نہیں پی سکتے تھے۔ ہتھیلیوں کو جوڑ کر اوک سے پانی پینا پڑتا تھا۔ پلانے والے چپراسی بھی بہت اوپر سے پانی ڈالتے تھے کہ کہیں گلاس ہاتھوں سے نہ لگ جائے۔

اسکول میں ایک لائبریری تھی جس میں کتابوں پر دھول جمی ہوتی تھی۔ اسی لائبریری میں پہلی بار میرا تعارف کتابوں سے ہوا۔ آٹھویں کلاس میں پہنچتے پہنچتے شرت چندر، پریم چند، رابندر ناتھ ٹیگور کو پڑھ ڈالا تھا۔ شرت چندر کے کرداروں نے میرے کچے ذہن کو بہت گہرائی تک چھوا تھا۔ پڑھنے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان دنوں میں اپنے ہی خیالوں میں گم رہتا تھا۔

ڈبیا (ڈھبری) کی مدھم روشنی میں ماں کو ناول کہانیاں پڑھ کر سنانے لگا تھا۔ نہ جانے کتنی بار شرت چندر کے کرداروں نے ماں بیٹے کو ایک ساتھ رلایا تھا۔ یہیں سے شروع ہوا ادبی رجحان۔ ان پڑھ، اچھوت خاندان میں پیدا ہوئے اس بیٹے نے اپنی ان پڑھ ماں کو 'آلہا'، 'رامائن'، 'مہا بھارت' سے لے کر، سُر ساگر، پریم ساگر، سکھ ساگر، پریم چند کی کہانیاں 'طوطہ مینا' کے قصے ..جو بھی ملا سنا دیا۔

اپریل 1993ء میں راجیندر یادو جی (ایڈیٹر ہنس) کا خط ملا۔انہوں نے دلّی کی مزدور بستیوں میں داستان گوئی کا پروگرام رکھا تھا۔ مجھے بھی کہانی سننے کا موقع ملا۔ پہلا پروگرام 'والمیکی مندر' مندر مارگ میں تھا۔کہانی سننے کے بعد ایک عجیب سا احساس ہوا۔اس روز اچانک ماں کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔ادب اور قارئین کے درمیاں جو فاصلہ ہوتا ہے اسے ختم کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ جاہل آدمی ادب پڑھ نہیں سکتا۔جو پڑھ سکتا ہے وہ خرید کر پڑھنے کے قابل نہیں۔داستان گوئی کے ذریعہ ادب ادیبوں اور پڑھنے والوں کے درمیاں ایک رابطہ قائم ہوتا ہے۔

جیسے جیسے میری پڑھائی آگے بڑھ رہی تھی۔آس پڑوس کے ہم عمر ساتھیوں کا ساتھ چھوٹنے لگا تھا، جو اسکول نہیں جاتے تھے۔بھنگی بستی سے ست پال اور ہرم سنگھ اسکول جانے لگے تھے۔یعنی تیس خاندانوں کے صرف تین لڑکے اسکول جاتے تھے۔

چھٹی کلاس کے بعد رام سنگھ، سکھن سنگھ اور میں پھر سے سیکشن میں آگئے۔رام سنگھ پڑھنے میں سب سے تیز تھا۔میں اور رام سنگھ اسکاؤٹ جماعت کا حصّہ بن گئے تھے۔اسکول سے خاکی ہاف پتلون اور قمیص ملی تھی۔اسکاؤٹ ٹیچر رمیش چندر نے وردی دھوکر پریس کرنے کو کہا تھا۔اس وقت تک میں نے کبھی پریس کیا ہوا کپڑا نہیں پہنا تھا۔تیاگی لڑکوں کے کلف لگے، دھلے کپڑوں کو دیکھ کر میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ میں بھی ایسے ہی کپڑے پہن کر اسکول جاؤں گا؟ کبھی کبھی تو تیاگیوں کے گھر سے ملی اترن پہننی پڑتی تھی...ان کپڑوں کو دیکھ کر لڑکے چڑھاتے تھے۔لیکن یہ اترن بھی ہماری بے بسی کو ڈھک نہیں پاتی تھی۔

خاکی وردی کو میں نے خوب رگڑ رگڑ کر دھویا، مشکل تھی تو پریس کرنے کی۔میری کلاس میں ایک دھوبی کا لڑکا تھا، میں نے اس سے بتایا۔اس نے شام کو گھر آنے کے لئے کہا۔شام کو وردی لے کر میں اس کے گھر گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا باپ چلایا:

''ابے چوہڑے کے کنگھے (کدھر کو) گھسا آرہا ہے؟'' اس کا بیٹا اس کے پاس کھڑا تھا۔

میں نے کہا: ''وردی پر پریس کرانی ہے۔''

''ہم چوہڑے چمار کے کپڑے نہیں دھوتے، نہ ہی پریس کرتے۔جو تیرے

کپڑے پر استری کر دیں گے تو تگا ہم سے کپڑے نہ دھلوائیں گے، مہاری تو روجی۔روٹی چلی جا گی.....''

اس نے صاف صاف جواب دے دیا۔اس کے اس جواب نے مجھے مایوس کر دیا۔ بنا کچھ کہے میں الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ دل بھاری ہوگیا۔جیسے خدا سے یقین ہی اٹھ گیا تھا۔غریبی اور کمی سے گذارا کیا جا سکتا ہے،لیکن ذات سے چھٹکارا پانا بہت مشکل ہے۔

میرے ایک استاد تھے یوگیندر تیا گی۔قطب پور کے رہنے والے بھلے آدمی تھے۔تاریخ اور انگریزی پڑھاتے تھے،بولتے بھی اچھا تھے۔پڑھاتے بھی ٹھیک ٹھاک تھے۔تاریخ پڑھاتے وقت سن جس طرح بتاتے تھے میں حیران رہ جاتا تھا۔لگتا تھا کہ ماسٹر صاحب کو تاریخ کا بہت علم ہے۔تاریخ میں دلچسپی ان کی وجہ سے ہی ہوئی تھی، جو آج بھی برقرار ہے۔

بابا کو وہ پہچانتے تھے۔جب بھی ملتے، کہتے:

''چھوٹن،اپنے لڑکے کو پڑھانے سے مت روکنا۔''

اتنا سب ہونے کے ساتھ ساتھ کلاس میں مجھے عجیب مشکل میں ڈال دیتے تھے۔کوئی غلطی ہو جانے پر پیٹنے کے بجائے میری قمیص پکڑ کر ایسے کھینچتے تھے کہ قمیص اب پھٹی...میرا پورا دھیان اپنی قمیص پر رہتا۔اپنی طرف کھینچتے ہوئے پوچھتے:

''سور کی کتنی سانٹیں (سور کے گوشت کی بوٹی) کھائی ہیں؟ایک پیر تو کھا ہی لیتے ہو گے؟''

جب بھی ماسٹر صاحب ایسی باتیں کہتے، مجھے رونا آجاتا اور آنکھیں چھلک جاتی تھیں۔ماسٹر صاحب کی باتیں سن کر پوری کلاس ہنسنے لگتی۔لڑکے اسی بات کو لے کر تنگ کرتے تھے۔

''ابے چوہڑے کے،سور کھاتا ہے۔''

ایسے لمحوں میں مجھے وہ تمام تیاگی یاد آنے لگتے تھے جو رات کے اندھیرے میں چھپ چھپ کر سور کا گوشت کھانے بھنگی محلّے میں آتے تھے۔میرا دل کرتا ان سب کا نام بتا دوں جو لوگ چھپ چھپ کر گوشت کھانے آتے ہیں اور دن میں سب کے سامنے چھوا چھوت

برتتے ہیں۔

ایسا ہی ایک نام تھا تیج تگا کا، بہت سے لوگ اس سے قرض لیتے تھے۔قرض دینے سے پہلے وہ سور کا گوشت اور شراب مانگتا تھا۔بھنگیوں کے گھر کا پکا تیز مرچ والا کھانا اسے بہت پسند تھا۔ایک بار میرے بابا نے بھی اس سے قرض لیا۔اس روز بابا نے اسے کچی شراب پلائی اور سور کا گوشت بھی کھلایا۔سور کی سانئیں جھنجھوڑتے ہوئے اس کا چہرہ جھبرے کتے جیسا لگتا تھا۔نشے سے اس کی آنکھیں لال ہو جاتیں، جن سے شیطانیت صاف جھلکتی تھی۔

اس کے بیاج کی در اتنی زیادہ تھی کہ بیاج دیتے دیتے زندگی ختم ہو جائے ،اصل جیوں کا تیوں بنا رہے۔بھنگی محلے کے زیادہ تر لوگ قرض میں ڈوبے ہوئے تھے۔اسی وجہ سے وہ کسی بھی زیادتی کی مخالفت نہیں کر پاتے تھے۔تمام لوگ خاموشی سے سب کچھ جھیل جاتے۔عزت کا تو کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔کوئی بھی آتا ڈرا دھمکا کر چلا جاتا۔یہ سب تو روز کا قصہ تھا۔

جسبیر باگ ڈوگرا سے اچانک خالی ہاتھ واپس آ گیا تھا۔روپے پیسے تو دور، جسم پر ڈھنگ کا کپڑا بھی نہیں تھا۔'تیرتھ رام اینڈ کمپنی' میں اتنے سال کام کرنے کے بعد اس کے ہاتھ خالی تھے۔تھک ہار کر وہ گاؤں میں مزدوری کرنے لگا۔گھر کی حالت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی۔اسی درمیان جسبیر کی شادی بھی ہو گئی۔شادی میں تیج تگا سے پھر پیسے قرض لینے پڑے تھے۔

جسبیر کو ماما جی نے دہرادون بلا لیا تھا۔وہ نگر پالیکا دہرادون میں صفائی کے کام پر لگ گیا۔آٹھ دس ٹھکانے بھی تھے، جہاں صفائی کا کام کرتا تھا۔ماما کا ایک ہی بیٹا تھا،سُرجن۔ شروع شروع میں جسبیر ماما کا ہی کام کرتا تھا۔بعد میں سروے آف انڈیا میں اسے پکی نوکری مل گئی تھی۔تنخواہ تو زیادہ نہیں تھی، پھر بھی کچھ پختگی آ گئی تھی۔ایک بندھی بندھائی آمدنی سے انسان کو حوصلہ ملتا ہے...اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

برسات کے دن ہمارے لیے جہنم سے کم نہیں تھے۔گلیوں میں کیچڑ بھر جاتی، جس کی وجہ سے آنا جانا مشکل ہو جاتا۔کیچڑ میں سور کی گندگی بھری رہتی، جس سے بارش ختم ہونے کے بعد اور زیادہ بدبو آنے لگتی۔مکھی مچھر اس میں ایسے پیدا ہوتے جیسے ٹڈّی دل۔گھر سے

باہر نکلنا ناممکن ہو جاتا، ہاتھ پیر گندگی سے بھر جاتے تھے۔ پاؤں میں خاروے (کھروے) اور انگلیوں کے بیچ کی جگہ لال لال داد پڑ جاتے تھے۔ ان خاروں میں ایک بار کھجلی شروع ہوتی تو پھر رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ مہینوں راستوں میں کیچڑ اور پانی بھرا رہتا۔ اس گندے پانی کو ہی پار کر کے اسکول جانا پڑتا۔ ہماری بستی کے اردگرد چوہڑے زیادہ تھے۔ ان کی گلیوں میں پانی بھرا رہتا تھا۔

بستی میں ایک کنواں تھا۔ چندا اکٹھا کر کے کنویں کو پکا بنوایا لیا گیا تھا۔ کنویں کی جگہ اور منڈیر کافی اونچی تھی۔ پھر بھی برسات کے دنوں میں کنویں کے پانی میں لمبے لمبے کیڑے ہو جاتے تھے۔ اس پانی کو پینا ہماری مجبوری تھی کیوں کہ تگاؤں کے کنویں سے پانی لینے کی ہمیں اجازت نہیں تھی۔ سال 1962ء میں خوب بارش ہوئی۔ بستی میں سبھی کے گھر کچی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ کئی دن مسلسل بارش نے مٹی کے گھروں پر قہر برپا کر دیا تھا۔ ہمارا گھر جگہ جگہ سے ٹپکنے لگا تھا۔ جہاں سے ٹپکتا وہیں ایک خالی برتن رکھ دیا جاتا۔ برتن میں ٹن ٹن کی آواز آنے لگتی تھی۔ ایسی راتیں جاگ جاگ کر کاٹنی پڑتی تھیں۔ ہر وقت یہی ڈر لگتا کہ کہیں کوئی دیوار زمین میں نہ دھس جائے۔

کبھی کبھی اچانک ہی چھت میں کوئی سوراخ ہو جاتا، جسے بند کرنا بہت مشکل ہوتا۔ کچی مٹی کے مکانوں کی گیلی چھت اور دیوار پر چڑھنا کسی خطرے سے کم نہیں ہوتا تھا۔ ایسی ہی مسلسل بارش کی ایک رات ہمارے گھر کی چھت میں ایک سوراخ ہو گیا۔ چھت پر چڑھنے کا کام مجھے دیا گیا۔ کیونکہ گھر میں سب سے کم وزن میرا ہی تھا۔ تیز بارش، اندھیری رات میں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا بابا کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر میں چھت پر چڑھ گیا۔ بابا نیچے کھڑے مجھے راستہ بتاتے جا رہے تھے۔

''سنبھل کے منشی جی، پیر جما کے... چھت پر مت جاڑا... دیوال کی طرف ہی رہڑا۔''

میرے ایک ہاتھ میں مٹی کا ڈھیلا تھا، دوسرے ہاتھ سے سوراخ ڈھونڈھ رہا تھا۔ اندھیرے میں بابا لگاتار بول رہے تھے:

''منشی جی.... ملا گڈّا...''

آخر سوراخ ڈھونڈنے میں میں کامیاب ہو گیا اور ڈھیلا رکھ کر اسے بند کر دیا۔ میرے لیے سوراخ بند کر کے واپس آنا مشکل ہو گیا تھا۔ تیز بارش میں آنکھیں کھل ہی نہیں پا رہی تھیں۔ بابا کی آواز کا اندازہ کر کے میں دھیرے دھیرے واپس آ رہا تھا کہ اچانک پیر پھسل گیا۔ لمحہ بھر کو لگا کہ میں ہوا میں ہوں لیکن اس اندھیرے میں بھی بابا کی تجربہ کار آنکھوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور میں ان کی مضبوط پکڑ میں آ کر سنبھل گیا تھا۔ میری چیخ سن کر ماں بھی باہر آ گئی۔ لیکن مجھے صحیح سلامت دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھی۔ میں ٹھنڈ سے کانپ رہا تھا۔ مجھے کپڑے سے پونچھ کر ماں نے چولہے کے پاس بیٹھا دیا۔ اس رات ہماری بیٹھک کا ایک حصہ گر گیا تھا۔ اور اس رات ماں، بابا لمحہ بھر کے لئے بھی نہیں سوئے تھے۔ بستی میں کئی مکان اور گر گئے تھے۔ لوگوں کی چیخنے چلانے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ بابا نے باہر نکل کر اونچی آواز میں پوچھا تھا:

''ماموں..... سب ٹھیک تو ہے۔''

ادھر سے ماموں کی آواز بھی اتنے ہی زور سے آئی تھی:

''ٹھیک ہے... پچھواڑے کی کوٹھری گر گئی ہے۔''

صبح ہوتے ہی بستی میں بھگدڑ مچ گئی۔ ہر کوئی محفوظ جگہ کی تلاش میں نکل پڑا۔ بارش ابھی بھی ہو رہی تھی۔ بچے کچے مکان کسی بھی وقت گر سکتے تھے۔ بابا صبح ہوتے ہی تگاؤں کے طرف چلے گئے، لیکن وہ جلد ہی واپس لوٹ آئے۔ آتے ہی بولے:

''جلدی کرو..... مامراج کی بیٹھک کھلوا دی ہے۔''

ماں نے جلدی جلدی ضروری چیزیں سمیٹ لی اور ہم لوگ گھر کا سامان سر پر رکھے بارش میں بھیگتے ہوئے مامراج کی بیٹھک میں آ گئے۔ مامراج کی بیٹھک برسوں سے بند پڑی ہوئی تھی۔ اس کا کوئی استعمال نہیں ہوتا تھا۔ دیواروں کا پلاسٹر تک اکھڑ گیا تھا۔ پھر بھی وہ جگہ ہمارے لئے محفوظ تھی۔ مامراج تگا کی بیٹھک میں ہم نے ابھی سامان رکھا بھی نہیں تھا کہ ہمارے پیچھے پیچھے تیس چالیس لوگ اور آ گئے۔ باقی لوگ کسی دوسری جگہ چلے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیٹھک بھر گئی۔ چاروں طرف سامان ہی سامان پڑا ہوا تھا۔ کھانے پکانے

کے برتن کے ساتھ ضرورت بھر کی چیزیں تھیں۔ باقی سب وہی چھوڑ چھاڑ کر آ گئے تھے۔

اتنے لوگ ایک ہی بیٹھک میں سما گئے۔ سب سے بڑی پریشانی تھی چولھا جلانے کی۔ ایندھن کسی کے پاس نہیں تھا۔ تھوڑا بہت تھا تو وہ بھی بارش میں بھیگ چکا تھا۔

تگاؤں کے گھروں سے اُپلے (کنڈے) مانگ مانگ کر چولھے جلائے گئے تھے۔ بیٹھک میں ایک ساتھ آٹھ دس چولھے بن گئے۔ بس تین اینٹوں کو جوڑ کر چولھا بنایا گیا تھا۔ کسی کسی کو اینٹ بھی نہیں ملی تھی تو ڈھونڈ ڈھانڈ کر پتھر سے ہی کام چلا لیا گیا۔ چولھوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں نے بیٹھک کا نقشہ ہی بدل دیا۔ اس دھوئیں میں سانس لینا بھی مشکل تھا۔ مردوں کی ٹولی برآمدے میں جم گئی، حقے گڑگڑانے لگے، عورتیں چولھوں سے جوجھ رہی تھیں۔ بچوں کی چیخ پکار ایسی تھی کہ کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

شام ہوتے ہی بیٹھک میں اندھیرا چھا گیا۔ کسی کے پاس نہ چراغ تھا نہ ہی کہیں کوئی ڈھبری یا لالٹین۔ چولھوں میں جلتی اُپلوں کی آگ اندھیرے سے لڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ایسے ماحول میں گاؤں کے لوگ اپسی رنجشیں بھول کر ایک چھت کے نیچے آ گئے تھے۔ جس کے پاس جو بھی تھا اسے مل بانٹ کر کھانا چاہتے تھے۔ اس رات ماں نے نمک ڈال کر چنے ابالے تھے۔ بس یہی تھا ہمارا رات کا کھانا۔ اس رات ان چنوں میں جو ذائقہ اور سکون تھا، وہ مجھے پانچ ستارہ ہوٹل کے کھانے میں بھی نہیں ملا۔ اس رات کسی چولھے پر کوئی سبزی یا دال نہیں پکی تھی۔ روٹی پیاز اور نمک، اس کے علاوہ کسی کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔

اگلے دن صبح سے لے کر دوپہر تک کوئی چولھا نہیں جلا۔ برسات نے فاقوں کی نوبت پیدا کر دی۔ زندگی جیسے اپاہج ہو گئی تھی۔ لوگ گاؤں بھر میں گھوم رہے تھے کہ کہیں سے کچھ چاول گیہوں مل جائے تو چولھا جلے۔ ایسے وقت میں کہیں سے کوئی ادھار بھی نہیں ملتا تھا۔ در در بھٹک کر کئی لوگ خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ میرے بابا بھی خالی ہاتھ ہی آئے تھے، ان کے چہرے پر بے بسی تھی۔ سگوا پردھان نے اناج دینے کے عوض ایک شرط رکھی تھی وہ شرط یہ تھی کہ کسی لڑکے کو سالانہ نوکر رکھ دو بدلے میں جتنا چاہو اناج لے جاؤ۔ بابا چپ چاپ واپس

آ گئے ۔لیکن ماں کو مامراج تگا کے گھر سے کچھ سیر چاول مل گئے ،جن سے تھوڑی بہت راحت ملی تھی ۔ہم سبھی نے کئی روز بعد پیٹ بھر کھانا کھایا تھا۔ ماں نے چاول ابالنے کے لئے چولھے پر ایک بڑا سا برتن چڑھا دیا ۔اس میں چاول تو کم تھے لیکن پانی اوپر تک بھر دیا تھا۔ چاول ابلنے کی مہک پوری بیٹھک میں پھیل گئی ۔ چھوٹے چھوٹے بچے للچائی نظروں سے چولھے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

چاول ابلنے پر پانی الگ کرلیا اوراس پانی کے دو حصے کر دئے گئے ۔ماں نے ایک حصہ چھونک کر دال کی طرح پکا لیا تھا اور دوسرے حصے میں سے سبھی بچوں کو ایک ایک کٹوری چاول کا پانی پینے کے لئے دے دیا۔ اس ابلے چاول کے پانی کو ماڑ کہتے ہیں۔ گرم گرم ماڑ پی کر جسم میں طاقت آ جاتی تھی۔

بستی کے پاس ہی جولاہوں کے بھی گھر تھے۔شادی کے موقع پر جب ان کے گھروں میں چاول پکتے تھے تو ہماری بستی کے بچے برتن لے کر ماڑ لینے دوڑ پڑتے۔ پھینک دیا جانے والا ماڑ ہمارے لئے گائے کے دودھ سے بھی زیادہ قیمتی تھا۔کئی بار جولاہے ڈانٹ پھٹکار کر بھگانے کی کوشش بھی کرتے تھے لیکن بچے بے شرم ہو کر کھڑے رہتے۔ ماڑ پینے کا لالچ انھیں ڈانٹ پھٹکار سے زیادہ عزیز تھا۔ ماڑ میں نمک ملا کر پینا اچھا لگتا تھا۔ اگر کبھی کبھار گڑ مل جاتا تو ماڑ کا ذائقہ اور زیادہ بڑھ جاتا۔ ماڑ پینے کی یہ عادت کسی شوق یا فیشن کی وجہ سے نہیں تھی۔ اناج کی کمی اور فاقوں سے بچنے کی مجبوری تھی کیوں کہ پھینک دینے والی چیز ہماری بھوک مٹا دیتی تھی۔

ایک بار اسکول میں ماسٹر صاحب درونا چاریہ کا سبق پڑھا رہے تھے۔ ماسٹر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔انھوں نے بتایا کہ درونہ چاریہ نے بھوک سے تڑپتے آشوتھاما کو دودھ کی جگہ پانی میں آٹا گھول کر پلایا تھا۔ درونہ چاریہ کی غریبی کا ایسا خوفناک نقشہ بیان کیا کہ پوری کلاس ہائے ہائے کر اٹھی تھی۔ میں نے کھڑے ہو کر ماسٹر صاحب سے سوال پوچھنے کی ہمت جٹائی۔

''آشوتھاما کو دودھ کی جگہ آٹے کا گھول پلایا گیا اور ہمیں چاول کا ماڑ، پھر کسی

بھی مہا کاویہ میں ہمارا ذکر کیوں نہیں آیا؟ کسی مشہور شاعر نے ہماری زندگی پر ایک لفظ بھی کیوں نہیں لکھا؟''

پوری کلاس میرا منھ دیکھنے لگی جیسے میں نے کوئی فضول سوال پوچھ لیا ہو۔

''کل یگ آ گیا ہے جو ایک اچھوت زبان جوری کر رہا ہے۔''

اس ماسٹر نے مجھے مرغا بنا دیا۔ پڑھانا چھوڑ کر بار بار میرے چوہڑے ہونے کی وضاحت کرتا رہا۔ اس نے شیشم کی لمبی سی چھڑی کسی لڑکے کو لانے کا حکم دیا۔

''چوہڑے کے، تو درونا چاریہ سے اپنی برابری کرے ہے... لے تیرے اوپر میں مہا کاویہ لکھوں گا...''

اس نے چھڑی کے سٹ سٹ نشان بنا ڈالے۔ وہ مہا کاویہ آج بھی میری پیٹھ پر نمایاں ہے۔ بھوک اور بے سہارا زندگی، نفرت بھرے لمحوں میں سرداری کے وہ نشانات میری پیٹھ پر ہی نہیں بلکہ میرے دماغ کے کونے کونے پر لکھے ہوئے ہیں۔ آشوتھاما کے بدلے کی آگ میں نے بہت بار اپنے اندر محسوس کی ہے، جو میری بے چینی کو اور بڑھا دیتی ہے۔

برسوں برس چاول کے ماڑ سے ہی بنی سبزی کھا کر اپنی زندگی کے اندھیرے تہہ خانوں سے باہر آنے کی کوشش کی ہے۔ ماڑ پی پی کر ہمارے پیٹ پھول جاتے تھے، بھوک مر جاتی تھی۔ یہی گائے کا دودھ تھا ہمارے لئے یہی تھا ذائقہ دار کھانا بھی۔

ادب میں جہنم کا صرف تصوّر رہے ہمارے لئے برسات کے دن ہماری زندگی میں جہنم سے کم نہیں تھے۔ ہم نے اسے زندگی میں جھیلا ہے۔ دیہاتی زندگی کی یہ تکلیف دہ کہانی ہندی شاعروں کو چھو بھی نہیں سکی۔ کتنی اٹل سچائی ہے یہ۔

اس سال بستی میں زیادہ تر مکان گر گئے تھے جنہیں کھڑا کرنے میں مہینوں لگ گئے۔ کبھی کوئی مدد اس بستی تک نہیں پہنچی۔ سب ہی کو اپنے ہاتھوں پر بھروسہ تھا۔ ٹوٹے پھوٹے مکان پھر سے کھڑے کر لئے گئے۔ ہر سال یہ کہانی دوہرائی جاتی۔ برسات کے تھپیڑے رہے سہے مکانوں کو بھی کمزور کر رہے تھے۔

میرے پر دادا کا نام جاہریا تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام تھا بودھ جسے سب

بدّھو کہتے تھے۔ چھوٹے کا نام تھا کندن۔ بودھ کے بھی دو بیٹے تھے۔ بڑے سوگن چند اور چھوٹے کا نام تھا چھوٹن لال یعنی میرے والد۔ سوگن کی ایک بیٹی تھی جس کی روڑکی کے پاس پنیالے میں شادی ہوئی تھی۔ ان کا شوہر گھر جمائی بن کر رہتا تھا۔ چھوٹن لال کے پانچ بیٹے، دو بیٹیاں تھیں سب سے چھوٹی لڑکی سومتی تھی جس کا انتقال تین سال کی عمر میں ہی ہو گیا تھا۔ سکھبیر سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اسکے بعد جگدیش جس کی موت 18 ر سال کی عمر میں ہی ہو گئی تھی اس سے چھوٹے جسبیر پھر جنیسر اور ان سے چھوٹا اوم پرکاش۔ یعنی میں بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ مجھ سے بھی چھوٹی ایک بہن مایا تھی۔

کندن کے بھی تین بیٹے ہوئے تھے۔ مولہڑ، سولہڑ اور شیام لال۔ دو بیٹیاں بھی تھیں سب سے بڑی کا نام تھا چھوٹی اور سب سے چھوٹی شیاموں۔

میرے بابا اور تاؤ جی الگ رہتے تھے۔ ایک بار بابا نے پرانے بکسے سے کورٹ کے کاغذ نکال کر دکھائے۔ جس میں لکھا تھا کہ نیم کا پیڑ والا مکان سوگن چند ولد بودھ نے چھوٹن لال ولد بودھ کو بیچا۔ نیچے گواہوں کے دستخط تھے اور سرکاری مہر بھی لگی ہوئی تھی۔ یعنی جس مکان مین رہتے تھے، وہ مکان بابا نے سوگن سے خریدا تھا پھر بابا کے حصّے کا مکان کہاں گیا ؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں اتا تھا۔ لیکن بابا سے پوچھنے کی ہمّت کبھی نہیں ہوئی۔ ماں سے سوال کرنے پر پتا چلا کہ تائی جس گھر میں رہتی ہیں وہ میرے بابا کے حصّے میں آیا تھا۔ لیکن اس پر تائی نے قبضہ کر لیا۔ ماں اور تائی میں اسی بات کو لے کر ہمیشہ رنجش رہی۔

بابا اور تاؤ جی کی شکلیں آپس میں ملتی تھیں۔ ایک جیسی قد کاٹھی، رنگ، مونچھیں، یہاں تک کی چلنا بھی ایک جیسا ہی تھا۔ دونوں گھروں کی ان بن کے باوجود بابا اور تاؤ جی کو ہم نے کبھی لڑتے نہیں دیکھا۔ مایا کی شادی میں دونوں گھر ایک بار پھر مل گئے تھے۔ اس ملاپ میں میں نے کافی جدّ وجہد کی تھی۔ دونوں گھرانوں کا ملاپ کتنا مسرت بخش تھا۔

چھوٹی پھوپھی کی چڑیالے گاؤں میں شادی ہوئی تھی۔ جب بھی آتی تھیں گھر بھرا بھرا سا لگتا تھا۔ وہ سب کی چہیتی تھیں۔ بابا اپنی چچیری بہنوں پر جان چھڑکتے تھے۔ پھوپھا اور بابا کے تعلقات اچھے تھے۔ بابا نے اپنے چچیرے بھائی بہنوں کو کبھی اپنے سے الگ نہیں

سمجھا۔چھوٹی پھوپھی کی شادی کا خرچا بھی انھوں نے ہی اٹھایا تھا۔بعد میں شیامو پھوپھو کے گونے کا خرچ بھی انھوں نے ہی کیا تھا۔

بابا کے چچیرے بھائی مولہڑ کا انتقال بھی اچانک ہی ہوا۔اس وقت ان کی عمر 22-20 سال رہی ہوگی،شادی ہو چکی تھی۔پورے خاندان میں وہ ہی تھے جو تھوڑا بہت پڑھنا جانتے تھے۔ان کی کچھ کتابیں کپڑے میں لپٹی بیٹھک کے محراب میں پڑی ہوئی تھیں۔محراب کافی اونچائی پر تھی۔میں نے کسی طرح محراب سے کتابوں کو نکالا۔ان میں اردو اور ہندی کی کتابیں تھیں۔میں نے اردو کی کتابیں تو واپس رکھ دیں لیکن ہندی کی تمام کتابیں پڑھ ڈالیں۔ایک روز ماں کو معلوم ہو گیا،اس نے وہ تمام کتابیں مجھ سے چھین کر کہیں چھپا دیں۔بہت ڈھونڈنے پر بھی کہیں نہیں ملی۔ماں کو اس بات کا ڈر تھا کہ چاچا کا بھوت مجھے ڈرانے نہ لگے۔

جادو ٹونے کے اثرات سے متعلق پورے قبیلے میں ایک عجیب سا ماحول بنا ہوا تھا۔ذرا بھی کسی کی طبیعت خراب ہوتی تو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے بجائے کسی بھگت کو بلایا جاتا۔اس کے جسم میں جب دیوی دیوتا ظاہر ہو جاتے تو مریض کو انھیں دکھایا جاتا۔اکثر و بیشتر کسی بھوت کا اثر بتا کر وہ اس بھوت کو پکڑنے کا کام شروع کرتے۔جس کے بدلے میں دیوتاؤں پر سور،مرغے،بکرے اور شراب کی قربانی دیتے۔ہر ایک گھر میں ان دیوتاؤں کی پوجا ہوا کرتی۔یہ دیوتا ہندو دیوی دیوتاؤں سے بالکل مختلف تھے۔جن کے نام کسی مذہبی کتاب میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیں گے۔لیکن کسی ایسے گھر میں چلے جایئے جن کا تعلق دلت برادری سے ہے وہاں ان دیوی دیوتاؤں کی پوجا دیکھنے کو ملے گی۔پیدائش کا موقع ہو یا کوئی بھی جشن،شادی یا موت دیوی دیوتاؤں کی پوجا کیے بغیر نامکمل ہوتا۔

چاچی جی بہت کم عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔اب تو مجھے چاچی کا چہرہ بھی یاد نہیں رہا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ چاچی بہت خوبصورت تھیں۔سردیوں کے دن تھے۔صبح کے وقت ماں اور چاچی چولھے کے پاس ہی بیٹھی تھیں میں اور مایا بھی ان کے پاس ہی بیٹھے تھے۔چولھا جلانے کے لئے اُپلوں کی ضرورت ہوتی تھی اور سردیوں میں وہ آگ ہماری خاص ضرورت تھی۔بابا اور بڑے بھائی سکھبیر باہر سے آئے۔دونوں میں

کچھ کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ یکا یک بابا غصہ سے ابل پڑے۔ آنگن میں ایک ڈنڈا پڑا تھا۔ اسے اٹھا کر انھوں نے چاچی کی کمر پر دے مارا۔ اچانک پڑنے والی مار سے چاچی بری طرح پھیل گئی۔ اس کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور وہ ماں سے چمٹ گئی۔

''مجھے بچالو...'' چلا رہی تھی۔

بابا کا چہرہ غصہ سے لال ہو رہا تھا۔ بھائی نے ان کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا اور ان کو لے کر گھر سے باہر چلے گئے۔ شور شرابا سن کر محلّے کی عورتیں چھتوں اور دیواروں سے اچک اچک کر جھانکنے لگی تھیں۔ اس وقت میری عمر کچھ سوچنے سمجھنے کے لائق نہیں تھی لیکن ایسا ضرور کچھ ہوا تھا جس نے ہمارے پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اسی دن چاچی کو ان کے گھر بھیج دیا گیا۔ چاچی بسیڑے کی رہنے والی تھی اس لئے اسے سب بسیڑوں کہتے تھے۔ چاچی کو بسیڑے چھوڑنے بابا خود گئے تھے۔ اس کے بعد ہمارے گھر میں چاچی کے ذکر تک پر پابندی لگ گئی تھی۔ بابا تو اپنے چچیرے بھائی بہنوں سے بہت پیار کرتے تھے لیکن اس دن کے بعد سے میرے دل میں ان سے متعلق ایک طرح کا خوف بیٹھ گیا۔

چند روز بعد ہی ماں نے شیام لال چاچا کا رشتہ طے کر دیا۔ کھجوری گاؤں (ضلع سہارنپور) میں میرا ننہال تھا۔ کھجوری کے پاس ایک گاؤں گراہو ہے۔ دونوں گاؤں کے بیچ سے ہنڈن ندی بہتی ہے۔ گراہو میں ماں کے رشتہ کا بھائی رہتا تھا۔ اسی کی لڑکی تھی رام کٹوری، جس سے شادی طے ہوئی تھی۔ ماں نے ایک مہینے کے اندر اندر چاچا کی شادی کر دی تھی۔

سب رام کٹوری کے آنے سے بسیڑوں کا درد بھی بھول گئے اور چاچا بھی اب دن اور رات کام میں لگا رہتا تھا۔ اسی درمیاں ایک اور حادثہ ہوا۔ اچانک شیام لال چاچا معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا بہت ڈھونڈا پر کہیں ملا نہیں۔ ماں نے رام کٹوری سے بہت پوچھا:

''کچھ تو کہہ کے گیا ہوگا۔''

لیکن رام کٹوری کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کئی مہینوں کے بعد اچانک شیام لال چاچا آیا۔ وہ بھی رات کے اندھیرے ہی اندھیرے میں، آتے ہی سولہڑ چاچا پر چاقو سے حملہ

کیا۔سولہڑ تو بچ گئے لیکن بابا نے شیام لال چاچا کو دبوچ لیا اور ان کے ہاتھ پاؤں رسّی سے باندھ دیئے۔رام کٹوری تو ڈر کے مارے ماں کے پاس چھپ کر بیٹھی تھی۔چاچا زمین پر بندھا پڑا تھا۔ماں سے بار بار کہہ رہا تھا:

''بھابی، مجھے چھڑا دے...پھر یہاں کبھی نہیں آنگا۔''

بابا کے منع کرنے کے باوجود ماں نے چاچا کی رسّی کھول دی۔شیام لال چاچا چلا گیا پھر کبھی گھر واپس نہیں آیا۔اس حادثہ سے بابا کو بہت رنج ہوا۔وہ چاچا کو روکنا چاہتے تھے۔ اسے سمجھانے کی بہت کوشش بھی کی تھی۔

''کسی بات سے جی دکھی تھا تو منّے کہا ہوتا...تو یو چھورے با جی پہ کیوں اترا...''

لیکن چاچا بھی ضد کا پکّا نکلا۔گیا تو کبھی لوٹ کر اپنا منھ نہ دکھایا اس واقعہ کے بعد دونوں گھروں میں درار سی پڑ گئی تھی۔جیسے پیار کے دھاگے میں گانٹھ پڑ گئی ہو۔رام کٹوری کے لئے بھی حالات پہلے جیسے نہیں رہ گئے تھے۔بابا جب گھر پر ہوتے تب وہ ہمارے گھر نہیں آتی۔ ہمارا بھی آنا جانا پہلے کے مقابلے کم ہو گیا۔

ہمارا کالج بس اڈّے سے تقریباً ڈیڑھ میل کی دوری پر تھا۔آس پاس کوئی دوسرا انٹر کالج نہیں تھا۔برلا کے علاوہ فلودا، مانڈلا، بھیسانی، کھائی کھیڑا، بسیڑا، تاج پور، چھپار، نگلا، قطب پور، وغیرہ گاؤں کے لڑکے اسی کالج میں پڑھنے آتے تھے۔لڑکیوں کی تعداد پانچ چھ سے زیادہ نہیں تھی۔وہ بھی صرف امیروں کی ہی لڑکیاں تھیں۔ان میں سے ایک یا دو لڑکی اساتذہ کی تھی۔لڑکوں میں بھی زیادہ تر تیاگیوں کے ہی لڑکے تھے۔دلتوں میں سے تو اکا دوکا ہی اسکول میں پڑھنے آتے تھے۔

بابو رام تیاگی ایک اچھے استاد تھے۔انھوں نے میری کافی حد تک رہنمائی کی۔اکثر مقابلہ میں حصّہ لینے کے لئے اکسایا کرتے۔وہ ہمیں ہندی پڑھاتے تھے۔میری زبان کی اصلاح بھی انھوں نے ہی کی تھی۔ان دنوں زبان میں میری دلچسپی بڑھ گئی تھی۔

سن 1962ء کے جولائی۔اگست کی بات ہے، میں آٹھویں کلاس میں تھا۔ساتویں کلاس اچھے نمبروں سے پاس کی تھی۔پورے کلاس کے چار بہترین طالب علموں میں میرا

بھی نام تھا۔

ایک دن میں اسکول جا رہا تھا۔اس دن میں ذرا جلدی نکل گیا۔گھر میں گھڑی تو تھی نہیں۔اندازے سے اسکول کے لئے نکل جاتا تھا۔صبح سویرے پکی سڑک پر اسکول جانے والا صرف ایک میں ہی تھا۔میرے پیچھے پیچھے سُرجن تگا کا بیٹا برجیش آرہا تھا۔عمر میں تو وہ مجھ سے کافی بڑا تھا۔ایک لمبی لاٹھی اس کے کندھے پر رکھی تھی۔شاید وہ کھیت پر جارہا تھا، مجھے دیکھتے ہی اس کا بڑبڑانا شروع ہوگیا۔میں بے توجہی کے ساتھ چلتا رہا جیسے کہ میں اس کی کوئی بات سن ہی نہیں رہا ہوں۔کوٹھی کے پاس پہنچتے ہی اسکول بس تھوڑی سی دوری پر ہی تھا کہ اس نے مجھے آواز دی:

''ابے چوہڑے کے...رک جا۔''

میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔اس کے چہرے سے شیطانیت ٹپک رہی تھی۔وہ میرے قریب آیا اور بولا:

''چوہڑے کے تیرے تو سچ مچ سینگھ نکل آئے ہیں۔تو تو بڑی شیخی میں رہتا ہے۔تیری تو چال ہی بدل گئی ہے۔''

میں بنا جواب دئے ہی چلتا رہا۔تو اس نے آگے بڑھ کر میرا راستہ روک لیا اور ڈانٹتے ہوئے بولا:

''سڑا ہے تو پڑھنے میں ہوشیار ہے۔'' لاٹھی کا ایک سرا میرے پیٹھ میں گاڑ دیا۔

''کر کے ہمیں بھی تو دکھا تو کتنا ہوشیار ہے۔''

میں جھگڑے سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ سرے سے جھگڑے پر اتارو تھا۔مجھے خاموش دیکھ کر اور تیز چلایا:

''کتنا بھی پڑھ لیو، رہے گا تو چوہڑا ہی...''

مجھے اپنی لاٹھی سے تیز دھکا دیا۔میں گرتے گرتے بچا۔لیکن میرا جھولا زمین پر گر گیا۔اس نے جھولے کو لاٹھی میں پھنسایا اور اوپر گول گول گھمانے لگا۔تب میں اس کے سامنے گڑگڑایا:

''میری کتابیں بکھر جائیں گی... میرا جھولا دے دو... کاپیاں پھٹ جائیں گی۔''

لیکن وہ نہیں مانا اور تیزی سے گھما کر جھولے کو دور پھینک دیا۔ جیسے ہی میں اٹھانے کے لئے دوڑا، اس نے مجھ پر قہقہہ لگایا۔ سڑک کے کنارے کھائی میں میرا جھولا گر گیا تھا، جہاں پانی اور کیچڑ تھی۔ میں نے جھولا نکالا تو میرے کپڑے بھی بھیگ گئے اور دونوں پیر کیچڑ سے لت پت ہو گئے۔ جھولے میں بھی اندر تک کتابیں اور کاپیاں بھیگ گئیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے بہت رونا آیا تھا۔ اسکول کے نل پر ہاتھ پاؤں دھوئے اور کتابوں کاپیوں کو دھوپ میں سکھایا۔ اس دن میرا دل بہت اداس تھا لیکن بابا کا چہرا میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ ان کی تمام باتیں یاد آنے لگیں:

''پڑھ لکھ کر جاتی سدھارنی ہے۔''

اس دن کسی بھی کلاس میں میرا دل نہیں لگا۔ صبح ہوئے حادثہ کو میں نے گھر آنے پر ماں کو بتایا۔ تو وہ بھی سن کر رو پڑی۔ بابا نے سنا تو مرنے مارنے پر اتر آئے اور شیام لال چاچا ان دونوں لڑکوں کو مارنے کے لئے ڈنڈا اٹھا لائے۔ بگڑ کے بزرگوں نے انھیں بڑی مشکل سے روکا تھا۔ لیکن بابا کی اس بے بسی کو میں آج تک نہیں بھول پایا ہوں۔

''اے سوہروں، مہارے جا تک دو اچھر سیکھ لیں گے تو تھارا کیا بگڑ جا گا۔''

بڑی مشکل سے بات کو رفع دفع کیا گیا۔ ہمارے بگڑ میں تگاؤں کی مخالفت کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ لوگ بیگار پر جانے سے منع کرنے لگے تھے۔ میرے بابا تو بہت جلدی جوش میں آجاتے تھے اس لئے ماں ہمیشہ ڈری رہتی تھیں کہ کہیں کوئی مصیبت کھڑی نہ ہو جائے۔

بستی سے ہرم سنگھ، ست پال سنگھ، بگھو رام، اومی اسکول جاتے تھے۔ ست پال میری عمر کا تھا، ہم دونوں کا ایک ساتھ اسکول میں داخلہ ہوا۔ ہرم سنگھ ہم سے ایک سال پیچھے تھا۔ اومی نے تو بیچ میں ہی اسکول چھوڑ دیا تھا اور ست پال بھی ایک سال پیچھے ہو گیا تھا۔ ست پال پڑھنے میں تھوڑا کمزور تھا۔ ہم لوگوں کے گھر ایک دوسرے سے قریب تھے۔ اس لئے ہمارا بچپن بھی ایک ساتھ ہی گزرا۔ ست پال کے بابا گھستا سکھوں کی طرح پگڑی باندھتے

تھے، داڑھی بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے سارے بچوں کے نام بھی سکھوں کے نام پر رکھے۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام ہرنام سنگھ۔ دوسرے کا نام گرنام سنگھ اور بیٹی راجیندر اور سب سے چھوٹے کا نام ست نام سنگھ جو آگے چل کر ست پال ہو گیا۔ بستی کے تمام لوگ اسے بندر کہا کرتے تھے۔ اسی طرح ہرم سنگھ کو سُنڈل اور مجھے پالا۔ بستی میں مجھے میرے نام سے صرف میری ماں ہی بلاتی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے کسی نے اوم پرکاش کے نام سے نہیں بلایا۔ ہاں کچھ لوگ بابا کی طرح منشی جی کہنے لگے تھے۔

آٹھویں کلاس کے امتحان چل رہے تھے۔ ان دنوں ہرم سنگھ کی شادی تھی۔ میں اس وقت نویں کے امتحان دے رہا تھا۔ اس کی بارات مورنا گئی تھی۔ میں اور میرے بابا اس کی بارات میں گئے۔ نئے کپڑے پہن کر شادی میں جانے کی خوشی کچھ الگ ہی تھی۔ شادی کی تمام رسموں میں دولھے کے ساتھ مجھے ہی بھیجا گیا تھا۔

شادی کے دوسرے دن وداعی سے پہلے ہرم سنگھ کو دلہن کے گھر بلانے ایک آدمی ہمارے ٹھہرنے کی جگہ آیا۔ ہرم سنگھ کے ساتھ مجھے بھی دوبارہ سے جانا پڑا۔ دلہن کے گھر کے آنگن میں ایک چارپائی پڑی تھی۔ ہم دونوں اس پر جا کر بیٹھ گئے اور ہمارے اردگرد لڑکیاں تھیں جو ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ اس وقت میں کافی چوکنا تھا۔ ہمارے بزرگوں نے خوب اچھی طرح پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ ایسے موقعوں پر لڑکیوں کے جال سے کیسے بچا جائے۔ سارے طریقے پہلے سے ہی سکھا دیے تھے۔ لڑکیاں بات بات پر چھیڑ خانی کر رہی تھیں۔ رات کے بچے ہوئے دال چاول ہم دونوں کو کھانے کے لئے دیے۔ وہیں پر ایک آدمی بڑا سا ڈھول اپنے گلے میں لٹکائے کھڑا تھا۔ ہرم سنگھ کی ساس اور دو تین عورتیں ڈھول والے کو چلنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ہرم سنگھ کو 'سلام' کے لئے ان گھروں میں جانا تھا جہاں اس کی ساس کام کرتی تھی۔ میں نے ہرم سنگھ کو سلام سے بہت روکنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے کوئی مخالفت نہیں کی اور چپ چاپ ان عورتوں کو ساتھ جانے کو کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا:

''ٹھیک ہے، تم جاؤ، میں نہیں آؤں گا۔''

ہرم سنگھ نے آ کر میرا ہاتھ تھام لیا اور بولا: ''مجھے اکیلا چھوڑ دو گے؟ چلو، ساتھ چلو...''
اس بات کو لے کر ہم دونوں کے بیچ کافی ان بن ہوئی۔ آخر کار ہار کر مجھے ہی جانا پڑا۔
''یار! ایک دو گھر جا کے جلدی ہی لوٹ آئیں گے۔''
نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کے ساتھ چل دیا۔ گرمی کے دن تھے، گلیوں میں بھٹکتے بھٹکتے دوپہر ہوگئی۔ ایک طرح سے یہ جلوس ہی تھا۔ سب سے آگے دلہن کی ماں اور دو عورتیں۔ ان کے پیچھے ڈھول بجانے والا، پھر ہم دونوں، اس کے بعد بچّوں کا ہجوم۔ ڈھول کی آواز سے زیادہ بچوں کی آواز گونج رہی تھی ہر ایک گھر کے سامنے کھڑے ہو کر ڈھول بجانے والا زور سے ڈھول بجاتا۔ ڈھول کی آواز سن کر عورتیں، لڑکیاں باہر آ جاتیں۔ ہرم سنگھ انھیں سلام کرتا۔ گھونگھٹ کے کونوں سے ہرم سنگھ کو ایسے نہارتی تھی جیسے ہرم سنگھ چڑیا گھر سے لایا گیا ہو۔ کسی کسی کا برتاؤ تو بے عزت کرنے والا ہوتا تھا۔ دلہن کی ماں نیک لینے کے لیے ان سے بہت کچھ کہتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا:

''چودھرائن، میری کوئی دو چار لونڈی تو ہے نی جو میرے اور جمائی تھارے دروجّے پے آویں گے۔ اِجّت سے لڑکی کو بھیج سکوں، ایسا تو کچھ دو...''

لیکن اس گڑگڑانے کا کوئی اثر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آسانی سے کسی کے ہاتھ سے کوئی کپڑا یا کوئی برتن نہیں نکل رہا تھا۔ کوئی کوئی تو عجیب سی شکلیں بنا کر کہتے:
''ان چوہڑوں کا تو کبھی پیٹ ہی نہ بھرتا۔''
ایک عورت نے ہرم سنگھ کے ہاتھ پر ایک روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے کہا:
''اری تیرا جمائی ہے تو سوہڑا (خوبصورت)، کام کیا کرے ہے۔''
ہرم سنگھ کی ماں نے خوشی سے کہا:
''پڑھے ہے... آٹھویں کا امتحان دیا ہے۔''
سوال کرنے والی عورت نے حیرت سے ہرم کو دیکھا۔ میں اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا، ایک سانس میں بولی:
''تو بھی پڑھے ہے؟''

میں نے ''ہاں'' میں گردن ہلائی۔

''تو کوڑسی کلاس میں ہے؟''

''نویں کا امتحان دیا ہے''

اس کی آنکھیں حیرت زدہ تھیں۔

''تو دکھے تو اس سے چھوٹا؟''

''جی میں ان سے چھوٹا ہوں۔''

وہ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد بولی: ''برلا تو تگاؤں کا ہے؟''

میں نے کہا: ''جی ہاں۔''

''چوہڑوں کے جا تک بھی پڑھنے جاوے ہیں مدرسے میں۔'' اسے تعجب ہو رہا تھا۔

''کتنا بھی پڑھ لو... رہو گے تو چوہڑے ہی۔''

یہ باتیں کہہ کر اس نے اپنے اندر کی بھڑاس نکال لی اور اندر چلی گئی۔ جلوس دوسرے دروازے کی طرف بڑھا۔ میرا تو پیاس کے مارے گلا سوکھ رہا تھا کھڑے کھڑے تھک گئے تھے۔ میں نے ڈھول بجانے والے سے کہا:

''بھیّا کہیں سے پانی پلوا دو۔''

اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا: ''پاڑی تو گھر جا کے ہی ملے گا۔''

بارات کا سارا مزہ ہی کرکرا ہو گیا تھا۔ پسینے سے شرابور ہم گھر واپس لوٹے۔ تب میں نے دل بھر کر پانی پیا۔ پانی پلانے والا مجھے دیکھ کر بولا:

''برلے میں سوکھا پڑ گیا ہے کیا؟''

''نہیں! سلام نے میرا پانی سوکھ لیا ہے۔''

میری بات کے مقصد کو وہ بے چارہ بغیر پڑھا لکھا سمجھ پایا یا نہیں، میں نہیں جانتا۔ میں خاموشی سے ایک کنارے تھکان مٹانے کی غرض سے بیٹھ گیا۔ سلام کے لئے در در بھٹکنے سے ہونے والے درد نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ مجھے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔

دوپہر کے کھانے میں سور کا گوشت اور روٹی پکی تھی۔ چند لوگ شراب پی کر شور مچا

رہے تھے۔نیم کے پیڑ کے نیچے چارپائیوں پر لوگ آرام کر رہے تھے۔کھانا کھلانے اور بارات کی وداعی کی گہما گہمی میں مَیں خاموش ایک کنارے بیٹھا تھا۔ مجھے اس طرح خاموش بیٹھا دیکھ کر میرے بابا نے مجھ سے سوال کیا:

''ایسے کیوں بیٹھے ہو منشی جی؟''

میں نے ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ،انھیں سے سوال کر ڈالا:

''یہ سلام کے لئے جانا کیا ٹھیک ہے؟''

انھوں نے مجھے اس طرح گھورا جیسے کہ وہ پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔انھیں خاموش دیکھ کر میرے ذہن میں ہل چل مچ رہی تھی۔

''اپنی ہی شادی میں دولھا گھر گھر گھومے...بری بات ہے...بڑی جات والے دولھے تو ایسے کہیں نہیں جاتے...یہ دلہن بر لا جا کر ایسے ہی گھر گھر جائے گی سلام کرنے...''

وہ میری بات کو خاموشی سے سن رہے تھے۔

''منشی جی تجھے اسکول بھیجنا سپھل ہو گیا ہے...مہاری سمجھ میں بی آگیا ہے...اب اِس ریت کو توڑے گا۔''

میرے بابا نے بھی تو اس رسم کو اپنے ہی گھر میں توڑا تھا۔میرے بھائی جنیسر کی بارات گاؤں لکسر کے پاس رجو پور گئی تھی۔انھوں نے صاف منع کر دیا تھا:

''میرا بیٹا سلام کرنے نہیں جائے گا۔''

بہن کی شادی میں بھی ہم نے اپنے بہنوئی کو سلام پر جانے نہیں دیا تھا۔صاف کہہ دیا تھا جس کسی کو بھی نیک دینا ہے وہ گھر آ کر دے۔دیکھنے اور سننے میں یہ بات بہت عام لگتی ہے،یا لگتی ہوگی۔لیکن دولھا یا دولہن کو شادی کے پہلے ہی دن ان میں نفرت بھر دی جاتی ہے۔''سلام پر''اسی عنوان سے میری کہانی رسالہ ہنس (اگست 1993ء) میں شائع ہوئی تھی۔راجیند ریادو نے اس کہانی کو برہمنوں کے خلاف ایک مضبوط کہانی کہا تھا۔

صدیوں سے چلی آرہی یہ رسم ذات کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔سماج میں جو گہری

کھائی ہے اسے یہ رسمیں اور زیادہ گہری بناتی ہیں۔ یہ ایک طرح کی سازش ہے جو نفرت کے بھنور میں ملوث کر دیتی ہے۔ کتنی ہی بار ایسا ہوتا ہے کہ صرف دولہے کو ہی نہیں بلکہ دلہن کو بھی بے عزتی جھیلنی پڑتی ہے۔ غریب گھر کی بنا پڑھی لکھی لڑکی اجنبیوں کے درمیان آکر ایک تو ویسے ہی گونگی بنی رہتی ہے۔ اوپر سے اس کو در در لے کر گھومنا۔ رہی سہی کسر پوری ہو جاتی ہے۔

بچپن کے بہت سے ایسے واقعات ذہن کی چار دیواری میں قید ہیں۔ جو گذرے ہوئے تاریک دنوں کے گواہ ہیں۔ جس وقت میں نویں کلاس میں تھا، گھر کے حالات دن بدن کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ ایک ایک روپے کے لئے گھر کے ہر فرد کو پسنا پڑ رہا تھا۔ میرے پاس کورس کی کتابیں ایسے ہی بہت کم ہوا کرتی تھیں۔ دوستوں سے مانگ کر کام چلاتا تھا۔ کپڑوں کی بھی وہی حالت جو بھی مل گیا پہن لیا۔ جو وقت پر ملا کھالیا۔

جب گاؤں میں کوئی جانور مرتا تو اس کو اٹھانے کا کام بھی چوہڑوں کو ہی کرنا پڑتا تھا۔ جس کے گھر میں جو چوہڑا کام کرتا، اس گھر کے جانور کو بھی وہی اٹھاتا تھا۔ لیکن اس کے بدلے میں کوئی اجرت نہیں ملتی۔ کسی بھی جانور گائے، بیل، بھینس کو اٹھانے کے لئے کم سے کم چار چھ لوگوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ جس کا جانور مرتا اسے تو اس قدر جلدی لگی رہتی کہ بار بار بستی میں آکر چلّاتا تھا اور اگر ذرا سی دیر ہو جائے تو گالیاں بکتا۔ چار چھ لوگوں کو بلانے میں اکثر دیر ہو ہی جایا کرتی ہے۔ مرے ہوئے جانور کو اٹھانا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ جانور کے اگلے پچھلے پیروں کو رسّی سے باندھ کر بانس کے موٹے موٹے لٹھوں سے اٹھانا پڑتا ہے۔ اتنی محنت بھرے کام کے بدلے ملتی تھیں صرف گالیاں۔ کتنے ظالم اور بے رحم سماج میں رہ رہے تھے ہم۔ جہاں محنت کی کوئی قیمت نہیں بلکہ یہ سب غریبی کو برقرار رکھنے کی خفیہ سازش ہی تو ہے؟

مرے ہوئے جانور کی کھال کو مظفر نگر کے چمڑا بازار میں بیچ دیا جاتا۔ اس وقت ایک جانور کی کھال 25-20 روپے میں فروخت ہوتی تھی۔ آنے جانے کا کرایہ اور جانور کو اٹھانے والوں کی مزدوری دینے کے بعد بہ مشکل اس کھال کے بدلے 15/روپے ہاتھ

ہو رہا تھا۔ چاچا کی ہدایت پر میں نے کھال اتارنی شروع کی۔ میں جیسے خود ہی گہرے دل دل میں جکڑ رہا تھا۔ اس جگہ سے میں نکلنا چاہتا تھا۔ لیکن حالات مجھے اسی دَل دَل میں گھسیٹ رہے تھے۔ چاچا کے ساتھ تیز تپتی دوپہری میں جس تکلیف کو میں نے جھیلا تھا آج بھی وہ زخم میرے جسم میں تازہ ہے۔

جیسے جیسے کھال اتر رہی تھی میرے جسم کا خون بھی جم رہا تھا۔ کھال کے اترنے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ چاچا نے کھال کو زمین پر پھیلا دیا اور اس پر لگے خون کو زمین نے سوکھ لیا تھا۔ چاچا نے کھال کو چادر میں باندھا، گٹھری سر پر رکھی۔ بوجھ کی وجہ سے چاچا تیز تیز چل رہا تھا۔ اس جگہ سے ہمارا گھر دو میل کی دوری پر تھا میں ان کے پیچھے پیچھے چھری پکڑے دوڑ رہا تھا۔ بسیڑا جانے والی پکّی سڑک سے ہم لوگ بس اڈے کے پاس پہنچ گئے۔ چاچا نے گٹھری کو زمین پر رکھا اور مجھ سے کہا:

''یہاں سے آگے تم لے جاؤ، میں تھک گیا ہوں۔''

میں نے چاچا سے بہت منع کیا۔

''چاچا بس اڈّے کی بھیڑ پار کرادو۔ میرے اسکول کی چھٹّی کا وقت ہے میرے اسکول کے ساتھی یہ لے جاتے ہوئے دیکھیں گے تو وہ مجھے اسکول میں تنگ کریں گے۔''

میں ان کے سامنے بہت گڑگڑایا۔ لیکن میری کسی بھی بات کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور گٹھری میرے سر پر رکھ دی۔ اس کا وزن میرے وجود کے کئی گنا زیادہ تھا۔ مجبوراً مجھے بھی اٹھانا پڑا۔ بس اڈے پر اس روز جانے پہچانے لوگوں کے درمیان سے جس طرح نکلا تھا صرف میرا ہی دل جانتا ہے۔ ایک خوف تھا جو مجھے جکڑے ہوئے تھا کہ کہیں کوئی کلاس والا دوست نہ دیکھ لے۔ اگر سوال کر لیا تو کیا جواب دوں گا میں۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے میری ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اب گرا... گھر تک پہنچنے کے لئے پورے گاؤں کا چکر کاٹا تھا۔ اس حال میں دیکھ کر ماں رو پڑی تھی۔ سر سے لے کر پیر تک گندگی سے لت پت، کپڑوں پر خون کے دھبّے لگے تھے۔ بڑی بھابھی نے مجھے دیکھ کر

ماں سے کہا تھا:

''ان سے یہ نہ کراؤ... بھوکے رہ لیں گے... انھیں اس گندگی میں نہ گھسیٹو...''

بھابھی کے یہ الفاظ آج بھی میرے لیے ایک روشنی کی طرح ہیں۔ میں تو اس گندگی سے نکل آیا ہوں۔ لیکن لاکھوں لوگ آج بھی ویسی ہی گھناؤنی زندگی گذار رہے ہیں۔

دوسرے دن ہرم سنگھ کے ساتھ کھال کو لے کر شہر گیا۔ کیونکہ اس دن بھی گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ہرم سنگھ کا خاندان جانوروں کی ہڈیاں اور کھال کو شہر میں بیچنے کے لیے لے جاتا تھا۔ تانگے کی سیٹ کے نیچے کھال کو چھپا کر رکھا تا کہ سواریوں کی توجہ اس طرف نہ جائے۔ بس میں کنڈکٹر نے چڑھنے نہیں دیا تو ہرم سنگھ نے ایک مسلمان تانگے والے سے بات کر لی۔ تانگے والے نے ساری سواریاں ضلع اسپتال کے سامنے ہی اتار دیں اور اس نے ہمیں چمڑا بازار چھوڑ دیا۔ اس بازار میں ہر طرف چمڑے کے ہی ڈھیر لگے تھے۔ سوکھی ہڈی کے گوداموں سے بہت بدبو آ رہی تھی، سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

کھال 25/روپے میں فروخت ہوئی۔ دو روپے کرایہ تانگے والے کو دیا۔ شام ہونے سے پہلے ہی ہم گھر لوٹ آئے۔ جو پیسے میرے پاس بچے تھے وہ میں نے ماں کو تھما دیے۔ تو ماں نے مجھے ہی واپس کر دیے۔

''تیرے پاس اسکول کی کتابیں نہیں ہیں۔ ان سے جو بھی آئے خرید لے۔ گھر کا خرچہ تو جیسے تیسے چل ہی جائے گا۔''

میں نے ماں سے کہا: ''اس میں سے کچھ چاچا کو بھی دے دو۔''

ماں نے مجھے ڈانٹا:

''اس کا نام مت لینا، تیرے باپ کو آڑے دے اس کے ہاڑ تڑواؤں گی۔''

ماں چاچا پر بہت غصہ تھی۔ اس دن سے وہ بھی ماں کے سامنے آنے سے جھجھک رہے تھے۔ کیونکہ چاچا ماں کی بہت عزت کرتے تھے۔ ماں بھی چاہے جتنا کڑوا بولتی لیکن دونوں چاچا سولہڑ اور شیام لال کو بہت مانتی تھی۔ لیکن ان کے نکمے پن کا اسے بہت غم تھا۔ اس کے باوجود ان کی چھوٹی چھوٹی تکلیف میں ان کے ساتھ کھڑی رہتی۔ تھے تو وہ چچازاد مگر ماں کا

سلوک ان کے ساتھ سگوں کا سا تھا۔گھریلو میل جول مجھے اپنے بابا سے وراثت میں ملا ہے۔ایک دن میرے ماما سرجن کو لے کر برلا آ گئے۔انھوں نے ماں سے کہا تھا:

''یہ اب یہیں پڑھے گا، دہرادون میں اس کا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔اس کی صحبت خراب ہوگئی ہے۔یہیں کے اسکول میں اس کا داخلہ کرادو...''

سُرجن کا داخلہ نویں کلاس میں ہوا۔ہم دونوں ایک ہی کلاس میں تھے یہاں تک کہ سیکشن بھی ایک ہی تھا۔انھیں دنوں جنیسر کی آنکھ میں موتیا بند ہوگیا تھا۔اس کی تکلیف لگاتار بڑھ رہی تھی ۔گاؤں میں آنکھوں کے علاج کے لئے مفت کیمپ لگا ہوا تھا۔جنیسر کو بھی اسی کیمپ میں علاج کے لئے داخل کیا گیا۔اسی میں اس کی آنکھوں کا آپریشن ہوا۔جنیسر کئی مہینوں تک بستر پر پڑا رہا۔آپریشن کے بعد بھی اس کی آنکھیں پورے طور پر ٹھیک نہیں ہوئیں۔ان دنوں سُرجن ہی اس کی دیکھ بھال کرتا۔اسی دوران ایک واقعہ پیش آیا۔جس میں سُرجن اور جنیسر پھنستے پھنستے رہ گئے۔ہوا یہ تھا کہ بستی کے جوان لڑکوں نے بیگار کرنے سے انکار کردیا تھا۔شروع شروع میں انکار کی جگہ ٹال مٹول سے کام چلایا۔کیونکہ بوڑھے بزرگ آسانی سے انکار نہیں کرپاتے تھے۔تگاؤں کو بھی یہ بات بخوبی سمجھ آگئی تھی کہ اب لوگ ہاتھ سے نکلتے جارہے ہیں۔اس لئے کام کے بدلے مزدوری مانگی جاتی تو ان کے پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے۔وہ کوئی ایسا راستہ ڈھونڈھ رہے تھے کہ ان کا دباؤ بھی برقرار رہے اور کچھ کرنا بھی نہ پڑے۔یعنی سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔اس کے لیے انھوں نے پُرکاجی تھانے کے داروغہ کی مدد حاصل کی جو کہ ان ہی کی برادری کا تھا۔داروغہ بھی کسی خاص موقع کی ٹوہ میں تھا،اور یہ موقع اچانک ہی اسکے ہاتھ لگ گیا۔برلا ہی میں محکمۂ نہر کا ایک مہمان خانہ تھا۔یہ مہمان خانہ مظفرنگر جانے والی سڑک پر کالج سے پہلے پڑتا ہے۔ایک پیلی سی اور لال مٹ میلے رنگ کی پرانی عمارت جس کے آس پاس پیڑ ہی پیڑ تھے۔یہ عمارت کئی حصّوں میں بٹی ہوئی تھی۔کسی زمانے میں انگریز افسر دورے پر آتے تو آ کر اسی کوٹھی میں ٹھہرتے تھے۔اس کو کوٹھی کے ہی نام سے جانا جاتا تھا۔اسی کے سامنے پکّی سڑک اور آس پاس لہلہاتے کھیت تھے۔

گاؤں میں چک بندی چل رہی تھی، کوئی بڑا افسر آنے والا تھا۔ ہمیشہ کی طرح بھنگیوں کی بستی میں ایک سرکاری ملازم آیا۔ صاف صفائی کے لئے چند لوگوں کی ضرورت تھی۔ جس کے بدلے میں پیسہ یا اجرت ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ہمیشہ کی طرح یہ بھی بیگاری ہی تھی۔ کئی دن تک بھوکے پیاسے لوگ کوٹھی کی صفائی میں لگے رہے۔ بدلے میں گالیاں الگ۔ پولیس کے سپاہی بستی سے مرغے مرغیاں اٹھا کر لے جاتے۔ وہ بھی زور زبردستی سے۔ لیکن اس کے خلاف کہیں سے کوئی سنوائی نہیں ہوتی۔ بلکہ بہت سے تگا ایسا کرنے میں ان کا ساتھ دیتے تھے۔ پولس والوں کو دیکھتے ہی گاؤں کی عورتیں گھروں میں چھپ جاتی تھیں۔

لیکن اس بار بستی کے لوگوں نے بیگار کرنے سے انکار کر دیا۔ اس بات پر ہاتھا پائی بھی ہوئی کہ اگر مزدوری دوگے تو جائیں گے ورنہ نہیں۔ جو آدمی بلانے آیا تھا وہ تحصیل کا کوئی چوتھے درجے کا مازم تھا۔ لیکن اس کا رعب کسی افسر سے کم نہیں تھا۔ بات بات پر "ابے تبے" کر رہا تھا۔ جب ایک ساتھ سب نے منع کیا تو وہ زور زبردستی پر اتر آیا۔ لیکن سب ایک ایک کر کے اس کے پاس سے کھسکنے لگے۔ اسے خالی ہاتھ واپس جانا پڑا۔ جاتے جاتے دھمکی بھی دے کر گیا۔

اس واقعہ کے پندرہ دنوں کے بعد پولس کے دو سپاہی بستی میں آئے اور دس لوگوں کو اٹھا کر لے گئے۔ جو بھی انھیں دکھائی دیا پکڑ لیا۔ جنیسر کی آنکھوں میں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ سُرجن اسی وقت آنگن والے گھر میں چلا گیا تھا۔ ورنہ وہ بھی اس میں پھنس جاتا اور میں اس وقت بستی میں تھا ہی نہیں۔ جب میں تھوڑی دیر بعد لوٹا تو پتا چلا بارو، دھنو، مام چند وغیرہ کو پولس لے گئی ہے۔

الیاس کے گھر کے سامنے ایک باغیچہ تھا، سڑک کے کنارے۔ سڑک کے دوسرے طرف پنچایت گھر تھا۔ اسی کے باغیچہ میں چارپائی پر بیٹھا الیاس حقہ گڑ گڑا رہا تھا۔ ایک مونڈے پر ایک داروغہ بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک رول تھا۔ جس کو وہ بار بار ہوا میں لہرا رہے تھے۔ آٹھ دس سپاہیوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور کندھوں پر بندوقیں لٹکی ہوئیں تھیں۔ بستی سے پکڑ کر لائے ہوئے لوگوں کو مرغا بنا کر لاٹھیوں سے مارا جا رہا تھا۔ ہر

ایک ڈنڈے پر پٹنے والا بری طرح چیخ اٹھتا۔ مارتے مارتے سپاہی بھی تھک گئے۔ کھلے عام یہ دلیری کا تیوہار منایا جارہا تھا۔ جس میں لوگ خاموشی سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کہیں بھی کسی طرح کی مخالفت نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ بستی کی عورتیں، بچّے گلیوں میں کھڑے دہاڑے مار رہے تھے۔ بنا کسی جرم کے پولس انھیں پکڑ کر لے گئی تھی۔ عورتوں اور بچوں کو رونے کے علاوہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بستی کے مکھیا کرپا اور گھستا گاؤں کے پردھان کے پاس گئے ہوئے تھے، جو ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ پردھان ضروری کام سے شہر گئے ہوئے ہیں۔ بستی کے کسی آدمی میں اتنی ہمّت نہیں تھی کہ وہ داروغہ سے سوال کر سکے کہ انھیں مارا کیوں؟ آخر ان کی خطا کیا تھی؟ گھنٹوں بھر یہ تماشا چلتا رہا۔ دس کے دس لوگ درد سے تڑپ رہے تھے۔ ان کی چیخوں کی آواز سن کر پیڑوں پر بیٹھے ہوئے پرندے بھی اڑ گئے تھے۔ لیکن گاؤں کے لوگوں کو لقوا مار گیا تھا۔

میرے ذہن میں گہری لاپروائی سی بیٹھ گئی تھی۔ سن بلوغت کے وقت میں، میرے ذہن میں کھروچ سی پڑ گئی تھی۔ جو کانچ پر کھنچی ہوئی لکیر کی طرح آج بھی موجود ہے۔ اسکول میں پڑھائی گئی سمترانند پنت کی نظم 'آہ! دیہاتی زندگی بھی کیا...' کے ایک ایک لفظ بناوٹی اور جھوٹے لگ رہے تھے۔ اُس دن جو حادثہ ہوا اُس نے میرے دماغ میں بے چینی سی پیدا کر دی۔ شاید کہیں دلت شاعری کی تہذیب بھی جاگنے لگی تھی، جو ایک لمبے عرصہ کے بعد ظاہر ہوئی۔ ایسے ہی تجربات نے 'ٹھاکر کا کنواں' نظم مجھ سے لکھوائی۔

یہ کڑوی یادیں میں بھول نہیں پاتا ہوں۔ رہ رہ کر بجلی کی طرح میرے دماغ میں گھومتی ہیں، کہ اپنی محنت کی قیمت مانگنا گناہ کیوں ہے؟ جمہوری حکومت کی دہائی دینے والے لوگ سرکاری مشنری کا استعمال رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کو ٹھنڈا کرنے کے لئے کرتے ہیں جیسے کہ ہم اس ملک کے شہری ہی نہیں ہیں۔ کمزور اور بے بسوں کو ہزاروں سالوں سے اسی طرح دبایا گیا ہے۔ کتنی ہی عقل مندی مکّاری اور فریب کا شکار ہو کر ختم ہو گئی۔ اس بات کا کسی کے پاس کوئی حساب نہیں۔

وہ لوگ مار کھا کر لاچار گھر لوٹ آئے۔ ان کے چہروں پر خاموشی تھی، آنکھوں میں گہرا

درد تھااور جسم زخمی۔اس روز بستی کے کسی گھر میں بھی چولھا نہیں جلا۔سب لوگ ڈرے سہمے تھے۔اس حادثہ نے آپسی دوستی خلوص ومحبت کو بھی ختم کر دیا تھا اور پھر شروع ہوا گاؤں سے ہجرت کا سلسلہ....دھنو،ہرنام،گرنام،فوجا،جسبیر ایک ایک کر کے شہر کی طرف چل دیے۔جہاں انھیں ایک نئی روشنی اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔گاؤں کی زمین جب بانجھ ہونے لگے کو اس میں کھاد پانی دینے کی ہمت بھی ختم ہو جاتی ہے۔اپنا گاؤں جب اپنا ہی نہ رہے تو لگاؤ کیسا؟

بستی میں جب کوئی بیمار ہوتا تو دوا دارو کے بجائے،بھوت کے سائے سے چھٹکارا پانے کا کام ہوتا۔جھاڑ پھونک،ٹونے ٹوٹکے،تعویذ گنڈے کو آزمانے کا کام شروع کیا جاتا تھا۔یہ تمام کام رات میں کیے جاتے تھے۔جب بیماری لمبی کھینچ جاتی یا بیماری آخری موڑ لے لیتی تو کسی بھگت کو بلا کر 'پوچھا' کی جاتی تھی۔ایسے وقت میں بھگت کے ساتھ ایک ڈھول بجانے والا اور دو تین گانے والے ہوا کرتے۔جو ڈھول کی خاص تال پر ہم آواز ہو کر گاتے تھے۔گانے میں اس دیوتا کی خوبیاں بیان کی جاتیں،جس کو بھگت کے جسم میں داخل ہونا ہوتا۔سُر تال سے ایسا ماحول بنا دیا جاتا کہ اچھا خاصا آدمی جھومنے لگے۔گانوں میں غیر مہذب الفاظ کی بھرمار ہوا کرتی جس سے دیوتا کے سامنے خود کو قریب کرنے کی کوشش کی جاتی۔

بھگت کے جھومتے ہی ڈھول اور گانا دونوں رک جاتے۔بھگت کا سر اور ہاتھ وغیرہ کے جھومتے ہی یہ مان لیا جاتا کہ دیوتا آگئے ہیں۔دیوتا اپنا نام بتاتا،سب کو رام رام کہتا اور پھر گھر کا بزرگ دیوتا کے سامنے مریض کی تکلیف کو بیان کرتا۔دیوتا مریض کو چھو کر یا اس کا معائنہ کر کے مریض کے اوپر آئے ہوئے بھوت کا تفصیلی ذکر کرتا اور اس سے چھٹکارے کی بات کرتا۔ان دیوتاؤں کو 'پَون' کہا جاتا ہے۔کلوا،ہری سنگھ نلوا اہم اور بڑے پَون ہیں،جو زیادہ تر گھروں میں پوجے جاتے ہیں۔کئی دیویاں بھی ہیں جن میں ''مائی مدارن'' سب سے زیادہ اہم ہیں۔

کہنے کو تو بستی کے سبھی لوگ ہندو تھے۔لیکن کسی ہندو دیوی دیوتا کی پوجا نہیں کرتے تھے۔کرشن جی کی یوم پیدائش کے موقع پر کرشن کی نہیں بلکہ 'جہار پیر' کی پوجا ہوتی تھی یا پھر 'پَون'

پوجے جاتے تھے۔ وہ بھی 'آشٹمی' میں نہیں بلکہ 'نومی' میں۔ اسی طرح دیوالی پر 'لکشمی' کی نہیں بلکہ 'مائی مدارن' کے نام پر سور کے بچے کو ذبح کیا جاتا یا پھر کڑاہی کی جاتی تھی یعنی حلوا پوری کا کھانا ہوتا تھا۔ تیوہار کوئی سا بھی ہو لیکن پوجا انھیں دیوی دیوتاؤں کی ہوا کرتی تھی۔

'پوچھا' کے بعد بھوت کو پکڑ کر دیوتا اپنے قبضہ میں کر لیتا اور مریض کو مرض سے چھٹکارا دلانے کا حکم دیتا۔ جب دیوتا کی خواہش پوری ہو جاتی تو سور کی قربانی کی جاتی اور ساتھ میں شراب کی ایک بوتل بھی۔ شادی ہو یا زندگی موت رسومات، ان دیوتاؤں کی پوجا ضروری تھی۔ اگر کوئی بھول جائے یا جان بوجھ کر نہ کرے تو بدشگونی ہونے کا خطرہ رہتا۔ ایسے ماحول میں رہ کر بھی دیوتاؤں کے متعلق میرا عقیدہ کبھی نہیں رہا۔ مجھے یہ بھگت سارے ڈھونگی لگتے تھے۔

جب ہمارے گھر میں اس طرح کی پوجا ہوتی تو میں گھر کے باہر ہی بیٹھا رہتا یا پھر ادھر ادھر ٹہلتا رہتا۔ بچپن سے ہی عادت ہو گئی تھی۔ بابا ان باتوں پر خفا بھی ہوتے۔ وہ آباواجداد کے مذہب کی باتیں بھی بتایا کرتے، جو میرے گلے ہی نہیں اترتی تھیں۔ لیکن پھر بھی میں اس موضوع پر بحث نہیں کرتا تھا۔ بس خاموشی اختیار کر لیتا۔ وہ چڑھ جاتے، اس بات پر ڈانٹتے بھی تھے لیکن میری حرکتوں سے تنگ آ کر وہ بھی خاموش ہو جاتے۔ بار بار ایک ہی بات کرتے تھے۔

''منشی جی.... ایسا ئی تو نہیں کہ عیسائی ہو گئے ہو؟''

اور میں انھیں اس بات کا یقین دلاتا۔

''نہیں میں عیسائی نہیں ہوا ہوں۔''

لیکن دماغ میں ایک ہلچل سی ہوتی تھی کہ ہندو بھی تو نہیں ہوں اگر میں ہندو ہوتا تو ہندو مجھ سے اتنی نفرت، اس قدر تفرق کیوں برتتے؟ بات بات پر ذات پات کی نفرت میرے اندر کیوں بھرتے؟ میرے ذہن میں یہی خیال آتا تھا کہ اچھا انسان بننے کے لئے یہ ضروری کیوں ہے کہ وہ ہندو ہی ہو.... ہندوؤں کی نفرت بچپن سے دیکھی ہے، اسے جھیلا ہے، اعلی ذات ہونے کا غرور کمزور کو ہی کیوں مارتا ہے؟ آخر دلتوں کے لئے ہندو اتنا بے رحم

کیوں ہے؟

میرے بابا مجھے ڈانٹ کر اپنی پوجا میں مصروف ہو جاتے تھے گھر کے تمام افراد وہاں موجود ہوا کرتے۔ میں تنہا اپنے خیالات میں کھویا رہتا۔ اندھیروں کی گہری پرتوں میں خود کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا۔ ان باتوں نے مجھے خاموش اور گم سم بنا دیا تھا۔ جب بھی رات کے سناٹوں میں کسی گھر میں 'پون' کی بڑائی کے ساتھ ڈھول بجنے اور گانے کی آواز سنتا تو میری نیند اڑ جاتی تھی۔

جب کسی کو بھگت بنایا جاتا تو سوا مہینے تک ڈھولک اور گانا بجانا جاری رہتا۔ گھر کے اندر سوا مہینے تک چراغ جلتا رہتا جس کے سامنے بھگت بنایا جانے والا آدمی ہاتھ جوڑ کر ایک جگہ کھڑا رہتا۔ اس کے گلے میں دھاگے کی ایک موٹی سی مالا پڑی رہتی۔ ان چراغوں کے پاس انگاروں پر لوبان ڈالا جاتا جس کا دھواں پورے گھر میں پھیل جاتا تھا۔ ایسا ماحول بنا دیا جاتا جیسے اس گھر میں کوئی خفیہ راز پوشیدہ ہے۔

پَون کہلانے والا گرو، دیوی دیوتا کی بڑائی بیان کرتا۔ اس دیوتا کو طرح طرح کی لالچ دیتا تاکہ دیوتا نئے بھگت میں داخل ہو جائے۔ مہینوں بھر کی محنت کرنے کے بعد بھی لوگ بھگت نہیں بن پاتے تھے اور جو بن جاتے تو دیوتا کو سور اور شراب کا چڑھاوا چڑھاتے تھے اور پوری بستی کو کھانا کھلاتے، اس کے بعد بھگت 'پوچھا' کے لئے کسی کے بھی گھر جا سکتا تھا۔

ہمارے پڑوس میں بُرجا کا گھر تھا۔ اس کے اوپر بادی دیوتا آتے تھے۔ اس وقت اپنے منھ سے طرح طرح کی آوازیں نکالتے۔ خوب اُچھل کود کرتے تھے۔ ایسے دنوں میں بستی کا ماحول خوفناک اور ڈراؤنا ہوتا تھا۔ جیسے ہی شام ہوتی بچوں کو گھر سے نکلنے نہیں دیا جاتا۔ سب لوگ کو لگتا تھا کہ چاروں طرف بھوت ہی بھوت ہیں۔ میرے حساب سے بھوت ہوتے ہی نہیں ہیں، لیکن اس سے زیادہ تہذیب کے مستند ہونے سے خوف زدہ تھا۔ اس ڈر سے نجات پانے میں کافی وقت لگا تھا۔

میں گرمیوں کی چھٹی میں مہینے بھر کے لئے دہرادون چلا گیا۔ وہاں جاتے ہی پیچش ہو گئی۔ کافی عرصہ تک یہ بیماری ٹھیک نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے کہ اسکول کی چھٹیاں ختم ہوتیں

میں گاؤں واپس آ گیا لیکن پیٹ کا مروڑ اور درد ختم نہیں ہوا۔ والد نے نیم حکیم کو دکھایا بھی لیکن میں ٹھیک نہیں ہوا۔ دبلا پتلا تو پہلے ہی تھا اس مرض نے اور کمزور کر دیا۔ اسی دوران کید کی (گاؤں کا نام) سے میرے ایک رشتہ کے بہنوئی آئے تھے۔ اتفاق سے وہ بھی بھگت تھے۔ میرا تمام حال بابا نے انھیں سنایا۔ انھوں نے معائنہ کیا اور بابا سے بولے:

''کیوں دوا دارو کے چکّر میں ہو... اس پر تو اوپرا ہے۔'' (بھوت کی لپیٹ میں ہے)

تھوڑی دیر وہ زمین پر بیٹھ کر بڑبڑانے لگے، پھر اچانک ان کا پورا جسم حرکت کرنے لگا۔ انھوں نے کپڑا مانگا اور اس کا کوڑا بنا لیا۔ ان کے منھ سے ایک زوردار بھیانک آواز نکلی۔ کوڑا ہوا میں لہرایا اور سٹاک سے میری کمر پر پڑا۔ ایک تو کمزوری تھی اپر سے کوڑے کی مار، میں بری طرح تلملا گیا۔ انھوں نے دوبارہ کوڑا ہوا میں لہرایا۔ میں نے روکنے کی کوشش کی:

''جیجا جی، یہ کیا کر رہے ہو، مجھے چوٹ لگی ہے۔''

لیکن وہ تو اپنی ہی دھن مین تھے۔ تین چار پانچ کوڑے جڑ دیے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ بھوت مار کھا رہا ہے۔ لیکن جان تو میری نکلی جا رہی تھی۔ آخر کار میں نے کوڑا پکڑ کر ان سے چھین لیا۔ وہ اور تیز آواز میں مجھے ڈرانے لگے۔ میں نے چلاّ کر بابا سے کہا:

''مجھے جان سے مار ڈالے گا اسے روکو مجھے بھوت نہیں چپکا ہے۔''

اچانک ان کا دیوتا جسم چھوڑ کر غائب ہو چکا تھا اور وہ چپ چاپ اپنے سر کو پکڑے بیٹھے تھے، جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میرا تو پور پور درد کر رہا تھا۔ ان کی کوئی بھی چال جب مجھ پر کارگر ثابت نہیں ہوئی تو وہ صبح ہوتے ہی اپنے گاؤں واپس چلے گئے۔ میرا یقین اور پختہ ہو گیا کہ یہ سب ڈھونگ ہے۔ عقیدت کے سامنے کوئی بھی دلیل اہمیت نہیں رکھتی۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو ان بھگتوں نے مار ڈالا۔ میرے دو بھائی، بغیر دوا کے ہی چل بسے تھے۔ جگدیش کی عمر اس وقت مشکل سے سترہ یا اٹھارہ برس کی ہوگی جسمانی طور سے وہ مضبوط تھا مگر بخار کی وجہ سے دو دن کے اندر ہی اس کی موت ہو گئی۔ بالکل اسی طرح سکھبیر 25-24 سال کے رہے ہوں گے جب ان کا بھی انتقال ہوا۔ ہر سال بستی میں ایک یا دو موت ہو جایا کرتی تھیں۔ پھر بھی ان دیوتاؤں اور بھگتوں سے لوگوں کی عقیدت کم نہیں ہو رہی تھی۔

پوجا کے لئے مارا گیا سور اور شراب کسی جشن سے کم نہیں ہوتے۔ دو گھونٹ گلے میں اترتے ہی آدمی ہوا میں اڑنے لگتا۔ وہ شراب گھر میں بنائی جاتی تھی، جس کو کچی شراب کہا جاتا تھا۔ کبھی کبھار چھپاریا پُرکا جی (نام) کے ٹھیکے سے بھی دیسی بوتل منگا لیتے۔ شراب پی کر گالی گلوج، لڑائی جھگڑا، مار پیٹ عام بات تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر رنجش پیدا ہو جاتی کہ آپس میں ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تل جاتے تھے۔ ایسی ہی تھی زندگی، وہ دن بھی بہت اہم تھے۔ ان دنوں میں ان سے بھاگنا چاہتا تھا آج وہ میری طاقت بن کر مجھے حوصلہ دیتے ہیں۔

گاؤں کے مغرب میں ایک بڑے سے تالاب (جوہڑ) کے کنارے اونچے چبوترے پر ماتا کا مندر تھا۔ اس تالاب میں جل کنبھیوں کا قبضہ تھا۔ کسی زمانے میں مندر کا چبوترا ایک بڑے پیپل کے نیچے ہوا کرتا تھا۔ اس کے تین طرف تگاؤں کے گھر تھے۔ اس مندر میں اشاڑھ (جون۔ جولائی) کے مہینے میں ایک خاص قسم کی پوجا ہوتی تھی، جس کا انتظار ہمارے بستی کے لوگ پورے سال کیا کرتے۔ مندر کا چڑھاوا بستی کے لوگوں کو ہی ملتا تھا، جس میں کپڑے، دوپٹے، چوڑیاں، پیسے، پوریاں، مال پوئے، حلوا، بتاشے اور کبھی کبھار چاندی کے چھلاّ یا انگوٹھی، ... جس کی وجہ سے بستی کے لوگوں میں مار کٹائی بھی ہو جاتی تھی۔

اس مندر کے آس پاس کے گاؤں کی عورتیں بچے، لڑکیاں، بیل گاڑیوں میں بھر بھر کر اپنی منّتیں پورا کرنے آتیں۔ زیادہ تر لوگ اس مندر کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بستی کے لوگ چڑھاوے پر گدھ کی طرح جھپٹتے تھے۔ تب گاؤں کے بزرگوں نے اس کا حل نکالا کہ مندر کے چڑھاوے کو تین چار لوگ مل کر جمع کریں گے، پھر بستی میں لا کر اس کا بٹوارا ہوگا۔ پہلی بار جب اس فیصلے پر عمل ہوا تو مال پوؤں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔

ماتا کی پوجا کی اس بستی میں ایک اور اہمیت تھی۔ ماتا کے نام پر سور کے بچے، مرغے، بکرے چڑھانے کی بھی رسم تھی۔ بستی کے ہر گھر میں اس موقع کے لیے سور اور مرغے پالے جاتے۔ جن سے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی۔ برے حالات میں تھوڑا سہارا مل جاتا تھا۔ اس سال ہمارے گھر میں بھی آٹھ دس سور کے بچے تھے، جن میں اکثر فروخت ہو گئے تھے۔ گھر کے تمام لوگ کام میں مشغول تھے۔ میرے بابا اور بھائی جنیسر صبح سے ہی گراہکوں

کو ذبح کر کے دینے میں لگے تھے کہ اچانک کھائی کھیڑے سے ایک آدمی آیا اور اس نے منہ مانگے دام میں ایک بچہ خرید لیا لیکن اس بچے کی قربانی مندر کے سامنے والے باغیچہ میں ہونی تھی، جہاں اس کے گھر کے دوسرے افراد بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ میرے گھر میں تو سب کام میں مشغول تھے پھر بھی بابا نے بچے کے پیر اور منہ رسّی سے باندھ دیے۔ اس کے باوجود اُس کے منہ سے گھگھیاہٹ نکل رہی تھی۔ اس دن میرے اسکول میں چھٹی تھی۔ میں بھی سب کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ بابا نے بندھے ہوئے بچے کو میرے کندھے پر رکھ دیا۔ میں حیرانی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر بھی انھوں نے جبراً مجھے ان کے ساتھ کر دیا۔ وہ میری اس ہچکچاہٹ پر بہت ناراض تھے۔ آٹھ دس کلو کے بچے کو کندھے پر رکھ کر چلنا میرے لئے دشوار ہو رہا تھا، اور باغیچہ بھی بہت دور تھا۔ وہ آدمی میرے آگے آگے اور بہت تیز رفتار سے چل رہا تھا۔ بوجھ کی وجہ سے میری چال دھیمی تھی۔ باغیچہ تک پہنچتے پہنچتے میرے ہاتھ پیر سُن ہو گئے۔ باغیچہ میں کئی بیل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ آٹھ دس عورتیں ڈھول کے ساتھ ماتا کے گیت گا رہی تھیں۔ کچھ لوگ ایک گروہ بنا کر حقّہ گڑگڑا رہے تھے اور رہے بچے، وہ کھیل کود میں مگن تھے۔ سور کے بچے کی آواز سنتے ہی تمام بچے کھیل چھوڑ کر میرے اردگرد جمع ہو گئے۔ وہ سب اس بندھے ہوئے بچے کو تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ اس آدمی نے اپنی بیوی کو آواز لگائی۔ وہ ایک تھالی میں ہلدی، چاول لے کر آئی۔ ایک عورت نے جلدی سے زمین پر گوبر لیپ دیا، دوسری عورت نے آٹے سے اس پر آڑی ترچھی لائن کھینچ دی۔ آدمی نے بندھے ہوئے بچے کو اٹھا کر اسی جگہ پر رکھ دیا، جہاں گوبر اور آٹے کا لیپ تھا۔ اس کی بیوی نے بچے کے کان اور ماتھے پر ہلدی چاول کا تلک لگا کر ماتا کی جے جے کار کی۔ پھر سب نے تیز بلند آواز میں اسی کو دہرایا۔ پھر اس آدمی نے مجھ سے کہا:

''لو چھری اور کرو کام شروع... ماتا کا نام لے کر۔''

میرے لئے یہ لمحہ ایسا تھا جیسے کسی نے دھاکہ کر دیا ہو۔ کیونکہ یہ کام میں نے کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ ہاں! بابا کو کرتے ہوئے دیکھا ضرور تھا۔ ویسے بھی مجھے ان سب کاموں سے بے حد گھن آتی تھی۔ میرے تو ہاتھ کانپ رہے تھے۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ آدمی دہاڑا:

''ابے کرتا کیوں نہیں؟''

میں نے اس سے کہا: ''آپ ہی کرلو... مجھ سے ہوگا نہیں۔''

''نہیں ہوگا... تیرا مطلب کیا ہے؟'' ہم نے پیسے دیے ہیں یوتو تینے کرنا ہی پڑے گا۔''

اس کی آنکھوں میں غصہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن پھر بھی ہمت نہیں جٹا پایا۔ وہ پھر سے دہاڑا تو میں نے کانپتے ہاتھوں سے چھری اس بچے کے سینے پر رکھ دی۔ بچہ زور سے چلاّیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھی۔ ذرا سا دباؤ بڑھا تو وہ چھری اس کے سینے میں اتر گئی۔ تقریباً ایک انچ کے برابر۔ خون کا فوارا پھوٹا۔ اس آدمی نے چلاّ کر کہا:

''اور گھساؤ!''

لیکن چھری آگے ہی نہیں بڑھ رہی تھی۔ تو اس آدمی نے اپنے ہاتھ سے تیزی سے دبایا۔ خون سے میرے ہاتھ، منھ، کپڑے سب تر ہو گئے۔ اس آدمی نے خون کو کسی برتن میں جمع کر لیا۔ لیکن بچہ ابھی بھی چیخ رہا تھا۔ چھری اس کے دل کو پار کر گئی تھی لیکن پھر بھی اس میں جان باقی تھی وہ مرا نہیں تھا۔ وہ سب کھڑے میرا منھ تک رہے تھے اور میں بالکل بدحواس چھری پکڑے ہوئے تھا، جو بچے کے سینے میں گھسی ہوئی تھی۔ کافی دیر تک اس کی جان ہی نہیں نکل پائی تو ان لوگوں نے گھاس پھوس کی دہکتی آگ میں رکھ دیا۔ جب اس پر آنچ لگی تو وہ چلاّیا۔ اس لمحہ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے جسم میں جلنے کی وجہ سے پھپھولے پڑ گئے ہوں اور اچانک میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور سیدھے گھر پہنچ کر سانس لی۔ میرے بابا ابھی تک کسی کو بچہ پکڑ کر دے رہے تھے۔ جب تک وہ مجھ سے کچھ پوچھتے میں اندر ماں کے پاس چلا گیا۔ ماں میرا حال دیکھتے ہی گھبرا گئی۔ ماں کی گود میں سر رکھ کر میں بہت رویا۔ اگر اس روز ماں نے نہ سنبھالا ہوتا تو شاید میرے دماغ کی رگیں پھٹ جاتیں۔ تکلیف اور رنجیدگی کی جس بھنور میں الجھ گیا تھا، اس نے مجھے بہت اندر تک جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ماں باپ میں اس بات کو لے کر بہت جھگڑا بھی ہوا۔ تو تو میں میں کے ساتھ نوبت مار پیٹ تک آ گئی تھی۔ ماں نے تو صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا:

''اوم پرکاش یہ کام نہیں کرے گا۔''

ماں نے اس طرح سختی سے کہا کہ بابا باہر نکل گئے۔ شاید وہ وہیں گئے تھے جہاں میں کام ادھورا چھوڑ کر آیا تھا۔ ان کی زبان تھی کہ:

''ان سے پیسے لیے ہیں تو ان کام پورا کر کے دینا ہے۔''

یہی ان کی دلیل تھی یہی ان کا طریقہ تھا کام کرنے کا۔ اس واقعہ کے بعد میں کئی دنوں تک اصل حالت میں نہیں آپایا۔

تیاگی انٹر کالج کی عمارت گاؤں سے باہر ہی تھی۔ مظفر نگر جانے والی سڑک پر ایک ٹیلہ تھا۔ جس کو برابر کر کے کالج کی عمارت کھڑی کی گئی تھی۔ اب اس کالج کا نام 'برلا انٹر کالج' ہے۔ اس کے چاروں طرف لہلہاتے کھیت ہیں۔ اس کی شمال کی طرف گاؤں برلا ہے تو جنوب میں چھپار، مشرق میں تاج پور اور مغرب میں گاؤں نگلاں ہے۔ کالج کی بلند عمارت پر کشش ہے، جس کے دونوں کنارے گولائی لیے ہوئے ہیں۔ سامنے کا حصہ انگریزی کی 'ای'،'E' کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ شروع شروع میں یہ ایک منزلہ عمارت تھی۔ بعد میں اوپری منزل کا کام شروع ہوا۔ ہر طرف سے کھلا ہوا تھا۔ آب وہوا دونوں صاف ستھری۔ سردیوں کے دنوں میں ہماری کلاسیں دھوپ میں لگتی تھیں۔ اچھا بڑا کھیلنے کا میدان، عمارت کے سامنے بھی ہرا بھرا باغیچہ (میدان) تھا۔ کلاس شروع ہونے سے پہلے ہم اسی میدان میں اجتماعی دعا کے لئے جمع ہوتے تھے۔ 15 / اگست اور 26 / جنوری کو اسی میدان میں جھنڈا لہرایا جاتا۔ اس جھنڈے کے سامنے ہر ایک کلاس کے بچے لائن سے کھڑے ہوتے تھے، اجتماعی دعا کے لیے۔

پھول سنگھ تیاگی پی ٹی کے ماسٹر تھے۔ بہت غصہ کرتے ان کی زبان بھدّی، ہر وقت ناک بھوں چڑھی رہتی تھی۔ بات بات پر گالی دینا ان کی عادت میں شامل تھا۔ لکڑی کی تیلی سے دانت صاف کرتے رہتے۔ پڑھاتے کیا تھے سبق کو رٹاتے تھے۔ این۔ سی۔ سی کے انچارج بھی تھے۔ تمام طالب علم ان سے ڈرے رہتے۔ ایسا ڈر کہ سایہ کی طرح ہمارا پیچھا کرتا تھا۔ جیسے ہی کلاس میں آتے ہر ایک طالب علم کو پہلے ہی خوفزدہ کر دیتے۔ اگر کوئی کلاس

میں ذرا بھی ہلا تو گھنٹوں مرغا بنا پڑتا تھا۔ تھپڑ، لات، گھونسے تو ان کے لیے عام بات تھی۔ ان کے قریب کھڑا ہونے سے بھی ڈر لگتا تھا۔ پتا نہیں کب ہاتھ پاؤں چلنے لگے، کوئی بھروسا نہیں تھا۔ ان کے سامنے ہر کسی کی حالت خراب رہتی تھی۔ ایک روز دعا کے وقت کچھ زیادہ ہی غصہ میں کھڑے تھے۔ ہماری کلاس کا مانیٹر رام سنگھ، جو قطار میں سب سے آگے کھڑا تھا اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے سُرجن سنگھ۔ سُرجن سنگھ میرے دہرادون والے ماما کا بیٹا، عمر میں مجھ سے کئی سال بڑا تھا لیکن نویں کلاس میں ہم دونوں ساتھ تھے۔ ہماری لائن کی دائیں طرف دسویں کلاس کے طالب علم کھڑے تھے، جو کافی شرارتی تھے۔ رام سنگھ نے انھیں ٹوکا بھی۔ پھول سنگھ تیاگی سامنے دوسرے اساتذہ کے ساتھ کھڑے تھے۔ انھیں لگا رام سنگھ کچھ شرارت کر رہا ہے وہ رام سنگھ پر چلاّئے:

''ابے کالے داروغہ (وہ رام سنگھ کو اسی نام سے پکارتے تھے) سیدھا کھڑا رہ... ورنہ پیٹ پیٹ کے ٹیڑھا کر دوں گا۔''

ان کے 'کالے داروغہ' کہنے پر سب ایک ساتھ ہنس دیے جس سے ماسٹر پھول سنگھ اور زیادہ چڑھ گئے۔ ہنسے تو سب ہی تھے لیکن ماسٹر پھول سنگھ میرے پیچھے کھڑے سُرجن سنگھ پر پل پڑے۔ ان گنت لات گھونسوں کی بوچھار کر دی۔ وہ سُرجن کو اس قدر بے رحمی سے مار رہے تھے کہ انھیں دیکھ کر نہیں لگتا نہیں تھا کہ استاد اپنے طالب علم کو سزا دے رہا ہے بلکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ظالم غنڈہ کسی بے گناہ کو پیٹ رہا ہے۔ سُرجن سنگھ زمین پر گر پڑا لیکن وہ اپنی لات اور گھونسے چلاتے رہے۔

اس وقت کی ایک بات جو کانچ پر لکیر کی طرح کھینچ دی گئی ابھی تک ابھی میرے ذہن میں گونج رہی ہے:

''ابے سالے چوہڑے کی اولاد، جب مر جائے گا بتا دینا... بہت ہیرو بڑے ہیں آج کاڑھوں گا (نکالوں گا) تیری زلفوں کا تیل۔''

سُرجن کو مارتے مارتے وہ تھک گئے۔ سُرجن سنگھ زمین پر پڑا تھا۔ اس کے تمام چہرے پر گومڑ اُبھر آئے تھے۔ سارے جسم پر نیلے نیلے نشان پڑ گئے۔ سارے بچے خاموش

کھڑے تھے اور اساتذہ بھی خاموشی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ پرنسپل یشو پرتیاگی بنا کسی الجھن کے چپ چاپ کھڑے تھے کہیں سے کوئی مخالفت نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

میرا رواں رواں ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔ دل میں دہشت بیٹھ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ تمام جسم کا خون کسی چیز نے جذب کرلیا ہو۔ اس واقعہ کے بعد اکثر و بیشتر ڈراونے خواب آنے لگے تھے۔ ہر لمحہ ڈر لگا رہتا تھا۔ ان دنوں میں کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ کسی سے بھی بات کرنے کی خواہش نہیں ہوتی تھی۔ سُرجن سنگھ پر جو گذری وہ تو گذری ہی پر انسانیت کے خلاف جو حادثہ پیش آیا تھا وہ آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ وہ دہشت میرے دماغ پر بری طرح حاوی ہوگئی تھی۔ سُرجن سنگھ بغیر کسی غلطی کے بھی مارا گیا۔ اگر ہنسنا گناہ ہے تو سب ہی ہنستے ہیں، پھر سزا صرف سُرجن کو ہی کیوں ملی؟ سُرجن پورے اسکول کالج والوں کی آنکھوں میں کرکرا رہا تھا۔ بچپن سے ہی وہ دہرادون میں ہی رہا تھا۔ اس کے رہنے سہنے کا طریقہ، اس کے کپڑے بھی دوسروں سے مختلف ہی نہیں بلکہ بہتر بھی تھے۔ وہ سب کی نظروں میں کھٹک رہا تھا۔ استاد ہو یا طالب علم سب اس سے چڑھتے تھے کہ ایک چوہڑے کے گھر پیدا ہوا بچہ ان سے بہتر کیسے ہوسکتا ہے؟ اس واقعہ کے بعد سُرجن کا یہاں سے دل ہی اکھڑ گیا۔ پڑھائی سے بھی وہ دور بھاگنے لگا۔ جیسے ہی ہائی اسکول کے امتحان ختم ہوئے وہ فوراً ہی دہرادون کے لئے روانہ ہوگیا۔ پھول سنگھ سے بدلا لینے کا خیال اس کے اندر پیدا ہوا تھا لیکن وہ اس خیال کو پورا نہیں کرسکتا تھا۔ وقت کے مرہم نے اس کے زخم کو بھر دیا تھا۔

ایسے ہی مثالی اساتذہ سے ہمارا سابقہ پڑا ہے۔ بچپن سے جب بلوغت کی طرف قدم رکھا، جب انسانی شعور پیدا ہوا تب ہمارے سامنے اسی طرح دہشت بھرا ماحول تھا، جس میں ہم نے زندگی گذاری۔ اس تکلیف کا احساس ان لوگوں کو کیسے ہوسکتا ہے جنھوں نے نفرت اور تعصب کی باریک سوئیوں کا درد اپنے جسم پر کبھی محسوس ہی نہیں کیا؟ جنھیں کبھی بے عزتی اٹھانی ہی نہیں پڑی؟ وہ بے عزت ہونے کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ ریت کے ٹیلے بکھر جانے سے آواز نہیں ہوتی لیکن اندر تک ہلا دینے والی ایسی لکیر کھنچ جاتی ہے، جو جسم کے آر پار ہوجاتی ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا تھا جیسے کہ ہم لوگ آدم خور تہذیب میں رہ کر بڑے ہوئے ہیں۔

برج پال تیا گی بی۔ ایس۔ سی کرتے ہی 'برلا کالج' میں استاد ہو گئے تھے اور ہمیں سائنس پڑھاتے تھے۔ کالج کے ناظم تیاگی ہی تھے۔ برج پال سنگھ تیاگی دیوبند کے پاس کے گاؤں کے ہی رہنے والے تھے۔ برالا میں ان کی کئی رشتہ داریاں تھیں۔ ماسٹر ہوتے ہی انھوں نے ایک ہرے رنگ کی سائیکل خریدی۔ اس زمانے میں سائیکل بہت کم لوگوں کے پاس ہوا کرتی تھی۔ ایک اور استاد دیشویر سنگھ تیاگی کے پاس بھی سائیکل تھی۔

کرائے کی سائیکل سے میں نے سائیکل چلانا سیکھی تھی۔ سائیکل چلانے کا ایسا جنون سوار تھا کہ کئی بار گرا، بہت چوٹ بھی آئی... مگر سیکھنا نہ چھوڑا۔ ہمارے بستی کے پاس آم کا باغ تھا۔ جس میں کھیل کے ساتھ ساتھ شادی بھی اسی میدان میں ہوا کرتی۔ بارات بھی آ کر اسی میدان میں ٹھہرتی۔ میری پڑھائی کی شروعات بھی ان ہی باغات میں ہوئی تھی۔ ماسٹر سیوک رام مسیحی نے انھیں باغوں میں ہماری پڑھائی شروع کرائی تھی۔ یہی ہمارا پہلا اسکول تھا اور اسی باغ میں سائیکل چلانا بھی سیکھی لیکن اب ان باغات کو کاٹ کر مکان بنا دیے گئے ہیں ۔میرے ذہن میں ابھی بھی ان باغات کی ڈھیروں یادیں موجود ہیں۔

ہماری بستی میں دو بھائی بھکھو رام اور بالک رام تھے۔ بڑا بالک رام انٹر کالج میں جھاڑو لگاتا تھا اور چھوٹا اس کے کام میں مدد کرتا تھا۔ ماسٹر نے اسے کلاس میں بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس سے پہلے اس کی پڑھائی کسی اسکول میں نہیں ہوئی۔ اپنے کلاس کے سبھی بچوں سے وہ تقریباً نو دس سال بڑا رہا ہوگا لیکن وہ محنت اور لگن سے پڑھائی کرتا اور ساتھ ہی اساتذہ کے ذاتی کام بھی کر دیا کرتا تھا۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا:

''برج پال ماسٹر کے گاؤں جانا ہے۔ ان کے گھر سے گیہوں کا کٹّہ لانا ہے۔ سائیکل سے چلیں گے۔''

وہ مجھے ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا:

''سائیکل کہاں سے لو گے؟''

اس نے جواب دیا: ''ماسٹر برج پال کی سائیکل سے چلیں گے۔''

ماسٹر برج پال کی ہری سائیکل کا نام سنتے ہی میں خوش ہوگیا۔ گھر سے اجازت ملتے ہی ہم لوگ اگلے روز صبح ہوتے ہی نکل پڑے۔ برلا سے دیوبند جانے کا راستہ کچّا تھا۔ جس پر سائیکل چلانا بہت مشکل تھا۔ کہیں کہیں تو ریت اس قدر تھی کہ پیدل ہی چلنا پڑ رہا تھا اور سائیکل کھینچنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ گپالی کے بعد نالا پار کرتے ہی کالی ندی کا حصہ شروع ہو گیا۔ جب ندی پار کی تو سائیکل کو بھگّھو رام نے اپنے کندھوں پر رکھ لیا۔ دیوبند سے تقریباً دو میل پکّی سڑک تھی۔ پھر گاؤں جانے کے لئے کچّہ راستہ شروع ہوتا تھا۔ پکّی سڑک پر آتے ہی بھگّھو رام نے سائیکل چلانے کے لئے مجھے دے دی اور خود اس کے کیریئر پر بیٹھ گیا۔ اس کا وزن تو بہت تھا پھر بھی سائیکل چلانے کے جوش میں اس کا وزن بھی بھول گیا۔ سورج نکلنے سے قبل ہی ہم لوگ برج پال سنگھ کے گاؤں پہنچ گئے۔ جب ہم لوگ ان کے گھر پہنچے تو اس وقت تک ان کے گھر کے سارے لوگ کھیتوں پر جا چکے تھے۔ گھر میں صرف عورتیں اور بچے ہی تھے۔ کافی انتظار کرنے کے بعد برج پال ماسٹر کے بھائی آئے۔ بھگّھو رام کو وہ اپنے ساتھ اندر لے گئے (شاید اناج کی کوٹھری میں) اور میں باہر ہی چبوترے پر بیٹھا رہا۔ سائیکل چبوترے کے نیچے گلی میں کھڑی کر دی۔ کچھ دیر بعد ایک بزرگ آئے، چبوترے پر پڑی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ سر کے نیچے کندھے کی چادر کو رکھ لیا وہ کافی دبلے پتلے تھے۔ چہرے کی جھرّیاں ابھری ہوئیں تھیں۔ انھوں نے کسی کو آواز لگائی۔ برج پال سنگھ کا بھائی باہر آیا اور حقّے پر سے ٹھنڈی چلم کو لے جانے لگا۔ تو اس بزرگ نے پوچھا:

''یہ کوڑ بیٹھا ہے؟''

ان کا اشارہ میری طرف تھا۔

''برلا سے آیا ہے برج پال نے بھیجّا..؛ گیہوں لیڑ ے آئے ہیں...ایک بھیتر ہے کٹّے میں گیہوں بھر رہا ہے۔''

بھائی نے جواب دیا۔ بزرگ نے میری طرف دیکھا۔

''بیٹے یہاں کیوں بیٹھا ہے...انگھے (یہاں) آ کے چارپائی پہ بیٹھ جا۔''

میں نے ان کا جواب دیا: ''باباجی میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

''نہ بیٹے ، یہاں آکے بیٹھ۔''

ان کی ضد کرنے پر میں چار پائی پر بیٹھ گیا۔

''پڑھے ہے؟'' بزرگ نے سوال کیا۔

''جی میں دسویں میں ہوں۔''

''مہارا برج پال پڑھاوے ہے؟''

''جی''

بوڑھا چپ ہوگیا۔تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا:

''مہارے برج پال کو تو کلیکٹری مل رہی تھی وہ نہیں مانا ، اڑ گیا... مجھے تو ماسٹر ہی بڑنا ہے دیس میں اچھے ماسٹروں کی بہت کمی ہے۔ہم نے بی کہہ دیا... جو جی میں آئے کرلے ، یہاں کی پھکرمت کرنا ، باپ دادوں کی جمین جائیداد بہت ہے۔کھیتی باڑی ہے...''

میں ان کا راگ سن رہا تھا۔وہ مستقل بولے ہی جا رہے تھے۔اپنے بارے میں اپنے گھر خاندان کے بارے میں جیسے کہ صرف یہی دنیا ہے۔اس سے باہر کچھ ہے ہی نہیں۔

برج پال سنگھ کے بھائی نے باہر آ کے کہا:

''چلو ، روٹی تیار ہے ، کھالو۔''

میں نے انکار کر دیا تو بولے:

''گھر سے بنا کھائے جاؤ گے تو برلے میں مہاری کیا اجّت رہ جا گی۔''

ان کے بہت زیادہ اصرار کرنے پر میں ادھورے من سے اٹھا۔لیکن میری حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ بیٹھک کا دالان پار کرتے ہی کھلا کھلا آنگن تھا۔اس کے چاروں طرف اینٹوں کے پکّے کمرے بنے ہوئے تھے۔کمروں کے آگے برآمدہ تھا۔اس برآمدہ میں کچے فرش پر گوبر کا لیپ تھا۔اس پر پیتل کی کلائی دار دو تھالیاں رکھی ہوئی تھیں۔تھالیوں کے نیچے ایک کنارے پر ایک ایک بڑا سا کنکڑ رکھا ہوا تھا۔اس تھالی میں گڑ اور اچار تھا۔ برج پال کے بھائی نے مجھے اور بھگھو کو بیٹھنے کو کہا۔ میں ڈرتے ڈرتے بیٹھا۔تکلف اور ڈر دونوں ہی مجھ پر

حاوی تھے۔ تھالی کے نیچے کنکڑ کا راز اس وقت کھلا جب پتلی دال ہم کو دی گئی تا کہ پتلی دال پوری تھال میں نہ پھیل جائے۔ گرم گرم پھلکوں کی مہک ناک کے ذریعہ پھیپھڑوں تک پہنچ گئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں بیٹھ کر اس طرح کھانا کھا رہا تھا۔ وہ بھی کسی تگا کے گھر میں۔ وہ اتنے پیار سے کھلا رہے تھے پھر بھی میرا دل مشکل میں تھا۔ بھکھو رام نے تو ڈٹ کر روٹیاں کھائیں اور میں ڈر کے مارے ٹھیک سے کھا بھی نہیں پایا۔ بہر حال! کھانا کھا کر ہم لوگ گھر سے باہر آئے۔ بھکھو رام اس بزرگ کے ایک دم پاس والی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں تھوڑے فاصلے سے کھڑا رہا۔ اسی درمیان ایک اور آدمی وہاں آ گیا۔ بزرگ نے حقّے کی نلی اس کے پاس بڑھا دی۔ حقّے کی نلی سے دھواں کھینچتے ہوئے اس آدمی نے ہم دونوں کے بارے میں بزرگ سے پوچھ تاچھ شروع کی۔ برلا سے آئے ہیں سنتے ہی اس نے ایک اور سوال داغا:

''کوڑ جات ہے؟''

اس کے اس سوال کا جواب میں نے دے دیا:

''چوہڑا جات ہیں۔''

ان دنوں کے منھ سے ایک ساتھ نکلا تھا: ''چوہڑا؟''

بزرگ نے چارپائی کے نیچے پڑی ہوئی لاٹھی اٹھا کر بھکھو رام کی پیٹھ پر جڑ دی۔ بزرگ کا ہاتھ مضبوط تھا۔ اس کی ایک مار سے بھکھو رام تلملا گیا۔ بزرگ نے گندی گندی گالیوں کی جھڑی لگا دی۔ اس کی آنکھیں بھیانک لگنے لگیں تھیں۔ دبلے پتلے جسم میں جیسے شیطان سما گیا تھا۔ ان کے برتنوں میں عزت کے ساتھ کھانا کھانے، چارپائی پر بیٹھنے کی ہمّت جو ہم نے کی تھی وہ ان کی نظر میں بہت بڑا گناہ تھا۔ میں سہما ہوا چبوترے کے نیچے کھڑا تھا۔ اس بزرگ کے چلّانے کی آواز سے آس پاس بھیڑ جمع ہوگئی۔ کئی لوگ کہہ رہے تھے کہ ان دونوں کو رسّی سے باندھ کر پیڑ پر لٹکا دو۔ برج پال سنگھ کے بھائی نے اس بزرگ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ وہ بزرگ اسے بھی گالیاں دینے لگا۔ مہمان نوازی کا کھوکھلا پن ظاہر ہو چکا تھا۔ مہمان کی ذات ہی اسے عزت دلاتی ہے۔ ویسے بھی عزت پانے کا ہمیں حق

ہی کہاں تھا۔ میرا شک سچ میں تبدیل ہو گیا۔ کسی طرح ان لوگوں کی چنگل سے نجات پائی۔
گیہوں کا کٹّہ تو ہمیں مل گیا۔ اسے لیتے ہی ہم دونوں گاؤں سے نکل پڑے۔ کچّے راستے پر سائیکل کو کھینچنا پڑ رہا تھا۔ دونوں خاموشی سے سفر کر رہے تھے۔ جیسے ہی پکّی سڑک پر آئے ہم دونوں سائیکل پر سوار ہو گئے۔ بھگّھو رام مجھ سے سخت ناراض تھا۔ اسے اس بات سے شکایت تھی کہ اس پورے واقعہ کا ذمّہ دار میں ہی ہوں۔ تجھے کیا پڑی تھی سچ بولنے کی۔ اچھی خاصی عزّت ملی تھی سچ بول کر بے عزتی ہوئی اوپر سے لاٹھی بھی کھائی۔ ذات کے نام پر جو زخم ملے اسے بھرنے کے لئے ایک صدی بھی کم ہے۔ سائیکل کا ایک ایک پیڈل کئی کلو کا لگ رہا تھا۔ کچّے راستے کے بجائے ہم لوگ دیوبند سے سیدھے روحانہ، رام پور ترایا، چھپار ہو کر برلا کے لیے نکل پڑے۔ راستہ لمبا تھا لیکن سڑک پکّی تھی۔ کالی ندی کے باون درے پل پر ہم لوگ آرام کرنے تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرے۔ ابھی تک بھگّھو رام نے ہی سائیکل چلائی تھی، پل سے مجھے چلانی تھی۔ بھگّھو آگے ڈنڈے پر بیٹھ گیا۔ شام ہونے میں زیادہ وقت نہیں تھا پر اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے ہمیں گھر پہنچنا تھا لیکن اس روز گردش نے بھی اپنا رنگ دکھایا۔ راہ چلتا ایک آدمی ہماری سائیکل سے ٹکرایا۔ میں سنبھل نہیں پایا اور سائیکل کے ساتھ ہم دونوں گر پڑے۔ ہم دونوں چوٹ سے تو بچ گئے مگر سائیکل کے اگلے پہیے پر سامنے سے آتی بیل گاڑی نے اپنا پہیا اتار دیا۔ سائیکل کا رِم اور فریم کا اگلا چمٹا بری طرح مڑ گئے۔ یہ حادثہ جس طرح پیش آیا ہم دونوں دیکھتے ہی رہ گئے۔ اور تعجب سے سائیکل کو دیکھ رہے تھے۔ آس پاس کوئی دکان بھی نہیں تھی۔ ایک رکشہ والا خالی رکشہ لے کر آ رہا تھا اس رکشہ میں سائیکل رکھی اور گیہوں کا کٹّہ بھی۔ رکشہ والے کو دینے کے لیے میرے پاس تو ایک بھی پیسہ نہیں تھا۔ بھگّھو کے پاس جو بھی تھے اس نے دے دیے۔ رکشہ والے نے ہمیں مظفر نگر کے بازار میں سائیکل مرمّت کی دکان پر چھوڑ دیا۔ مستری نے رِم اور چمٹا کو سیدھا کرنے کا یقین تو دلایا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ دو لوگ بیٹھ کر نہیں جا پاؤ گے۔ اس بات نے ہماری تکلیف اور زیادہ بڑھا دی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے۔ دونوں کی جیب تو خالی تھی۔ اب مستری کو پیسے دینے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ تو کٹّے میں سے پانچ کلو

گیہوں نکال کر دیے۔اس وقت تک رات ہو چکی تھی۔ پیدل گاؤں پہنچنا تو مشکل تھا۔ سائیکل اور گیہوں لے کر ہم بس اڈے کی طرف چلے۔ آخری بس کھڑی تھی۔اس میں پہلے سے ہی بہت بھیڑ تھی۔ہم دونوں یہ سوچ کر بس اڈّے آئے تھے کہ کوئی پہچان کا مل جائے گا،لیکن کوئی نہیں ملا۔بھکھو رام کو یاد آیا کہ ماسٹر وید پال ماسٹری چھوڑ کر روڈ ویز میں کلرک ہو گئے ہیں۔وہ مجھے وہیں چھوڑ کر انھیں ڈھونڈنے نکل پڑا۔قسمت سے وہ مل بھی گئے۔لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس بس میں کسی ایک ہی کو کسی طرح بھیجا جا سکتا تھا۔بھکھو رام نے سائیکل اور گیہوں بس کی چھت پر چڑھا دیے اور خود بس میں چڑھنے لگا تو میں نے اس سے پوچھا:

''میں کیسے آؤں گا؟''

''میں تو جا رہا ہوں تم کل صبح کی بس سے آ جانا۔ماسٹر وید پال دفتر میں بیٹھا ہے وہ صبح تمھیں بیٹھا دے گا۔''

بھکھو رام سے جب تک میں کچھ اور کہہ پاتا کہ کنڈیکٹر نے سیٹی بجا دی۔بس کی گھر گھراہٹ میں میری آواز دب گئی۔بس اڈّے پر میں اکیلا کھڑا رہ گیا تھا۔اخری بس کے جاتے ہی بس اڈا بالکل سن سان سا ہو گیا۔عجیب آفت میں جان پھنس گئی۔شہر میں کسی کو جانتا بھی نہیں تھا۔تب میں بس اڈے کی بوکنگ دفتر کی طرف چلا۔کمرہ میں جھانک کر دیکھا تو ماسٹر وید پال بیٹھا حساب لکھ رہا تھا۔تیا گی انٹر کالج میں وہ ماسٹر رہ چکا تھا۔میں نے ہمت جٹاتے ہوئے کہا:

''ماس ساب،بھکھو رام تو چلا گیا میں بھی اسی کے ساتھ تھا...''

مجھے رکنے کا اشارہ کر کے وہ حساب میں مصروف ہو گئے۔میں وہی دروازے کے پاس کھڑا ان کا انتظار کرتا رہا۔کافی دیر بعد وہ باہر آ گئے۔

''چلو صبح کی پہلی بس میں بیٹھا دیں گے۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا:''ماس ساب میرے پاس کرایے کے پیسے نہیں ہیں۔''

انھوں نے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔میں ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔اس وقت میں خود کو بے حد کمزور اور ڈرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔وہ ایک چائے کی دکان پر لے گئے۔میرے لیے

ایک چائے اور ایک بند (پاؤ) منگایا اور خود وہ دودھ پی رہے تھے۔ خیر اس وقت چائے اور بند میرے لئے کسی کھانے سے کم نہیں تھے۔ بھوک تو بہت تیز لگی تھی مگر ڈر اور شہر میں اکیلے رہ جانے کی مشکل نے بھوک کو اور کم کر دیا۔

چھوٹے سے کمرے میں دو چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کھونٹیوں پر ایک دو کپڑے ٹنگے تھے اس کے علاوہ کوئی اور سامان وہاں موجود نہیں تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا۔ شاید وہ میری گھبراہٹ کو پہچان لیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا:

''جاؤ! اس چارپائی پر لیٹ جاؤ صبح چھ بجے کی بس میں بیٹھا دوں گا۔ ساڑھے چھ بجے تک گھر پہنچ جاؤ گے۔''

ننگی چارپائی کی رسّی کے چبھنے کا احساس بھی مجھے نہیں ہو رہا تھا۔ ماسٹر وید پال کپڑے بدل کر دوسری چارپائی پر لیٹ گیا۔ ابھی دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ کسی نے آواز لگائی۔ ماسٹر نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک آدمی اور ایک عورت کھڑی تھی۔ وید پال نے اسے اندر بلالیا۔ عورت بھی اندر آئی۔ انھیں دیکھ کر میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عورت چپ چاپ ایک طرف کھڑی تھی۔ وید پال اور وہ آدمی برآمدے میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وید پال نے اپنی چارپائی اٹھائی اور برآمدے میں جا ڈالی اور مجھے بھی باہر آنے کے لئے کہا۔

''رات بھر کی تو بات ہے فرش پر لیٹ جاؤ، یہ لوگ اچانک آ گئے ہیں۔''

میں برآمدے میں ننگے فرش پر لیٹ گیا نیند تو کوسوں دور تھی اوپر سے مچھروں نے پریشان کر دیا۔ وہ دونوں اندر اور وید پال چارپائی پر تھا۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے عجیب عجیب آوازیں آنے لگیں۔ چارپائی کی چرمرانے کی آواز الگ سے آ رہی تھی میں ان آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک دم عجیب سا ماحول بن گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد سب کچھ خاموش ہو گیا۔ وہ آدمی باہر آیا اور وید پال کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا:

''مال بڑھیا ہے... جا عیش کر۔''

کہتے ہوئے بیڑی سلگائی۔ وید پال کمرے میں چلا گیا تھوڑی دیر بعد پھر وہی آوازیں آنے لگیں۔ میری سانسیں تیز ہو گئی تھیں اور کچھ کچھ سمجھ بھی آنے لگا۔ میرا جسم اینٹھنے

لگا لیکن دم سادھے سانس روکے فرش پر لیٹا رہا۔ وہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ میں سویا ہوا ہوں۔ گھٹی گھٹی آوازیں اور جنگلی جانور کی سی گھوگھو کی آواز کے ساتھ چارپائی کی چرمراہٹ عورت اور مرد کے خاص کام کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ جو میرے لیے اس وقت تک ایک راز بنا ہوا تھا۔ آوازیں تھم گئیں، وید پال باہر آ گیا۔ دونوں گندے گندے مذاق کرنے لگے۔ اس آدمی نے میرے طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''یہ لونڈا کوڑ ہے؟ اسے بھی بھیج دے یار... یو بھی چکھ لے مزا۔''

وہ دونوں کھلکھلا کر ہنسے اور میں نے اپنی سانس کو اور زیادہ دبا دیا تھا۔ تمام رات اسی طرح گذری۔ کبھی وید پال اندر تو کبھی اس کا دوست۔ عورت پر کیا گذر رہی ہوگی۔ اس وقت میں اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ کمرے میں کیا چل رہا ہے میرے لئے دیکھ پانا مشکل تھا۔ کیونکہ ان دونوں میں سے ایک باہر رہتا تھا۔ آج اس عورت کے بارے میں سوچتا ہوں تو جی مچلانے لگتا ہے۔ پتہ نہیں کس مجبوری میں وہ ان کے پاس آئی ہوگی؟ شوق کے لئے یا خوشی میں؟ دو۔ دو مردوں کے لئے اپنے آپ کو نیوچھاور کر دینا۔ آج بھی میرا دل اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

جیسے ہی صبح کے پانچ بجے، ماسٹر وید پال مجھے بس اڈے لے آیا اور پہلی بس میں بیٹھا دیا۔ گھر پہنچتے ہی بابا کا غصہ بھی دیکھنا پڑا۔ بھکھو رام نے رات کو ہی پوری کہانی انھیں سنا دی تھی۔ وید پال کے کمرہ پر بتائی رات نے مجھے کافی پریشان کیا۔ برج پال سنگھ تیاگی کی نئی نویلی سائیکل کی جو حالت ہوئی اس کا ڈر الگ سے میرے دل میں بسا ہوا تھا۔ میں نے بھکھو رام سے کہا کہ میرا نام برج پال سنگھ کو نہ بتائے ورنہ کلاس میں میری پٹائی کر دیں گے۔

تیاگی انٹر کالج برلا میں ماسٹر لڑکوں کو لات گھونسوں سے مارتے تھے۔ یہ لات گھونسے کسی استاد کے نہیں بلکہ ایسا لگتا جیسے کوئی غنڈا مار رہا ہو۔ آخر استاد اپنے طالب علموں کو اتنی بے رحمی سے کیسے مار سکتا ہے۔ مظفر نگر کا وہ واقعہ میرے دل میں ہمیشہ سوال بن کر کھڑا رہا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں یہ تجربہ میرے لئے بہت تکلیف دہ تھا۔ لمحہ بھر کے لئے دیکھی اس عورت کی صورت بار بار میری آنکھوں کو سامنے آجاتی جسے دو بھیڑیوں نے رات بھر جھنجھوڑا تھا۔ صبح تک

اس میں کچھ باقی بھی رہا تھا یا نہیں - یہ میرے لئے ہمیشہ سوالیہ نشان بنا رہا۔

برج پال سنگھ کی سائیکل کا چمٹا اور رم ٹوٹ جانے کی خبر پورے انٹر کالج میں مشہور ہوگئی لیکن بھگھو نے میرا نام چھپا لیا تھا۔ پھر بھی برج پال سنگھ کو دیکھتے ہی میری گھبراہٹ بڑھ جاتی ۔ان کی کلاس میں بھی کبھی سکون سے نہیں بیٹھ پاتا تھا۔ ہر وقت یہی ڈر لگا رہتا کہ اب بھید کھلا ،اب کھلا۔ سائنس کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں ریاضی بھی پڑھانے لگے تھے۔ سالانہ امتحان سے پہلے ہی انھوں نے کلاس میں کہا تھا:

''کسی بھی طالب علم کو کچھ پوچھنا ہو تو یا کسی سوال میں شک ہو تو بنا جھجھک کے پوچھ سکتا ہے، میرے گھر آ سکتا ہے میں چاہتا ہوں میری کلاس کا ہر بچہ اچھے نمبر لائے۔''

میں نے ایک دن اسٹاف روم میں جا کر ان کے سامنے اپنی پریشانی بتائی۔ اس وقت تو انھوں نے ٹال دیا اور اگلے دن اتوار کو اپنے گھر آنے کو کہا۔ اتوار کی صبح کتاب کاپی لے کر میں ان کے گھر گیا۔ وہ دو منزلہ مکان کے دوسری منزل پر رہتے تھے۔ مکان ان کے بہنوئی کا تھا۔ جو نچلی منزل میں رہتے تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو وہ باورچی خانے میں اپنی بیوی کے ساتھ کچھ پکا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے:

''اپنی کتابیں سامنے منڈیر پر رکھ دو۔ اس کنستر میں گیہوں ہے۔ ذرا انھیں پسوا کر لے آؤ۔ تب تک میں خالی ہو جاؤں گا۔''

چکّی کافی دور تھی اور کنستر بھی بھاری۔ چکّی تک لے جانا میرے لئے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ پھر بھی پسوا کر لے آیا، جب واپس لوٹا تو وہ کہیں باہر جا چکے تھے۔ میں نے ان کی بیوی سے پوچھا تو بولی:

''پتہ نہیں کنھگے (کہاں) کو لکڑ گے (نکل گئے) بتا کے نہیں گئے۔''

میں انتظار کرتا رہا۔ ان کی بیوی کام میں لگی رہی جب کافی دیر ہوئی تو بولی:

''کچھ کام تھا کیا؟''

میں نے کہا:''ہاں ریاضی کے سوال پوچھنے تھے...''

وہ پھر اپنے کام میں لگ گئی۔ انتظار کر کے میں واپس آ گیا۔ میرے دل میں گہری کڑواہٹ بھر گئی تھی۔ گیہوں پسوانے کے لئے بھیج کر خود ہی کھسک لیے۔ بیکار ہی وقت برباد کیا۔ کئی دن تک دل میں گھٹن سی رہی۔ گھر میں کوئی ایسا تھا نہیں جو میری مدد کرتا۔ سکھن سنگھ کے ساتھ بیٹھ کر ان سوالوں کو حل کیا تھا۔ اس کے بعد دل میں یہ بات طے کر لیا کہ اب کسی ماسٹر کے چکر نہیں کاٹنے۔ ان کی بڑی بڑی باتیں صرف دکھاوا اور بناوٹی ہیں۔ اپنے ذاتی کام کرانے میں انھیں کوئی جھجھک نہیں ہوتی لیکن جب ہمیں مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو کنّی کاٹ جاتے یا کوئی اور کام نکل آتا۔ کسی نہ کسی شکل میں ذات بیچ میں آ ہی جاتی تھی۔ مجھے (پریکٹیکل) عملی امتحان میں اکثر کم نمبر ملتے تھے جبکہ تحریری امتحان میں اچھے نمبر آتے تھے۔ دسویں کلاس میں بورڈ کے امتحان تھے۔ ہندی اور انگریزی کا امتحان ہو چکا تھا۔ صرف اپنی بستی میں ہی نہیں بلکہ آس پاس کے گاؤں میں بھی اپنی ذات کا پہلا بچہ تھا جو ہائی اسکول کا امتحان دے رہا تھا۔ سب کی نظریں مجھ پر ٹکی تھیں۔ خود کو بھی ذمہ داری کا احساس ہونے لگا تھا۔ ریاضی کے امتحان میں تیاری کے لئے ایک دن کی چھٹی مل گئی تھی۔ صبح کے ساڑھے آٹھ بجے ہوں گے پوری بستی میں خاموشی تھی۔ بوڑھے اور بچوں کو چھوڑ کر سب اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے۔ میں اپنے گھر میں اکیلا ہی تھا۔ فوجی سنگھ تیاگی جس کو گاؤں میں سب فوجا کہتے تھے، کندھے پر لمبا ساڈ ندا دھرے میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا، بولا:

''ابے چوہڑے کیا کر رہا ہے؟''

''بورڈ کا امتحان ہے کل ریاضی کا پیپر ہے۔'' میں نے آہستہ آواز میں کہا:

''رات کو پڑھ لیو... اب میرے ساتھ چل اینکھ (گنّا) بونا ہے۔''

فوجا نے حکم دیا۔ میں نے اس سے بہت کہا مجھے پڑھنا ہے کل امتحان ہے، لیکن وہ نہیں مانا۔ زبردستی میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کھیت میں لے گیا۔ ڈرا دھمکا کر کام پر لگا دیا۔ گالیوں کی بوچھار سے میرا دماغ دہکنے لگا۔ اس روز مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔ تیاگیوں کے یہ ظلم میرے ذہن میں بہت گہرائی تک بھرے ہوئے تھے۔ جن کی تپش میں کئی بار جھلسا ہوں۔ پوری دوپہر اینکھ بوتا رہا۔ میرے ہی جیسے آٹھ دس لوگ اور تھے جنھیں بیگاری کے لئے پکڑ کر

لایا گیا تھا۔فوجا کی ماں دوپہر کا کھانا لے کر آئی۔کھیت میں شیشم کا ایک پیڑ تھا۔اس پیڑ کے نیچے اس کی ماں کھانا لے کر بیٹھ گئی۔ان کے گھر کے کئی لوگ تھے جو اس پیڑ کے سائے میں بیٹھے تھے۔سبھی کو کھانا کھانے کے لیے بلایا گیا۔پر بیگار کرنے والے دھوپ میں بیٹھے رہے۔پیڑ کی چھاؤں ان کے لیے بچی ہی نہیں تھی۔انھیں دو دو روٹی اور اچار کا ایک ایک ٹکڑا ایسے دیا جا رہا تھا جیسے کوئی بھکاری کو بھی نہیں دیتا۔میں دور کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔میں نے روٹی لینے سے انکار کر دیا۔فوجا چلاّیا، گالیاں دیتا رہا لیکن میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔میرے اندر مخالفت کی آگ بیدار ہو چکی تھی۔

''ابے چوہڑے کے...آجا...دو اچھر کیا پڑ لیے سوہرے (سور) کا دماغ چڑھ گیا ہے...اب اوکات مت بھول۔''

فوجا کا ایک ایک لفظ میرے جسم میں کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا۔آخر فوجا کی ماں نے مجھے آواز دی:

''کھجوری والی کے، آجا!...روٹی کھا لے۔''

میری ماں کو سب کھجوری والا ہی کہہ کر بلاتے تھے۔شاید اصلی نام تو وہ خود بھی بھول چکی تھی۔سہارنپور ضلع میں ہنڈن ندی کے کنارے کھجوری نام کا ایک گاؤں ہے۔جہاں میرا ننہال ہے۔ان کے آواز دینے سے میں ان کے پاس چلا گیا۔انھوں نے جب مجھے روٹی دی تو میرے ہاتھ میں روٹی کو بہت اوپر سے چھوڑ دیا تھا، کہیں ان کا ہاتھ میرے ہاتھ سے نہ لگ جائے۔یہ طریقہ میرے لیے ذلیل کرنے والا تھا۔میں نے وہ روٹیاں ان کے سامنے پھینک دیں اور گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔فوجا مجھے مارنے دوڑا لیکن پکڑ نہیں پایا۔گھر لوٹ کر ساری کہانی بابا کو بتا دی۔وہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔وہ مجھے کوئی بھی کام نہیں کرنے دیتے تھے۔کہا کرتے تھے بس پڑھائی کرو پڑھ لکھ کر اپنی 'جاتی' سدھارو۔انھیں خبر نہیں تھی کہ پڑھ لکھ کر جاتیاں نہیں سدھرتیں وہ تو پیدائش سے ہی ٹھیک ہوتی ہیں۔وہ لاٹھی اٹھا کر فوجا سے لڑنے جا رہے تھے بڑی مشکل سے ماں نے انھیں روکا تھا۔پوری بستی میں اس واقعہ کا اثر دکھائی دیا۔لوگوں نے بیگار کرنے سے منع کرنا شروع کر دیا۔ایک طرح سے تبدیلی کی

شروعات ہوگئی تھی۔گاؤں کے سبھی تیاگی میرے خلاف ہو گئے ۔راستہ میں تنگ کرنے لگے یہ حالات تھے جن میں رہ کر میں نے ہائی اسکول کے امتحان دیے تھے۔

ان دنوں کئی طرح کی مشکلیں درپیش تھیں۔ بجلی تو تھی نہیں، ڈھبری یا لال ٹین کی روشنی میں ہی پڑھا کرتا تھا۔ باندھ (رسّی) یا سُتلی والی چارپائی پر بیٹھ کر لال ٹین کو کسی اونچی جگہ رکھ لیتا۔آس پڑوس میں اس قدر شور ہوتا کہ کتاب میں دھیان لگانا مشکل ہو جاتا۔لڑائی جھگڑا تو عام سی بات تھی ایک دوسرے کو چلاّ چلاّ کر لڑائی پر اکسایا جاتا۔مرد اور عورت کے فرق کو بھی بھلا دیا جاتا۔جب گالیوں کا استعمال ہوتا تو سارے رشتے گالی بن جاتے تھے۔کبھی کبھی تو ڈھول تاشوں کا کان پھاڑ دینے والا شور ہوتا کہ پڑھنا بھی دشوار ہو جاتا۔اگر شوروغل کرنے سے منع کر دیا تو جھگڑا شروع۔امتحان کے دنوں میں اس شوروغل نے بہت پرتنگ کیا ہے۔ شور کرنے والوں کو یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ ان کے گانے بجانے سے میری پڑھائی میں رکاوٹ آرہی ہے۔وہ تو سن کر اور مذاق اڑاتے تھے۔میرے والد نے ان سب کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ الٹا انھیں ہی سمجھانے لگے۔

''کیوں لڑکے کو پڑھا لکھا کر نکما بنا رہے ہو؟ نہ گھر کا رہے گا نہ باہر کا۔ پڑھے لکھے تو ویسے بھی بے وقوف ہوتے ہیں۔''

میرے بابا کے خیالات اس سے مختلف تھے۔وہ چاہتے تھے کہ میں پڑھوں۔بس ان کے ذہن میں ایک ہی بات تھی' جاتی سدھاروں' اگر مجھ سے کبھی ناراض ہو جاتے تو عیسائی کی مثال دیا کرتے تھے جو بغیر پڑھائی لکھائی کے رہ گیا تھا اور کوئلہ بیچنے لگا تھا۔

میرا بستی کے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا کم ہونے لگا۔ان کی باتوں میں مجھے کوئی مزا نہیں آتا۔میری عمر کے لڑکے دن بھر آوارہ گھومتے، اکثر مجھے بلاتے بھی تھے۔گرمی کے دنوں میں بستی کے لڑکے جنگل یا کھیتوں میں خرگوش پکڑنے یا جوہڑ (تالاب) میں مچھلی پکڑنے جایا کرتے ۔ایک بار میں بھی ان کے ساتھ گیا تھا۔گیدڑ کے دو خوبصورت بچوں کو اٹھا لایا تھا۔جب بابا نے انھیں دیکھا تو بہت ناراض ہوئے۔ان کا غصہ بہت مشکل سے ختم ہو اتھا۔ان دونوں بچوں کو میں نے ٹوکرے کے نیچے بند کر رکھا تھا۔رات میں گیدڑ ہمارے گھر

کے پاس تک آ گئے تھے۔ بابا نے ان کی ہلچل سن لی تھی اس لیے بچوں کو اٹھا کر باہر کر دیا۔

بستی کے لوگ مجھے چُپّا کہتے تھے شاید اس لیے کہ میں ان لوگوں سے کم بولتا تھا۔ اس بات کی انھیں ہمیشہ شکایت رہتی۔ ان کے کام کاج میں بھی شامل نہیں ہوتا تھا۔ مجھے کتابوں میں ڈوبے رہنا پسند تھا۔ ایسے ہی دنوں میں اسکول کی لائبریری سے پریم چند، شرت چند، رابندر ناتھ ٹیگور کو پڑھ ڈالا تھا۔ دھیرے دھیرے میری توجہ ادب کی جانب ہونے لگی۔ کچھ تک بندیاں بھی کرنے لگا تھا۔ ہائی اسکول کے امتحان کا نتیجہ اخبار میں نکلا تھا۔ ان دنوں رول نمبر کے ساتھ ساتھ نام بھی لکھا ہوتا تھا۔ اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ میرے پاس ہونے کی خوشی میں بابا نے پوری بستی کی دعوت کی تھی، بالکل جشن کا سا ماحول تھا۔ پہلی بار اس بستی میں کسی نے ہائی اسکول پاس کیا تھا۔ اس روز ایک اور اہم بات ہوئی تھی۔ چمن لال تیاگی میرے پاس ہونے کی مبارک باد دینے ہمارے گھر آئے تھے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا جب کوئی تیاگی چوہڑے کے گھر مبارک باد دینے آیا ہو۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ حیرت میں ڈالنے والی بات یہ ہوئی کہ وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ بے حد اپنائیت کے ساتھ اپنے پاس بیٹھا کر دوپہر کا کھانا کھلایا، وہ بھی اپنے برتنوں میں۔ چھوا چھوت کے ماحول میں یہ واقعہ بہت ہی اہم تھا۔ کھاتے وقت بھی میں شک وشبہ میں تھا۔ ان کا بڑا بیٹا میری کلاس میں تھا۔ اس کا برتاؤ بھی میرے ساتھ ہمیشہ نرم رہا۔ کھانا کھا کر میں جھوٹا برتن اٹھانے لگا تو انھوں نے مجھے روک دیا اور اپنی بیٹی کو آواز دی:

’’بھیا کے برتن اٹھا کر لے جاؤ۔‘‘

وہ آ کر جھوٹے برتن لے گئی۔ ان کے اس برتاؤ نے میری آنکھیں نم کر دی تھیں۔ اس وقت میں بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ نفرت اور بے عزت کرنے والے ماحول میں اس طرح کے برتاؤ کی کوئی امید نہیں تھی۔

اس سے پہلے بھی چمن لال تیاگی میری پڑھائی لکھائی کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ جب میں تیسری یا چوتھی کلاس میں تھا، پڑھنے کی رفتار ٹھیک تھی۔ ہندی کی کسی بھی کتاب کو تیزی سے پڑھ لیتا تھا۔ چمن لال کا گھر بھنگی بستی سے قریب تھا۔ ایک روز میں ان

کے گھیر کے سامنے سے گذر رہا تھا وہ دالان میں بیٹھے تھے۔رام چرت مانس پڑھ رہے تھے۔دالان کے سامنے سے جاتا ہوا دیکھ کر انھوں نے مجھے آواز دی۔آواز سن کر میں ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔وہ بولے:

''تو چھوٹن کا ہے؟''

میں نے کہا:''جی''

''یہاں آ''انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔

''سُنڑا ہے تو پڑھنے جاتا ہے اسکول میں؟''

میں نے ہاں میں گردن ہلا دی انھوں نے رام چرت مانس کی کتاب میرے ہاتھ میں تھما دی۔

''لے اس پنّے کو پڑھ کے دکھا۔''

وہ چارپائی پر بیٹھے تھے۔میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ایک پورا صفحہ جب پڑھ لیا تو انھوں نے میری پیٹھ تھپتھپائی اور شاباشی دی۔اس کے بعد جب بھی کہیں مل جاتے یا مجھے دیکھ لیتے تو میری پڑھائی لکھائی کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔انھوں نے میرے بابا کو بلا کر بتایا:

''چھوٹن تیرا بیٹا تو رامائن بھی پڑھ لیوے ہے۔''

یہ سن کر بابا بہت خوش ہوئے تھے۔بستی میں آ کر سب کو بتا بتا کر اپنی خوشی ظاہر کر رہے تھے۔میرے ہائی اسکول کر لینے کے بعد بستی کے لوگوں میں پڑھنے کی لکھنے میں دلچسپی بڑھ گئی تھی۔تھوڑا تھوڑا پڑھائی کا ماحول بھی بننے لگا تھا۔غریبی کے باوجود تبدیلی کی علامات نظر آنے لگی تھیں۔میں نے اپنی بیٹھک کے چبوترے پر ایک شام کا اسکول شروع کیا تھا۔شام کو پندرہ بیس بچوں کو لے کر بیٹھتا تھا۔ہر روز ایک ڈیڑھ گھنٹے کی کلاس چلنے لگی۔چند آدمی بڑی عمر کے بھی آ کر بیٹھنے لگے۔بہت سے لوگ دستخط کرنا سیکھ گئے تھے۔اس وقت تک میرے بھتیجے دیویندر اور نریندر بھی اسکول جانے لگے تھے۔نریندر دوسری کلاس میں تھا اور دیویندر پہلی میں۔نریندر کا دل پڑھائی میں کم لگتا تھا پھر بھی میں اسے اٹھنے نہیں دیتا۔کئی بار

وہ رونے بھی لگتا لیکن اس وقت میں سخت اور بے رحم ہو جاتا تھا۔

بابا کسی کام سے مظفر نگر جا رہے تھے میں بھی ان کے ساتھ چل دیا۔ شہر میں سڑک کے کنارے بہت سی کتابیں سجی ہوئی تھیں ان میں سے زیادہ تر مذہبی کتابیں تھیں۔ وہ ان کتابوں کے پاس رک گئے۔ لال جلدوں والی گورکھپور پریس کی کتابوں میں سے انھوں نے ایک اٹھا کر میرے ہاتھ میں دی۔

''کیا ہے اس کتاب میں؟'' انھوں نے خواہش ظاہر کی۔

میں نے کہا:'' گیتا ہے۔''

وہ گیتا کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ جب میں نے بتایا مہابھارت کی لڑائی میں شری کرشن نے ارجن کو جو باتیں سکھائی ہیں وہ سب اس میں ہے۔ انھوں نے اس کتاب کی قیمت پوچھی دکاندار نے ڈیڑھ روپیہ بتائی۔ وہ میری بات سن کر بہت خوش ہوئے اور اس کتاب کو انھوں نے خرید کر مجھے دے دیا۔ گھر واپس آ کر میں نے انھیں پڑھ کر سنائی تو وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ وہ واقعی بہت خوش تھے۔ انھیں لگ رہا تھا کہ ان کا پیدا ہونا کامیاب ہو گیا، 'جاتی' سدھر رہی ہے۔ جیسے جیسے میں اس کتاب کو پڑھ رہا تھا۔ میرے کچے ذہن میں الجھن بڑھ رہی تھی۔ گیتا میں مذہبی عمل کی جو وضاحت کی گئی ہے، اسے پوری طرح سمجھ لینے کی عقل اس وقت مجھ میں نہیں تھی۔ ہاں! اتنا ضرور سمجھ رہا تھا کہ کرشن ارجن کو جنگ کے لیے اکسا رہے ہیں۔ اپنے ہی رشتہ داروں کو مارنے کے لئے ارجن کو سمجھا رہے ہیں۔ عمل کرنے اور پھل کی خواہش نہ کرنے کے فلسفہ کی باریکیوں کو بتا رہے ہیں۔ علم کی اس کتاب کے ہر ایک باب کے بعد خلاصہ کے طور پر ان کی تعریف کے پل باندھے گئے تھے۔ جس میں اس باب کے پڑھنے کے بعد نکلنے والے نتائج اخذ کیے گئے تھے۔ یعنی گیتا جو ہمیں سکھا رہی تھی اس کے بالکل برخلاف خلاصہ تھا۔ لالچ کے لیے پڑھنے والوں، عقیدت مندوں کو اکسایا جا رہا تھا۔ یہ بے چینی میرے اندر ایک نئی فکر پیدا کرنے لگی۔ یعنی مذہبی عمل کو مضبوط کیا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کتاب کو پڑھنے سے اوبنے لگا۔ اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کا جواب چاہتا تھا۔ ایک دو بار اسکول میں اساتذہ سے ایسے سوال پوچھنے

کی جب جب بھی کوشش کی مجھے سزائیں ہی ملیں ، مار کھانی پڑی ،امتحان میں نمبر کم ملے۔
ساتھی ہی نہیں اساتذہ بھی اپنے الفاظ میں خود الجھ جاتے تھے اور کہتے :

''دیکھو چوہڑے کا بامن (برہمن) بن رہا ہے۔''

بستی میں کوئی ایسا نہیں تھا جو میرے ان سوالوں کا جواب دیتا۔شراب پی کر شور شرابا اور مار پیٹ کرنے والوں کی کمی نہیں تھی ۔ایسے ماحول میں فلسفیانہ سوالات کے جواب تلاش کرنا آسمان سے تارے توڑنے کے مناسب تھا۔ویسے بھی بستی ہی میں نہیں پورے والمیکی سماج میں ہندو دیوی دیوتاؤں کی پوجا نہیں ہوا کرتی تھی ۔ پڑھے لکھے لوگوں میں دیکھا دکھی کر لینے کی بات اور ہے۔ یہ لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں جن دیوی دیوتاؤں کے نام نہ تو ویدوں میں ملیں گے نہ مذہب کی دوسروں کتابوں میں ۔ پوجا کرنے کا طریقہ بھی مختلف ہے۔

ایک لمبے عرصہ کے بعد میرے موسا جی آئے تھے۔ان کے آنے پر ماں خوب روئی۔ رونے کے ساتھ شکوہ شکایتیں کرتی جا رہی تھی کیونکہ اتنے برسوں سے بڑی بہن کو نہیں دیکھا تھا۔موسا نے ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا:

''مکندی (میری ماں کا یہی نام تھا) پریشان کیوں ہوتی ہے؟ گھر خاندان کی پریشانیاں تھیں ۔ تیری بہن بیمار رہتی ہے...آنا جانا نہیں ہو پاتا۔''

موسا صاحب مذہبی خیالات کے پڑھے لکھے آدمی تھے۔علم نجوم میں ان کو کافی دلچسپی تھی ۔میرے ادیب بن جانے کا ذکر انھوں نے اس وقت میری ماں سے کیا تھا۔اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ ادیب بننا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔وہ دو تین دن رکے بھی تھے۔ جب جانے لگے تو میں نے 'گیتا' انھیں تحفہ کے طور پر دے دی۔وہ خوش ہو گئے تھے۔ان سے وہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

میں نے گیارہویں میں سائنس لی تھی۔ہائی اسکول پاس کر لینے سے میرے اندر خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔لیکن اسکول کے حالات بالکل مختلف ہوتے جا رہے تھے۔ساتھیوں میں سے چند ہی ایسے لڑکے تھے جو میرے دوست تھے یا میل جول رکھتے تھے۔شرون کمار

اور چندر پال مجھ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ سکھن سنگھ اور رام سنگھ ساتھ تھے۔ اوم دت تیاگی انگریزی پڑھاتے تھے۔ جو بھی بات کہتے طنزیہ لہجے میں کہتے۔ ہر ایک جملہ میں 'یعنی کہ' جوڑ دیتے تھے، وہ بھی سوالیہ نشان کے ساتھ۔ پڑھاتے ہوئے بھی اسی طرح بولتے۔ جب میں ان سے کسی پریشانی پر بات کرتا یا کوئی اپنی پریشانی ان کے سامنے رکھتا سب سے پہلے وہ میرے بھنگی ہونے کا احساس مجھے دلا دیتے۔ اس وقت مجھے لگتا تھا کہ میرے سامنے کوئی استاد نہیں بلکہ ذات پات کی نفرت میں ڈوبا ہوا کوئی جاہل بادشاہ، کھڑا ہے۔ رام سنگھ کلاس کا سب سے اچھا طالب علم تھا۔ کلاس کا ہی نہیں بلکہ پورے اسکول کا ہرفن مولا۔ لیکن تھا تو وہ چمار ہی۔ یہ سوچ طالب علموں سے لے کر اساتذہ تک میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک روز جب ہم دونوں ان باتوں سے بہت تنگ آ گئے تو ہم نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اوم دت تیاگی کا انگریزی میں ایک خاکہ تیار کیا۔ رام سنگھ اور میں نے مل کر یہ خاکہ تیار کیا تھا۔ عنوان تھا 'اے پروفائل آف یعنی کہ' (A Profile of Yani Ke) جب وہ خاکہ مکمل ہو گیا تو اس کو ہم نے پڑھنا شروع کیا سب کا تو ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا تھا۔ اس ہنسی مذاق میں تمام ساتھی شامل تھے۔ پورے کالج میں یہ خاکہ مشہور ہو گیا۔ جسے دیکھو وہی اسے دہرا رہا ہے۔ اس دوران ایک اور حادثہ پیش آیا۔ اوم دت تیاگی کا پیریڈ تھا۔ رام سنگھ اور سکھن سنگھ پہلی لائن کی بیچ والی ڈیسک پر بیٹھے تھے۔ اوم دت نے آتے ہی رام سنگھ سے انگریزی کی کتاب مانگی۔ اس نے اطمینان کے ساتھ وہ کتاب انھیں دے دی۔ اس کتاب میں وہ خاکہ بھی رکھا ہوا تھا۔ رام سنگھ کو اس بات کا دھیان ہی نہیں تھا کہ وہ کاغذ اس میں رکھا ہے۔ یہ سب اتفاقاً ہی ہوا تھا۔ جیسے ہی اوم دت نے کتاب کے صفحہ کو الٹا وہ کاغذ نیچے گر گیا۔ ہم سب نے اس گرتے کاغذ کو دیکھا۔ رام سنگھ کے چہرے کی ہوائیاں اڑ چکی تھیں۔ کاغذ اوم دت نے اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ اسکے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ اس نے کتاب کو میز پر دے مارا اور غصہ میں رام سنگھ کی طرف ایسے گھورا جیسے کچا چبا جائے گا۔ اس میں لکھاوٹ تو رام سنگھ کی ہی تھی اس لئے اوم دت کا سارا غصہ رام سنگھ پر اتر گیا۔ رام سنگھ کو اسٹاف روم میں بلایا گیا۔ اسٹاف روم میں اندر جاتے ہی لات گھونسوں

سے رام سنگھ کا استقبال ہوا۔ پھر مرغا بنایا اور ڈنڈے سے بھی مارا جب تھک گئے تو پرنسپل کے آفس لے گئے اور اس کی شکایت بھی کی۔ وہاں بھی دل بھر کے ذلیل کیا رام سنگھ کو پرنسپل نے دھمکی دے کر چھوڑ دیا۔ اس حادثہ کے بعد اوم دت کو جب بھی موقع ملتا رام سنگھ کو بے عزت کرنے کی کوشش کرتا۔ رام سنگھ کا حوصلہ بھی کمال کا تھا۔ اسٹاف روم میں اس قدر مار کھا کر بھی ہنس رہا تھا۔ اس کے ساتھ پورا کلاس ہنسنے لگا لیکن میں ڈرا ہوا تھا۔ مجھے مار سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ دن ایسے تھے جب میں سہما سہما سا رہتا تھا۔

انھیں دنوں نریندر کمار تیاگی نئے نئے ٹیچر ہو کر آئے تھے۔ ریاضی میں ایم اے (M.A.) کیا تھا۔ دیکھنے میں معصوم اور زبان میٹھی ...جس میں بے حد سادگی تھی۔ وہ گیارہویں اور بارہویں کلاس کو ریاضی پڑھاتے تھے۔ مارچ اپریل 1965ء کے دن تھے۔ وہ کلاس میں تھے، گرمی کے دن شروع ہو چکے تھے، انھیں تیز پیاس لگی۔ ان کے ٹھیک سامنے والی سیٹ پر میں بیٹھا تھا۔ مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''مٹکے سے ایک گلاس پانی لے کر آؤ۔''

پرنسپل آفس کے پاس برآمدے میں ٹھنڈے پانی کے دو بڑے بڑے مٹکے رکھے ہوتے تھے۔ جیسے ہی نریندر تیاگی نے پانی لانے کو کہا کلاس میں پھسپھساہٹ ہونے لگی۔ میں اٹھ کر چل تو دیا لیکن برآمدے سے ہی لوٹ آیا۔ میں نے ان سے کہا:

''ماس ساب میں تو ان مٹکوں کو چھو بھی نہیں سکتا کسی اور کو بھیج دیجیے۔''

ماسٹر صاحب نے حیرانی سے پوچھا: ''کیوں؟''

میں نے آہستہ سے جواب دیا: ''میری جاتی چوہڑا ہے۔''

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ اسے اس طرح اپنی طرف دیکھتے ہوئے میں نے کہا:

''اس کے باوجود بھی اپ کہتے ہیں تو میں لے کر آتا ہوں۔''

وہ جیسے نیند سے جاگا ہو۔ ''نہیں... بیٹھ جاؤ۔''

اور خود ہی پانی پینے چلا گیا۔ مجھے لگا ریاضی میں ماسٹر کی ڈگری لے کر بھی یہ ماسٹر کتنا

چھوٹا ہے۔ جس میں اتنی ہمت نہیں کہ میرے ہاتھ سے پانی پی سکے۔ مجھے اس وقت چندر پال اور شرون کمار کی یاد آ گئی۔ پڑھائی میں تو وہ کمزور تھے پر تھے وہ بہتر انسان، پیارے دوست جن میں 'ذاتی' کا ڈر نہیں تھا۔ چھوا چھوت کے یہ زخم اندر تک چھلنی کر دیتے ہیں۔

برج پال سنگھ ابھی بھی علم کیمیا (کیمسٹری) پڑھاتا تھا۔ اس کے لیے تو میرے اندر کوئی عزت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ میں نے اس کو کبھی بے عزت کیا ہو۔ کیمسٹری پڑھنا مجھے پسند تھا۔ گیارہویں کے سالانہ امتحان میں مجھے بہت اچھے نمبر حاصل ہوئے تھے۔ لیکن بارہویں میں جاتے جاتے اس کے برعکس ہونے لگا۔ جب بھی میں پریکٹیکل (مشق) کے لئے جاتا، برج پال کسی نہ کسی بہانے مجھے باہر کر دیتا یا کسی کام سے کہیں بھیج دیتا۔ انٹر کے امتحان قریب تھے۔ بورڈ کے امتحان تھے۔ مستقبل اسی امتحان کے نتیجہ پر ٹکا تھا۔ کئی مہینے جب میں نے پریکٹیکل نہیں کیا تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ سب میرے ساتھ جان بوجھ کر کیا جا رہا ہے۔ ایک روز مجھے سب کے سامنے ذلیل بھی کیا اور کمرہ سے باہر بھی کر دیا۔ میں نے سوال بھی کیا:

''میری غلطی کیا ہے؟ کوئی نقصان مجھ سے ہوا ہے؟''

میں نے رام سنگھ سے بتایا تو اس نے پرنسپل سے ملنے کی صلاح دی۔ پرنسپل یشویر تیاگی نے میری بات اطمینان سے سنی بھی تھی۔ انتظامی کاموں میں بچوں کے اندر ان کی بہت دہشت تھی۔ انھوں نے مجھے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ میرے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہونے دیں گے۔ برج پال سے بات کر کے اس مشکل کا حل نکال لیں گے۔ لیکن ہوا اس کے بالکل الٹا۔ میں پورے سال پریکٹیکل نہیں کر پایا۔ بورڈ کے اس امتحان میں صرف پریکٹیکل ہی خراب نہیں ہوا بلکہ زبانی امتحان (Viva) میں بھی مجھے کم نمبر ملے تھے۔ جبکہ میں نے تمام سوالوں کے اطمینان بخش جواب دیے تھے۔ جب نتیجہ آیا تو میں بارہویں میں فیل تھا۔ کیمسٹری کے علاوہ سارے موضوعات میں اچھے نمبر ملے تھے۔ صرف پریکٹیکل میں فیل تھا۔ اس واقعہ نے اچانک میرے سامنے بھیانک حالات پیدا کر دیے۔ میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر کروں کیا۔ میں اندھیرے میں کھڑا تھا۔ گھر میں تو

جیسے ماتم چھا گیا ہو۔ سب افسوس کر رہے تھے میں بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ کسی بھی کام میں دل نہیں لگتا۔ وہ دن بہت ہی بے چینی بھرے تھے۔ انھیں دنوں مایا کی شادی طے ہو گئی۔ انتظامات میں ایسے مشغول ہو گیا کہ کچھ دنوں کے لیے ان برے خیالات کو بھول گیا۔ مستقبل باہیں پسارے کھڑا تھا اور میں اپنے بھنگی پن سے باہر آنے کے لئے چھٹپٹا رہا تھا۔ لیکن حالات مجھے بار بار وہیں ڈھکیل رہے تھے۔ برج پال کی چال نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

ان دنوں جسبیر 'سروے آف انڈیا' دہرادون میں نوکری کر رہا تھا، ماما کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ سُرجن کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ میں نے جب جسبیر کے سامنے اپنی کہانی بتائی تو تو وہ بولا:

''چل چھوڑ، مار گولی اس گاؤں کو' دہرادون داخلہ لے کر وہی پڑھنا۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج میں بھرتی کروا دوں گا۔ تو فکر کیوں کرے ہے۔ اس سال نہیں تو اگلے سال پاس ہو ہی جاؤ گے۔''

میری ناامیدی کو جیسے امّید کی کرن مل گئی۔ جسبیر نے اپنے لہجے میں مجھے حوصلہ دیا۔

''لے یہ بی کوئی بات ہوئی. فکر کیوں کرے ہے میں ہوں نا...''

بڑی سے بڑی مشکل کو وہ اس ایک جملہ سے منٹ بھر میں دور کر دیتا تھا۔ وہ خود بھی ناامید نہیں ہوتا تھا۔ بابا نے مجھے دہرادون جانے کی اجازت دے دی۔ جس دن میں نے دہرادون جانے کے لیے گھر چھوڑا، بابا جذباتی ہو گئے تھے اور کہا:

''بیٹے تو ایک غریب چوہڑے کا بیٹا ہے...اسے ہمیشہ یاد رکھیو...''

مایا کو سسرال کے لیے وداع کر کے میں سُرجن کے ساتھ دہرادون آ گیا۔ اس وقت میرے پاس صرف ایک پرانی قمیص اور پٹے کا ایک پائیجامہ۔ بس یہی پونجی تھی میرے پاس۔ کرایے کے علاوہ بابا نے ایک بھی پیسہ نہیں دیا تھا۔ دیتے بھی کہاں سے مایا کی شادی بھی قرض لے کر کی تھی، جس کو اتارنے میں جسبیر کی ساری تنخواہ چلی جاتی تھی۔ مہینے بھر کا گذارا بھی ٹھیک سے نہیں ہوتا تھا۔

دہرادون کے لیے جب میں بس میں سوار ہوا تو میرا دل بہت مغموم تھا۔ لگ رہا تھا

کہ برلا ہمیشہ کے لئے چھوٹ رہا ہے۔لیکن کڑوی یادوں نے میرے دل میں اور زیادہ چبھن پیدا کر دی۔ یہ چبھن ابھی بھی میرے دل کے کسی کونے میں موجود ہے۔ جو موقع ملتے ہی اپنا رنگ دکھا دیتی ہے۔

میرے ماما اندریش نگر میں رہتے تھے۔ سہارن پور چوک کے پاس خدری محلے کے ساتھ ایک گندا نالہ بہتا ہے اسی کے دوسری طرف اندریش نگر بسا ہوا ہے۔اس گھنے محلے کو جٹیا محلہ کہا جاتا تھا۔ بعد میں اس کا نام اندریش نگر پڑا۔

ماما اور جسبیر ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ سُرجن ان دنوں اپنے سسرال میں رہتا تھا، دوپہر کو تھوڑی دیر کے لیے اور شام کو اپنے بابا سے ملنے بلا ناغہ آتا تھا۔ ماما اور جسبیر کے ساتھ تیسرا میں بھی اس کمرہ میں آ گیا۔ کمرہ میں تو سامان برائے نام ہی تھا۔ کمرہ میں ایک رسی بندی ہوئی تھی۔ جس پر گندے کپڑے بے ڈھنگے طریقے سے لٹکے ہوئے۔ سامان ادھر ادھر بے ترتیب رکھا ہوا تھا۔صفائی تو کبھی کبھی ہی ہوتی تھی۔ جسبیر بھی پاس میں ہی رہتا تھا۔اس کا کمرہ جو لکڑی کے پھٹوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا، جس کی چھت ٹن سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس میں بھی وہی حال تھا۔ایک کنارے چولھا تھا۔ چھت سے لے کر کپڑے تک دھنوئیں سے سیاہ ہو گئے تھے۔ وِملا بھابھی کو دہرادون آئے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔اس نے بھی کچھ ٹھکانوں کا کام شروع کر دیا تھا۔وہ بھی صبح ہی نکلتی دوپہر کو واپس آتی تھی۔ جسبیر کے پاس کوئی نوکری نہیں تھی۔ جو بھی کام ملتا وہ کر لیتا۔ اکثر رات پالی میں وہ میلا ڈھونے والی نگر پالیکا کی گاڑی میں کام کرتا تھا۔ سُرجن سنگھ نے ڈی۔اے۔وی انٹر کالج کی گیارہویں کلاس میں داخلہ لے لیا لیکن مجھے ابھی تک داخلہ نہیں ملا تھا۔ انٹر میں فیل ہو جانے کا ٹھپّا میرے ماتھے پر لگ چکا تھا۔ جو بھی سنتا ناک بھوں سکوڑنے لگتا۔ کافی بھاگ دوڑ کے بعد پریم کمار شرما جی کی سفارش سے داخلہ مل گیا۔ سُرجن سنگھ نے پریم پرکاش جی کے سامنے بہت منّتیں کی تھیں۔ وہ ایک بڑے استاد تھے۔'ڈی۔اے۔وی انٹر کالج' میں تیاگی انٹر کالج، برلا کے سرٹیفکیٹ دیکھتے ہی عجیب عجیب سی شکلیں بنانے لگتے۔ داخلہ کی بھاگ دوڑ میں بھی کئی بار نا امیدی سے بھی گذرنا پڑا۔ کئی بار ایسا لگا کہ اب پڑھائی پوری نہیں ہو سکتی۔ فیل ہونے کی وجہ

سے میرا اعتماد ڈگمگانے لگا تھا۔ایسا لگتا کہ جیسے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

سُر جن سنگھ کی بیوی سورن لتا اپنے میکے میں ہی رہتی ۔اکثر میں سُر جن کے ساتھ وہاں جاتا، وہ بہت مانوس اور پیاری تھی ۔اس میں اپنائیت بہت تھی ۔ناامیدی کے لمحوں میں وہ میرا حوصلہ بڑھاتی تھی ۔ جیسے ہی کالج میں داخلہ ہوا میں اپنی پڑھائی میں مشغول ہو گیا۔ اندریش نگر سے ڈی ۔اے ۔وی انٹر کالج کافی دور تھا۔پھر بھی میں صبح سات بجے کی کلاس نہیں چھوڑتا تھا کیونکہ میں اپنی ناامیدی سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔دھیرے دھیرے میں اس اندھی گپھا سے باہر نکلنے لگا تھا۔

اندریش نگر میں زیادہ تر صفائی کرنے والے بھنگی اور جوتے مرمّت کرنے والے جٹیے رہتے تھے ۔بھنگی اپنے آپ کو'والمیکی' کہلوانا پسند کرتے تھے اور جٹیے 'جاٹو'۔رہتے بھی یہ الگ الگ تھے ۔ایک طرف والمیکی دوسری طرف جاٹو۔ان کے محلّے کا راستہ سہارن پور روڈ سے تو ان کے آنے کا راستہ کاوَلی روڈ سے تھا۔غریبی اور لاعلمی دونوں کو وراثت میں ملی تھی ۔چھوٹے چھوٹے دربے نما مکانوں میں تنگ حال زندگی گذار رہے تھے ۔اکّا دکّا لوگ ہی دو وقت کی روٹی ڈھنگ سے کھا پاتے تھے ۔صفائی کا کام کرنے والے صبح پانچ بجے ہی گھروں سے نکل جاتے ۔وہ لوگ جب کام پر جاتے تو لوہے کی گاڑی کو ڈھکیل کر لے جانے کی وجہ سے کھڑ انگ کھڑ انگ کی آواز سے صبح ہی آنکھ کھل جاتی ۔عورت اور مرد دونوں ہی صبح نکلتے ۔گھر میں صرف بوڑھے ، بیمار یا بچے رہ جاتے تھے۔اسکول جانے والے بچے دن بھر گلیوں میں آوارہ گردی کرتے ۔ بہت کم بچے ایسے تھے جن کی دلچسپی پڑھنے میں ہو۔ان کے ماں باپ کے پاس وقت ہی کہاں ہوتا کہ بچوں کو ہاتھ پکڑ کر اسکول چھوڑ آئیں۔صبح پانچ بجے کے نکلے بارہ ایک بجے واپس آتے ، ہاتھ منھ دھو کر عورتیں ٹھکانوں میں روٹیاں لینے چلی جاتیں ۔دو ڈھائی بجے پھر حاضری دینا پڑتی ۔ہوتے ہوتے پانچ بج جاتے تھے ۔بچّے اسکول جاتے ہیں یا نہیں؟ دن بھر وہ کیا کرتے ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ یہ سب جاننے اور سمجھنے کا کسی کے پاس وقت ہی کہاں تھا۔

میں کالج پیدل جاتا ۔اندریش نگر سے ڈی ۔اے ۔وی کالج کافی دور تھا۔دو تین مہینے

بعد جسیر نے ایک سائیکل میرے لئے خریدی۔قسطوں پر اس کی قیمت ادا کی تھی۔سائیکل کے آجانے سے آنے جانے کا کافی وقت بچنے لگا۔ پہلا پیریڈ صبح سات بجے لگتا۔ریاضی کے استاد وقت کے پابند تھے۔صبح کی اس کلاس میں 70-60 طالب علم میں سے صرف 15-20 ہی آتے تھے۔میں کبھی بھی اس کلاس میں غیر حاضر نہیں ہوا۔تیاگی انٹر کالج سے یہاں کا ماحول کچھ مختلف تھا۔ان دنوں میرے پاس کالج جانے لائق کپڑے بھی نہیں تھے۔گاؤں میں تو گندی، بنا پریس کی ہوئی قمیص اور پٹے کا پائجامہ سے ہی کام چل جاتا تھا۔ یہاں سب پینٹ اور قمیص پہنتے۔جسیر کے پاس ایک پرانی پینٹ تھی۔وہ اس نے مجھے دے دی، جو کافی ڈھیلی تھی۔اسے ہی پہن کر میں کالج جاتا۔کلاس کے لڑکوں نے کئی بار ان دیہاتی کپڑوں کا مذاق اڑایا۔میں اس کالج میں نیا تھا اور وہاں کے ماحول سے باخبر بھی نہیں تھا۔اس لیے خاموشی اختیار کر لیتا۔اور ویسے بھی گاؤں کے لوگوں کی طعنہ کشی اور طنزیہ باتیں سن لینے کی پہلے سے ہی عادت تھی۔ برداشت کرنے کا تو اس قدر حوصلہ تھا کہ آج جب بھی سوچتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔کتنا کچھ چھین لیا مجھ سے اس برداشت کرنے لینے کی عادت نے۔

ایک دن انگریزی کی کلاس سے باہر نکلتے ہی دوسرے سیکشن کے ایک لڑکے نے مجھے روک لیا۔اس کے ساتھ تین چار لڑکے اور بھی تھے۔وہ میرا مذاق اڑانے لگے۔ایک نے میری پینٹ کھینچتے ہوئے کہا:

''کس ٹیلر سے سلوائی ہے؟ ہمیں بھی اس کا پتہ دے دو۔''

دوسرے لڑکے زور زور سے ہنسنے لگے۔میں ان سے بچ کر نکلنا چاہتا تھا۔لیکن وہ جانے ہی نہیں دے رہے تھے۔کبھی میری پینٹ پکڑ کر کھینچتے تو کبھی قمیص۔میں نے بے حد التجا کے ساتھ کہا:

''پھٹ جائے گی اسے چھوڑ دو...''

میرے دیہاتی لہجے پر بھی وہ زور زور سے ہنسے۔ایک نے پوچھا:

''کس گاؤں سے پدھارے ہو جی؟''

اس کا طنزیہ انداز مجھے چھلنی کر گیا۔ یہ تماشا کافی دیر تک چلتا رہا۔ میں ان لوگوں کے درمیاں پھنسا ہوا تھا۔ اتفاقاً ایک استاد ادھر سے آ نکلے۔ انھیں دیکھتے ہی سب لوگ بھاگ گئے۔ انھوں نے میرا نام اور کلاس پوچھا تو میں نے بتا دیا:

''جی اوم پرکاش والمیکی، بارہویں، سیکشن جے...''

اس کے بعد میں کلاس میں تو گیا مگر میرا دل اکھڑ چکا تھا۔ کلاس میں کیا پڑھایا جا رہا ہے مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کسی طرح وہ کلاس ختم ہوئی۔ باہر نکلتے ہی میں نے سُرجن کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ وہ اپنی کلاس میں بیٹھا تھا۔ میں نے اس کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اس کے باہر آتے ہی سارا قصہ سنا ڈالا۔ اس کی ہی کلاس کا ایک اور لڑکا بہادر سنگھ تھاپا، راج پور کا رہنے والا تھا۔ سُرجن نے اس کو بھی باہر بلا لیا۔ سرجن نے تمام قصہ اسے سنایا۔ اس نے مجھ سے پوچھا:

''اس لڑکے کو پہچان لوگے؟ کس کلاس میں ہے؟''

میں انھیں ساتھ لے کر اس لڑکے کی کلاس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ لڑکا انھیں دوستوں کے ساتھ کلاس میں سب سے پیچھے بیٹھا تھا۔ بہادر نے مجھ سے کہا:

''تم جاؤ... میں اسے ابھی ٹھیک کر دوں گا آئندہ وہ تمھیں تنگ نہیں کرے گا۔''

میں دور جا کر کھڑا ہو گیا سُرجن اور بہادر وہیں رک گئے۔ کلاس ختم ہوتے ہی وہ لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ باہر نکلا۔ بہادر نے اسے اشارے سے بلایا۔ جیسے ہی وہ پاس آیا بہادر نے دو تین ہاتھ جڑ دیے۔ اچانک ہوئے اس حملے سے وہ گھبرا گیا۔ گڑگڑاتے ہوئے بولا:

''دائی جی... کیوں مار رہے ہو؟ میری غلطی کیا ہے؟''

بہادر نے اس کی قمیص کا کالر پکڑ اپنی طرف کھینچا۔

''بول تیرے کپڑے کہاں سلتے ہیں؟ ننگا کر کے بھیجوں... یا درزی کو یہاں بلاؤں... پھر کسی سے درزی کا پتہ پوچھے گا۔''

اس نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی: ''دائی جی... معاف کر دو... غلطی ہو گئی۔''

دھیرے دھیرے میں نے خود کو اس ماحول میں ڈھال لیا تھا۔ کچھ دوست بھی بن گئے تھے۔اب میں اکیلا نہیں تھا۔ میرا دیہاتی پن اب مجھے کمزور نہیں بنا رہا تھا۔ سُرجن کے بھی دوست مجھے پہچاننے لگے تھے۔ جن میں زیادہ تر مار پیٹ ،غنڈہ گردی کرنے والے لڑکے تھے۔ جو مجھے زیادہ پسند نہیں تھے پھر بھی میل جول رکھنا پڑتا تھا۔ اپنی کلاس میں بھی میری پہچان بننے لگی۔ پُرش اُتم نام کا ایک لڑکا جو میرا اچھا دوست بن گیا۔ اور بھی کئی دوست تھے جن کی دوستی کی وجہ سے میرا شہری زندگی سے ناطہ جڑنے لگا۔ اندریش نگر کے بھی کئی لوگ کالج جاتے تھے۔ بھگّن لال جو ایم۔ ایس۔ سی کر رہا تھا، ہیم لال بارہویں میں تھا ہندو نیشنل میں۔ گوپی اس کے علاوہ اور کئی لوگ تھے۔ ہم سب تقریباً ہر روز ملتے تھے۔ طرح طرح کے منصوبے بنتے۔ سماج کے لئے کام کرنے کا جوش سب میں یکساں تھا۔

اندریش نگر میں ویسے تو ایک ہی محلّہ تھا۔ لیکن اندرونی طور پر دو حصّوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک طرف والمیکی رہتے تھے۔ تو دوسری طرف جاٹو۔ آپس میں دونوں محلّوں کے تعلقات کچھ اچھے نہیں تھے۔ اکثر مار پیٹ ،لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ دو تین گھرانے بھانکو کے بھی تھے جو سکھ تھے۔ ان میں تو آپس ہی میں ہر روز جھگڑے ہوتے تھے کبھی کبھی تو تلواروں تک کی نوبت آجاتی ۔ ایسے لمحوں میں ان کی عورتیں مردوں کو گھروں میں کھینچ کر لے جاتی تھیں۔ خوب شور و غل ہوتا۔ ہیم لال جاٹو تھا۔ ہماری گہری دوستی ہو گئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے۔ اس وقت کے حساب سے میرا یہ قدم کافی خطرناک تھا۔ ماما مجھے کئی بار آگاہ کر چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ جاٹو سُرجن کو مارنے گھر تک آگئے تھے اور تم ان سے دوستی کر رہے ہو۔ لیکن ان سب کے باوجود میرے ہیم لال سے تعلقات ختم نہیں ہوئے۔ اس کے گھر میں جب بھی جاتا اس کی ماں بہنیں بھابھی بہت محبت سے ملتیں۔ اس کی چھوٹی بہن تو بالکل گڑیاں جیسی خوبصورت اور پیاری تھی۔

اندریش نگر میں ایک لائبریری بھی تھی جس کو جاٹو ہی چلاتے تھے۔ یہ لائبریری سرکاری پیسے سے کھولی گئی تھی۔ اس لائبریری میں گاندھی اور ادب پر کتابوں کی بھر مار تھی۔ گاندھی جی کی لکھی ہوئی کتابیں میں نے اسی لائبریری میں پڑھی تھیں۔ ایک دن جب میں

لائبریری میں بیٹھا کتابیں دیکھ رہا تھا، ہیم لال نے ایک چھوٹی سی کتاب میری ہاتھ میں دی جسے میں ابھی الٹ کر دیکھ ہی رہا تھا تو وہ بولا:

''اسے پڑھو، کتاب کا نام تھا: 'ڈاکٹر امبیڈکر، جیون پریچے' (زندگی اور تعارف) مصنف 'چندریکا پرساد جگیا سو'۔''

میرے لئے ڈاکٹر امبیڈکر اس وقت تک ایک انجان نام تھا۔ میں گاندھی، نہرو، پٹیل، راجیندر پرساد، رادھا کرشن، وِویکانند، ٹیگور، شرت، بھگت سنگھ، سبھاش بوس، چندر شیکھر آزاد، ساورکر وغیرہ وغیرہ کے بارے میں جانتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر امبیڈکر سے بالکل ہی انجان تھا۔ 'تیاگی انٹر کالج' برلا میں بارہویں کلاس تک پڑھائی کر کے کسی بھی طرح یہ نام میرے علم میں نہیں آیا تھا اور اس لائبریری میں بھی امبیڈکر پر کوئی کتاب نہیں تھی۔ کسی ماسٹر یا عالم کے منھ سے یہ نام نہیں سنا تھا۔ یوم آزادی پر جو تقریریں ہوتی تھیں، حبُ الوطنی کی کہانیاں دہرائی جاتیں لیکن ہندوستان کے آئین کو بنانے والے کی معلومات نہیں تھی۔ خبر دینے والے تمام طرح سے اس نام کو مجھ جیسے لوگوں تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔ میں نے ہیم لال سے پوچھا:

''کون ہیں یہ امبیڈکر؟'' ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر لہرا گئی تھی۔

''پہلے اس کتاب کو پڑھ لو پھر بات کریں گے۔''

کتاب کو لے کر میں گھر آ گیا۔ شروع کے صفحات میں کچھ ایسا نہیں تھا جسے خاص کہا جا سکے لیکن جیسے جیسے میں اس کتاب کے صفحات پلٹتا گیا مجھے لگا کہ زندگی کا ایک حصہ میرے سامنے آ گیا ہو۔ ایسا باب جس سے میں بالکل ناواقف تھا۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی زندگی کی لڑائی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ کئی دن اور راتین بے چینی میں کٹیں۔ میرے اندر کی جھٹپٹاہٹ اور زیادہ بڑھ گئی۔ جو خاموشی میرے روم روم کو مضبوط بنا رہی تھی وہ اچانک پگھلنے لگی۔ اس لائبریری میں امبیڈکر کی لکھی جو بھی کتابیں تھیں میں نے وہ سب پڑھ ڈالیں۔ میں نے ہیم لال کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے سچ مچ ایک نئی راہ دکھائی تھی۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے میرے اندر غور فکر کا ایک رجحان پیدا ہوا۔ ان کتابوں نے میرے گونگے پن کو الفاظ عطا کیے

تھے۔قانون کے تئیں مخالفت کا جذبہ میرے دل میں انھیں دنوں پختہ ہوا تھا۔کتابوں سے لے کر ابلاغ کے تمام ذرائع سے ان دنوں 'گاندھی' کا ہی ڈھول پیٹا جا رہا تھا۔بات چیت میں اونچی ذات والوں کو غلط الفاظ کہتے سنا تھا کہ اس بوڑھے نے بھنگی چماروں کو ہریجن بنا کر سر پر چڑھا لیا ہے...ان کا غصہ کتنا غلط تھا...امبیڈکر کو پڑھ لینے کے بعد اس بات سے بخوبی واقف ہو گیا تھا کہ گاندھی نے ہریجن کا نام دے کر اچھوتوں کو قانون کے کسی بھی حصہ میں نہیں رکھا۔بلکہ ہندوؤں کو اقلیت ہونے سے بچا لیا تھا،ان کے مفادات کا تحفظ کیا۔پھر بھی وہ اس سے خفا تھے۔کیونکہ اس نے ہریجن کو سر چڑھایا تھا۔پونا پیکٹ(Puna Pact) کے واقعہ نے میرے دل سے گاندھی کے شک کو واضح کر دیا تھا۔پونا پیکٹ نے امبیڈکر کو ناامّید کیا تھا۔ایک نیا لفظ 'دلت' بھی میرے الفاظ کے خزانے میں جڑ گیا۔جو ہریجن کہ بجائے کروڑوں اچھوتوں کے ساتھ ہوئی بدسلوکی کی علامت تھی۔مجھے ایک راہ مل گئی تھی۔ایک فکر اور اس زمانے میں پختہ ہوئی تھی کہ جو تعلیم اسکول اور کالج میں دی جا رہی ہے وہ کسی بھی طرح سے ہمیں آزاد نہیں بناتی ہے بلکہ کٹر ہندو بناتی ہے۔جیسے جیسے ادب سے میرا تعارف ہوتا جا رہا تھا،میں منہ پھٹ ہونے لگا تھا۔کالج میں دوستوں کے ساتھ بحث مباحثہ بھی کرنے لگا۔اساتذہ کے سامنے اپنے شکوک کو ظاہر کرنے لگا تھا۔'یہ ہمّت مجھے ادب نے دی۔'

کالج کے کاموں میں میری شرکت بڑھنے لگی۔ان دنوں 'انگریزی' کی مخالفت بہت زوروں پر تھی۔ڈی۔ایس۔وی کالج کے طالب علم کھل کر مظاہرہ کر رہے تھے۔شہر بھر میں دکانوں کے بورڈوں پر پینٹ کر دیا گیا تھا اور میں ان سب کاموں میں حصہ لے رہا تھا۔جس کی وجہ سے گھر جانے میں دیر ہو جاتی تھی ہر روز ماما کی ڈانٹ کھانی پڑتی۔میں جتنا کام کرتا گھر میں اتنا ہی جھگڑا ہوتا تھا۔گاؤں میں تو میرے بابا نے کبھی کسی بات پر ٹوکا ٹاکی نہیں کی تھی۔پر یہاں آنے کے بعد یہ عام بات ہو گئی تھی۔ڈی۔ایس۔وی کالج سے ایک بڑا جلوس نکلا تھا۔پولس نے گھنٹہ گھر سے پہلے بس اڈّے پر ہی جلوس کو روک دیا۔لڑائی جھگڑے کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔حالات ایسے بگڑے کہ پولس نے ہندی کا ساتھ دینے والوں پر گولی چلا دی۔اس میں ایک طالب علم کی موت بھی ہو گئی،کئی زخمی بھی ہوئے۔طالب علموں

میں ایک جنون تھا جو اس حادثہ کے بعد بکھر گیا تھا۔ اس دن ماما نے گھر سے باہر نہ جانے کی ہدایت کی تھی پھر بھی میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو کئی گھنٹے تک ماما کی تقریر سننی پڑی۔

''تمہیں کچھ ہو گیا تو میں اپنے جیجا اور بہن کو کیا جواب دوں گا؟''

یہ ایک ایسا جملہ تھا جو ہر دو منٹ بعد نکلتا تھا۔ ایسے وقت میں جسبیر خاموش ہو جاتا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی تقریر میں میرے دوستوں کو بھی سنایا کرتے۔ جب میں جسبیر سے کہتا تو اس کا ایک ہی جواب ہوتا:

''تو یہاں پڑھنے آیا ہے... ایسے فالتو کے کام چھوڑ دے۔''

میں جو بھی کر رہا تھا مجھے وہ سب بھی پڑھائی کا ہی حصّہ لگتے تھے۔ لیکن ماما اور جسبیر کے لئے وہ سب بے کار تھا۔ ایک دن دھماکا ہو ہی گیا۔ ہیم لال اور میں ایک ساتھ تھے۔ پورا دن اس روز پڑھائی کے علاوہ کوئی بات نہیں کی تھی۔ گھر آنے پر ماما کی تقریر شروع ہو گئی۔ میں نے انھیں بتا دیا تھا لیکن وہ اپنی ہی رو میں مجھے ڈانٹتے ہی رہے اور ساتھ ہی میرے دوستوں کے بارے میں بھی غلط باتیں کہنے لگے۔ میں بھی اس دن پھٹ پڑا۔

''ماما میرے سبھی دوست پڑھنے لکھنے والے لڑکے ہیں۔ میں غنڈے بدمعاشوں کے ساتھ نہیں گھومتا ہوں۔ پڑھائی لکھائی کے علاوہ میں کوئی اور کام نہیں کرتا ہوں۔''

پتا نہیں ماما جی کی کون سی دکھتی رگ کو میں نے چھو لیا تھا کہ وہ چڑھ گئے اور مجھے واپس جانے کی دھمکی دینے لگے۔ مجھے لگا اس بار پھر سے میری پڑھائی چھوٹ جائے گی میں تو اسی کوشش میں لگا رہا کہ پڑھائی جاری رکھوں، چاہے جیسے بھی ہو۔ لیکن ماما کو میرے خلاف کچھ نہ کچھ بولنے کا ہر روز کوئی نہ کوئی موقع مل ہی جاتا۔ ہمارے اندر من مٹاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک ہی کمرہ میں رہتے، ایک ہی ساتھ کھاتے اور سوتے بھی تھے، میری کوشش تو ہمیشہ یہی رہتی کہ انھیں ناراض نہ کروں۔ ان کے حقّے کی چلم بھرتا، ان کے پاؤں دباتا، سر میں مالش کرتا۔ یعنی تمام کام کر کے بھی انھیں خوش نہیں کر پا رہا تھا۔ ہمارے اس تناؤ میں سُرجن بھی شامل ہو گیا۔ وہ بھی اپنے باپ کی ہاں میں ہاں ملاتا تھا۔ بلکہ کئی بار تو میری چھوٹی چھوٹی باتوں کو

بڑھا چڑھا کر بتاتا۔ اس کا اثر یہ ہوتا کہ ماما کی تقریر قہر بن کر میرے اوپر برستی تھی۔ ان دنوں مَیں کافی الجھن میں رہنے لگا۔ چڑچڑا سا ہو گیا تھا۔ اسی دوران میرا ٹسر جن کے سسرال بھی جانا بند ہو گیا۔ بس ایک ہیم لال ہی تھا جس کے ساتھ بیٹھ کر میں اپنے سکھ دکھ کہہ دیتا تھا۔

اندریش نگر کے ایک ساتھی طالب علمی کے زمانے میں نیتا تھے۔ وہ پڑھائی چھوڑ کر روڑکی چلے گئے۔ وہ مزدوروں کے لئے کوئی تنظیم چلا رہے تھے۔ 1967ء کے عام الیکشن میں انھوں نے روڑکی اسمبلی سیٹ پر پرچۂ نامزدگی بھرا تھا۔ آٹھ دس لڑکے اندریش نگر سے روڑکی گئے تھے الیکشن مہم میں مدد کرنے۔ ان میں ہیم لال اور میں بھی تھا۔ ماما سے میں نے اجازت نہیں لی۔ جسبیر کو صرف خبر کر دی تھی۔ جس وقت میں گھر سے نکل رہا تھا، ماما نے جسبیر سے کہا:

''اس سے کہہ دے لوٹ کر یہاں نہ آئے، گاؤں چلا جائے۔''

میں نے اس وقت ان سے کچھ نہیں کہا۔ باہر بھکّن لال، ہیم لال اور دوسرے دوست کھڑے تھے۔ میں چپ چاپ ان کے ساتھ چل دیا۔ روڑکی جاتے ہی میں نے بابا کے نام ایک خط لکھا۔ روڑکی سے برلا جانے والی بس کے ڈرائیور کو دے دیا۔ ڈرائیور نے وہ خط برلا بس اڈّے پر بودھو چائے والے کو دیا اور چائے والے نے بابا کو یہ خط بھیج دیا۔ بابا خط پڑھ کر اگلے ہی دن روڑکی آ گئے۔ میں نے انھیں تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ میں اندر سے سہا ہوا تھا کہ کہیں میرا روڑکی الیکشن مہم میں آنا انھیں بھی غلط نہ لگے لیکن انھوں نے صرف اتنا ہی کہا:

''تیری سمجھ میں جو ٹھیک لگے تو کر میں تو ان پڑھ گنوار ہوں پر میرا نام بدنام نہ کرنا۔ رہی اگے پڑھنے کی بات تو یہاں سے سیدّھا دہرے (دہرادون) ہی جاڑا ہر پھول (میرے ماما) تے کہڑا۔ اسے اس ٹیم برلا میں پناہ دی تھی۔ جب وہ کچھ بھی نہ جاڑے تھا بعد میں اس کے لونڈے کو دو سال رکھا اسے بھول گیا... وہ اپنے ساتھ نہیں رکھے گا تو میں تیرا انتجام کر دونگا۔ تو پھکر کیوں کرے ہے؟''

بابا اسی وقت دہرادون چلے گئے۔ میں ان کی عادت کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ماما نے انھیں شراب پلائی ہوگی شراب پی کر ماما کو خوب لتاڑا ہوگا۔ خوب کہا سنی ہوئی ہوگی۔

الیکشن مہم کے دوران ہم لوگ روڑکی کے گاؤں محلوں میں پیدل گھومتے۔ اس وقت لوگوں کی زندگی کو اور بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ان کے دکھ درد سنتے تھے۔ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی، جو جمہوریت کا صحیح مطلب بھی نہیں جانتے تھے۔ ایک کاغذ کے ٹکڑے کو بکسے میں ڈال کر وہ کیا کرتے یہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ کس قدر معصوم تھے وہ لوگ جو آزادی کی اہمیت اور اس کے مطلب سے ہی بے خبر تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آزادی وہاں تک گئی ہی نہیں تھی۔ سیاسی دلال ان کا غلط استعمال کر رہے تھے۔

دہرادون واپس آتے ہی ماما اور بابا کے درمیاں ہوئی کہا سنی کی خبر جنیسر نے مجھے دی۔ ماما کا غصہ میرے لیے اور بڑھ گیا۔ انھیں یہ لگا کہ بابا کو بھڑکا کر میں نے یہاں بھیجا ہے لیکن میں چپ چاپ اپنی پڑھائی میں لگ گیا۔ وہ دن بہت ہی تنگی بھرے تھے۔ جیب میں کوئی پیسہ نہیں تھا۔ صبح اٹھ کر بنا کچھ کھائے پیئے کالج چلا جاتا۔ دوپہر کو آتا تو چولھے میں لکڑی جلا کر کچّا پکّا کچھ نہ کچھ پکا لیتا۔ جسبیر دوپہر میں کبھی کبھی ہی آتا تھا، وملا بھابھی میکے گئی ہوئی تھی۔ ماما دوپہر کو اپنے ٹھکانوں سے روٹیاں لے کر آتے لیکن ان روٹیوں کو کھانے کا میرا بالکل بھی دل نہیں کرتا تھا۔ اس کھانے کو دیکھ کر میری بھوک ہی مرجاتی۔ بس کسی طرح دن گذر رہے تھے۔ شام کو جنیسر کے ساتھ لکڑی کی ٹال (پٹیل نگر) چلا جاتا جہاں ٹرک میں لکڑی چڑھانے اتارنے کی مزدوری ملتی تھی۔ ایک دو گھنٹہ کام کرنے سے پانچ روپے ہاتھ میں آجاتے، جیب خرچ نکل آتا۔ کام تو مشکل اور تھکا دینے والا تھا۔ جنیسر کی تو عادت تھی لیکن مشکل میرے لئے تھی کیونکہ مجھے اس طرح کے کام کرنے کی عادت نہیں تھی۔ جیب میں دو چار روپے رہتے تو کالج میں مہیشوری کی چائے کی دکان میں بند (پاؤ) اور چائے سے ناشتہ کر لیتا۔ اس وقت دونوں چیزیں پانچ پیسے میں مل جاتی تھیں، جیسے ہی پیسے ختم ہوئے، چائے، ناشتہ بند، پیٹ پھر خالی۔ پھر کچھ دن بچّوں کو ٹیوشن بھی پڑھایا۔ اندریش نگر میں شام کا اسکول بھی ہم لوگوں نے شروع کیا تھا یہ منصوبہ بھگّن لال کا تھا جیسے ہی اس کی نوکری آئی۔ آر۔ ڈی۔ ای

(Instruments Research and Development Establishment)

میں لگی، اسکول بھی بند ہو گیا۔

جسبیر 'سروے آف انڈیا' میں نوکری کرتا تھا اس کی تنخواہ میں سے آدھے سے زیاد تو قرض میں چلے جاتے۔ مایا کی شادی کے لئے جو قرض لیا تھا اس کا سود بہت زیادہ تھا۔ اس لیے ہاتھ میں بہت کم ہی رقم بچ پاتی تھی۔

دہرادون کی پہلی ٹھنڈ میرے لئے بہت مشکلوں بھری تھی۔ میرے پاس پہننے کو کوئی گرم کپڑا نہیں تھا۔ گاؤں میں تو چادر میں سکڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔ یہاں یہ سب ممکن ہی نہیں تھا۔ یہاں سویٹر کی سخت ضرورت تھی دہرادون نگر پالیکا میں صفائی کا کام کرنے والوں کو خاکی رنگ کی سویٹر ملتی تھی۔ ساتھ میں گاڑھے کھدّر کی ایک موٹی قمیص بھی۔ یہ کپڑے صفائی کرنے والوں کی پہچان تھے۔ دور ہی سے معلوم ہو جاتا کہ یہ لوگ کام کرنے والے جمادار ہیں۔ میں نے لکڑی کی ٹال سے تیس چالیس روپے جمع کر لیے۔ ان روپیوں میں سے ایک صفائی والے سے وہ خاکی جرسی خرید لی اور اس کو ہرے رنگ کا رنگوا لیا۔ رنگ بدل جانے سے بھی اس جرسی کی پہچان نہیں بدلی۔ پہلے دن جب میں اسے پہن کر گیا تو لڑکے جمادار کہہ کر چڑھانے لگے یہ سویٹر مجھے سردی سے تو بچا رہا تھا مگر ان لڑکوں کی طنزیہ باتیں اس سردی سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھیں۔ کئی بار سوچا نہ پہنوں آخر ارادہ پکّا اور مضبوط ہو گیا کہ دیکھتا ہوں کب تک چڑھاتے ہیں۔ سویٹر خریدنے کے بعد بھی میرے پاس کچھ پیسے بچے تھے جن سے میں نے تبّتی بازار سے موٹی اون سستے داموں میں خرید لی۔ سورن لتا بھابھی نے خود اپنے ہاتھوں سے سویٹر بُن کر دیا۔ اس طرح دہرادون کی پہلی سردی سے بچ گیا۔

ایک روز کالج میں کچھ لڑکے کسی ٹریننگ کی بات کر رہے تھے۔ پرِش اتّم بھی ان ہی لوگوں کے ساتھ تھا میں بھی ان کے پاس جا کر ساتھ بیٹھ گیا لیکن ان کی بات کے کسی بھی سرے کو سمجھ نہیں پایا۔ تمام لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں نے پرِش اتّم سے پوچھا تو اس نے کہا:

''رائے پور میں کوئی بم فیکٹری ہے جہاں مشینی پرزوں کا کام سکھایا جاتا ہے۔
اس ٹریننگ میں ہائی اسکول پاس لڑکے لیے جاتے ہیں۔''

میں نے کہا: ''چلو رائے پور چل کر پتا کرتے ہیں۔''

اس نے پوچھا: ''تم جانتے ہو فیکٹری کہاں ہے؟''

''ہاں، سُرجن کے ساتھ ایک دو بار رائے پور گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

میں اور پرش اتّم رائے پور کی طرف چل پڑے آئی۔آر۔ڈی۔ای کے بڑے دروازے پر ہم نے گارڈ سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ آرڈیننس فیکٹری آگے ہے۔فیکٹری کے دروازے پر جاکر ہم نے معلوم کیا تو انھوں نے ہمیں انتظار کرنے کو کہا۔دس منٹ بعد ایک آدمی دروازے پر آیا اور بولا:

''ٹریننگ کے بارے میں کون پوچھ رہا تھا؟''

میں نے کہا: ''میں پوچھ رہا تھا''

اس آدمی نے کہا:

''اگلا بیچ (Batch) جولائی میں لیا جائے گا آپ لوگ ایک خط بھیج دو... مینیجر کے نام، فارم گھر کے پتہ پر پہنچ جائے گا۔''

ہم نے اسی وقت لوٹتے ہوئے رائے پور آرڈیننس فیکٹری کے ڈاک گھر سے ایک ایک پوسٹ کارڈ خریدا، وہیں لکھ کر ڈاک پیٹی میں ڈال دیا۔پندرہ بیس دن بعد فارم گھر پر آگیا۔میں نے موشی سے فارم بھر کر بھیج دیا۔کچھ دن بعد تحریری امتحان ہوا جس میں میرا انتخاب ہوگیا۔انٹرویو میں بھی پاس ہوگیا۔

اس طرح میری پڑھائی درمیان میں ہی چھوٹ گئی۔اپرینٹس بن کر' آرڈیننس فیکٹری'، دہرادون میں میں داخل ہوگیا۔وہاں جانے سے پہلے مجھے کام کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا، ہاں! اتنا ضرور تھا کہ میرا گھرانہ جو ہزاروں سالوں سے میرے آباواجداد جو کام کر رہے تھے وہ مجھے اب نہیں کرنا ہے۔گھر ایک خط روانہ کیا کہ میں نے پڑھائی چھوڑ دی ہے اور ایک سرکاری کارخانے میں پرزوں کا تکنیکی کام سیکھ رہا ہوں انھیں اس بات سے بہت خوشی ہوئی اور بابا، بار بار ایک ہی بات کہہ رہے تھے:

''جات سے تو پیچھا چھوٹا۔''

لیکن وہ اس بات سے لاعلم تھے کہ ذات سے چھٹکارا صرف موت سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔عمر کے آخری پڑاؤ تک وہ اس بات سے بے خبر رہے۔

میں اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانے کا خواب دیکھنے لگا۔بے انتہا غریبی میں گذارے ہوئے دن میں کیسے بھول سکتا ہوں؟ تکنیکی تعلیم حاصل کر کے زندگی گذرنے کے لئے دو وقت کی روٹی کمانے کا راستہ کھلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ٹریننگ کے دوران ہی ایک سو سات روپے ہر مہینہ وظیفہ مقرر تھا جو ان دنوں میرے لئے بہت بڑی رقم تھی۔جیسے ہی وظیفہ ملتا ساری رقم جسبیر کے ہاتھوں میں تھما دیتا، وہ اس میں سے بیس روپے جیب خرچ کے لیے مجھے دیتا۔

صبح سات بجے ہی گھر سے نکل جاتا شام کو ساڑھے پانچ بجے تک واپس آتا۔ان دنوں میں سائیکل سے ہی فیکٹری جایا کرتا۔ناشتہ ہی میں جسبیر دو تین پراٹھے دوپہر کے کھانے کے لیے بنا دیتا اور میرے بیگ میں رکھ دیتا تھا، جنھیں میں دوپہر میں کھالیتا۔جسبیر میرے لیے پراٹھے بنانے کے بعد ماما کے کام میں ہاتھ بٹانے نکل جاتا۔ان کی ڈیوٹی اسٹیشن کے سامنے گاندھی روڈ پر تھی، جہاں ہوٹل کے علاوہ ایک تانگے کا اسٹینڈ بھی تھا، وہاں سے ان کو تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی۔ماما کا کام کر کے جسبیر اپنے دفتر آجاتا، ہر روز یہی کام تھا۔ماما اور جسبیر کو جو چیز جوڑے رکھتی وہ تھی شراب۔شام کو دونوں ساتھ مل کر خوب پیتے۔آگے چل کر یہی شراب جسبیر کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوئی اور اسی وجہ سے اس کی موت بھی ہوئی تھی۔

ایک دن جب میں فیکٹری جا رہا تھا۔درشن چوراہے پر کملا مل گئی، کملا ،گروَر کی لڑکی جو ان دنوں آئی۔ٹی۔آئی میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ ،گروَر کے ہی مکان میں ہم کرایہ دے کر رہتے تھے۔اس لڑکی نے مجھے دیکھ کر رکنے کا اشارہ کیا۔اسے آئی۔ٹی۔آئی جانے میں دیر ہو رہی تھی، وہ میرے راستہ میں پڑتا تھا۔وہ میرے سائیکل کے کیریئر پر بیٹھ گئی۔میں نے اسے سروے چوک پر اتار دیا۔شام کو جب میں واپس آیا تو ماما نے میرے خلاف پہلے ہی سے مورچابندی کر رکھی تھی۔پتا نہیں ماما نے کیسے دیکھ لیا، ہو سکتا ہے انھیں کسی نے بتایا ہو۔کملا

کا میری سائیکل پر بیٹھنا ان کی نظر میں بہت بڑا جرم ہوگیا تھا جبکہ یہ ایک اتفاق تھا۔ جسبیر نے بھی مجھے بہت ڈانٹا۔ میں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن دونوں میں سے کسی ایک نے بھی میری بات نہیں سنی۔ دونوں نے مل کر ایسا ہنگامہ کیا کہ میں ہی چپ ہوگیا۔ مجھ پر جو الزامات لگائے جا رہے تھے وہ سراسر بے بنیاد تھے، جو میرے دل میں تھا ہی نہیں وہ مجھ پر چسپا کیا جا رہا تھا۔ ایک عام بات کو اس قدر طول دے دیا گیا کہ میرے دل کا چین سکون ختم ہوگیا۔ گھر سے بھاگ جانے کو دل کر رہا تھا۔ وہ رات بہت تکلیف سے گزری، گرو رکا کنبہ اور ہم ایک ہی آنگن میں رہتے تھے۔ ہر گھڑی کا ساتھ تھا۔ اگر کملا کو میں نے اپنی سائیکل پر بیٹھا بھی لیا تو ایسا کون سا گناہ ہوگیا جو مجھے اس طرح ذلیل کیا گیا؟

میں ان جھگڑوں سے فرار ہونے کے لئے بے چین تھا۔ ایسے موقع کی تلاش میں جو مجھے اس زندگی سے آزاد کردے، ان دنوں سب سے گہری دوست میری یہی کتابیں تھیں، جو مجھے حوصلہ دیتی تھیں۔ فیکٹری سے واپس آکر دو تین گھروں میں ٹیوشن پڑھانے جایا کرتا۔ خود کو اس قدر مصروف کرلیا کہ ماما سے زیادہ واسطہ ہی نہ رہے۔ وہی دن تھے جب میں نے انگریزی اور بنگلا سے ترجمہ کیے ہوئے بہت سے ناول پڑھے۔ امبیڈکر کی کتابیں بڑی مشکل سے ملتی تھیں۔

دشہرے کی چھٹی تھی، چھاؤنی علاقے میں ایک سرکٹ ہاؤس تھا، جہاں پھول سنگھ باورچی تھا۔ سُرجن اکثر وہاں جاتا اور اس کے سسرال والوں سے پھول سنگھ کی جان پہچان تھی، بلکہ کوئی رشتہ داری تھی۔ دشہرے کے دن ہم وہاں گئے... بالکل صبح صبح... سرکٹ ہاؤس کے سامنے ایک بڑا میدان بھی تھا، جہاں چھاؤنی کے تمام پروگرام ہوا کرتے تھے۔ وہیں پر ہیلی کاپٹر اترنے کی بھی پٹی بنی ہوئی تھی، جب بھی کوئی بڑی مشہور شخصیت دہرادون آتی تو اسی پٹی پر ہیلی کاپٹر کو اتارا جاتا۔ دشہرے کے دن اس میدان میں خوب ہلچل رہتی۔ میں اور سُرجن بھی اس رونق کو دیکھنے گئے۔ اس میدان میں ہزاروں کی بھیڑ تھی، اسی بھیڑ کے درمیان ایک چھوٹا سا گڈھا تھا، جس کے ایک طرف بڑی سی مضبوط بلّی کے ساتھ خوب موٹا تگڑا بھینسا بندھا ہوا تھا۔ اسی کے پاس سپاہیوں کی ایک ٹولی کھڑی تھی۔ ایک طرف ٹینٹ لگا

ہوا تھا، کرسیوں پر کچھ خاص مہمان اور ان کے گھر والے بیٹھے تھے تو ایک طرف بینڈ بج رہا تھا۔ سارا ماحول جشن اور خوشی سے بھرا ہوا تھا۔ اسی دوران بھیڑ کو چیرتا ہوا ایک طاقتور آدمی میدان میں آیا۔ اس کے جسم پر کپڑے کے نام پر لال رنگ کا ایک جانگھیہ، سر پر پگڑی، گلے میں گیندے کے پھولوں کی مالا، ماتھے پر لال ٹیکا۔ اس کے کسرتی بدن سے لگ رہا تھا جیسے کہ وہ پہلوان ہو۔ اس کے ہاتھوں میں کھکھری (گڑاسا) تھا، وہ آکر بھینسے کے پاس رُک گیا، اس کے پیچھے برہمن پجاری ہاتھ میں تھال لیے ہوا تھا۔ اس پجاری نے بھینسے کے اوپر سندور چاول، ہلدی کو پھینکا اور اس کے سینگوں پر بھی ہلدی لگائی۔ اس دوران وہ پجاری تیز آواز میں سنسکرت کے شلوک پڑھتا رہا۔ جیسے ہی پوجا ختم ہوئی۔ افسر نے فوجی دستے کو 'اٹینشن' (Attention) کا حکم دیا، اس کے دوسرے حکم دینے پر ہوائی فائرنگ ہونے لگی اور ساتھ ہی اس طاقتور آدمی نے کھکھری کو دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور پلک جھپکتے ہی بھینسے کی گردن پر وار کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھینسے کا جسم اور سر الگ ہو گئے، اس کے جسم سے خون کے لال لال فوارے پھوٹ پڑے سارا خون گڈھے میں جمع ہو گیا۔ جیسے ہی اس کی گردن کٹی چاروں طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ ناچنے گانے لگے، زور زور سے چلّانے لگے۔ ایک طرف مرغوں اور بکروں کی قربانی دی جا رہی تھی۔ کل ملا کر یہ ایک ڈراؤنہ ماحول تھا، جیسے قتل وغارت گری کا میلہ لگا ہو۔ میں نے سُرجن سے واپس چلنے کے لئے کہا۔ مجھے عجیب سی گھٹن ہو رہی تھی۔ میرے لیے وہاں کھڑا رہنا بھی مشکل ہو گیا۔ بڑی پوجا کے نام پر جانوروں کو مارے جانے نے مجھے بے چین سا کر دیا۔ میری ہی آنکھوں کے سامنے بھینسے کا سر بلّی سے لٹکا ہوا تھا ایک طرف بھینسے کا جسم اور سر پڑا تھا۔ دہرادون اور اس کے آس پاس جانوروں کی قربانی عام بات تھی۔ دہرادون ہی نہیں گڑوال میں بھی ایک دیوی کھرادونی کے مندر میں ہر سال بھینسوں کو قربان کرنے کی رسم تھی، یہ مندر پوڑی، ضلع کانڈا میں ہے۔ دیوالی کے دوسرے ہی دن جانوروں کو ذبح کیا جاتا۔ گڑوال کماؤ سرحد کے پاس بوروں کھال (گڑھوال) و مالدے (الموڑا۔ کماؤ) کارپوریشنز کے زیر اہتمام منعقد کیے جانے والے کالنکا میلے میں تقریباً ڈھائی تین ہزار جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے۔

مذہبی عقیدت کے نام پر اور اپنی منتیں پوری کرنے کی خواہش میں اس میلے میں ضلع انتظامیہ کی طرف سے ضلع افسر، ودھایک، پی آر او اور بڑے افسران آتے ہیں۔ان کی موجودگی میں بھینسوں، بھیڑوں کی قربانی دی جاتی ہے۔کالنکا کا یہ مشہور 500 سال پرانا جانوروں کی قربانی دینے والا میلہ، ہر تیسرے سال منعقد ہوتا ہے۔ میلے میں شراب کی خرید فروخت دھڑلے سے ہوتی ہے۔میرٹھ کا مشہور نوچندی میلہ اور تامل ناڈو کا کاماکھی میلہ کی طرح اہم اس بڑے میلے میں صوبائی حفاظتی دستہ رضا کار، ہوم گارڈ و محکمۂ مال گذاری کے ملازمین ماحول کو پرسکون بنائے رکھنے کے لئے تعینات کیے جاتے ہیں۔

قدیم کالنکا میلہ گڑھوال کماؤں کی تہذیبی ہم آہنگی کا بے مثال نمونہ مانا جاتا ہے۔اس میلے میں عورتیں رسمی زیورات اور کپڑوں سے سجی دھج کر شرکت کرتیں ہیں، وہیں مرد ہاتھوں میں گڑاسے اٹھائے لوک دھنوں پر ناچتے گاتے چلتے ہیں۔ یہ میلہ اس علاقہ کی تہذیب اور شائستگی کی مثال ہے، جو کاندا، مونڈنیشور، بکھالا وغیرہ جانوروں کی قربانی والے میلوں کی ہی ایک کڑی ہے۔

موجودہ ماحول میں مذہب کے نام پر ہونے والے کام مذہب کے متعلق صحیح معنی کیسے پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ بات میرے لیے ہمیشہ حیرانی کی وجہ رہی ہے۔وہ بھی اترا کھنڈ کی زمین پر، حقیقت میں جانوروں کی قربانی میرے لیے انسانیت کے خلاف ظلم کی علامت ہے۔

آرڈیننس فیکٹری میں ایک سال کی ٹریننگ کے بعد ایک امتحان ہوا، جس میں میرا انتخاب ہوگیا۔اعلیٰ ٹریننگ کے لئے جبل پور جانا تھا، جہاں آرڈیننس فیکٹری محکمہ خمریا جبل پور میں دو سال کی ٹریننگ اور ہونی تھی۔اس امتحان نے میرے لئے ترقی کے نئے دروازے کھول دیے۔جبل پور جانے سے پہلے میں گاؤں چلا گیا تاکہ ماں بابا سے مل سکوں۔اس وقت بابا بہت خوش ہوئے اور کہا:

''جتنا دور جاؤ گے اتنی زیادہ دنیا دیکھو گے۔''

لیکن ماں بہت فکرمند تھی۔اس نے تو جبل پور کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ بار بار معلوم کر رہی تھی۔

''یہاں سے کتنے کوس ہے۔''

ماں نے تو دلّی بھی نہیں دیکھی تھی، صرف نام ہی سنا تھا۔ ماں کو تو اس بات کی فکر تھی کہ کہاں رہے گا؟ کیا کھائے گا؟ وہاں کے لوگوں کی بولی کیسی ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ میں نے جب ان کو بتایا کہ ہاسٹل میں رہوں گا اور میس (Mess) میں کھانا ملے گا وہ بھی سرکاری خرچ پر، تو وہ مطمئن ہوگئی۔ دو تین کلو گڑ کپڑے میں باندھ کر دیا تھا۔

بابا نے میرا حوصلہ بڑھایا تھا، جبل پور تو ان سب کے لیے پردیس تھا، دہرادون واپس آکر میں نے جبل پور کی تیاری شروع کر دی۔ میرے ساتھ جانے والوں میں وجے بہادر سول بھی تھا جو پنجاب کے ہوشیار پور ضلع کا رہنے والا تھا۔ ہریانہ کبیر پور گاؤں میں ان کی کھیتی باڑی تھی، وہ پنجابی جٹ تھا۔ ٹریننگ کے دوران ہی ہماری دوستی ہوئی تھی۔ وہ پنجابی بولا کرتا اگر کبھی ہندی میں بات کرتا تو بہت اٹکتا تھا۔

جبل پور جانے کے لیے جب ہم اسٹیشن پہنچے تو دیکھا ٹریننگ والے لڑکوں کی بھیڑ تھی، اس بھیڑ میں جسبیر، جنیسر، وملا، سُرجن، رہتی بھابھی جو گاؤں سے دو دن کے لیے آئی تھی۔ سورن لتا بھابھی اور ان کی چھوٹی بہن چندر کلا، جس کو سب چندر کہہ کر بلاتے تھے، یہ سب لوگ مجھے وداع کرنے آئے تھے۔ وداعی کے لمحے بہت مشکل بھرے تھے۔ تمام کمی کے باوجود کوئی خوبصورت دھاگا ایسا بھی تھا جو ہمیں ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے تھا۔ ایک نئی اور انجان دنیا کی طرف ہماری گاڑی چل پڑی۔ جانا پہچانا سب پیچھے چھوٹ گیا۔ رہ گئی تھیں صرف یادیں، جیسے جیسے گاڑی کی رفتار بڑھ رہی تھی، جدائی کا غم بھی چھٹنے لگا۔ گل بھوشن نیّر کی چہل بازی شروع ہونے لگی تھی۔ اس کا انتخاب بھی جبل پور کے لئے ہوا تھا۔

1 / جولائی 1968ء کی شام کو پانچ چھ بجے کے درمیاں ہم ٹرین سے جبل پور اسٹیشن پر اترے۔ آرڈیننس فیکٹری ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے سینئر طلبا ہمیں بہت ہی اپنائیت سے ہاسٹل لے کر آئے۔ ان کے مل جانے سے ہم نے راحت کی سانس لی تھی۔ کمروں کا تعین پہلے ہی ہو چکا تھی، مجھے ہاسٹل نمبر '1' کے کمرہ نمبر '3' میں جگہ ملی تھی۔

انسٹی ٹیوٹ کے ہاسٹل میں آکر میری پہچان ایک نئی دنیا سے ہوئی، بہت کچھ ایسا تھا جو

میرے لیے عجوبہ تھا۔ رہنے، کھانے کی فکر ہی نہیں تھی، ان دنوں تقریباً دو سو طالب علم ہاسٹل میں تھے۔ خوب چہل پہل رہتی۔ ہاسٹل کی شامیں رونق بھری ہوتی تھی۔ شام ہوتے ہی چڑیوں کی چہچہاہٹ، پیڑوں کے جھرمٹ سے گونجنے لگتی۔ گانا بجانا، کھیل کود، ہنسی مذاق طرح طرح کے کاموں سے ہاسٹل کھل اٹھتا تھا۔ ہاسٹل بالکل سن سان علاقہ میں تھا۔ جس کے ایک طرف آرڈیننس فیکٹری خمریا تھی تو دوسری طرف گیرسن انجینئر کا آفس۔ بڑا راستہ اور ہاسٹل کے درمیان انسٹی ٹیوٹ کی مرکزی بلڈنگ تھی اور اوڈیٹوریم وغیرہ بھی۔ رہائشی علاقہ کافی دوری پر تھا۔ ہاسٹل کے پیچھے ایک بڑا سا نالہ بہتا تھا، جو ہاسٹل اور رہائشی علاقہ کو الگ کرتا۔ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں بندھے۔ بندھائے اصول تھے، صبح اٹھتے ہی ساڑھے سات بجے ٹریننگ کی ورک شاپ جانا ہوتا۔ یہ ورک شاپ فیکٹری کے اندر ہی موجود تھی، صبح سات بجے چائے ناشتہ ملتا، دوپہر بارہ بجے کھانا، اس کے بعد ساڑھے چار بجے تک انسٹی ٹیوٹ کے مرکزی بلڈنگ میں تکنیکی ٹریننگ کی کلاس ہوا کرتی۔ جس میں انجینئرنگ سے متعلق تکنیکی تعلیم دی جاتی تھی۔ تمام لوگوں کی رضامندی سے طالب علموں ہی میں ایک میس کمیٹی بنی تھی، جو میس کے سارے انتظامات دیکھتی تھی۔ پھر بھی کھانے کو لے کر اکثر لڑائی جھگڑے ہوتے ہی رہتے تھے۔ سینئر طلبا کی من مانی بھی اس وقت ظاہر ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر طالب علم روٹیوں کے کچا ہونے کی شکایت کیا کرتے۔ کبھی کبھار مار پیٹ کی بھی نوبت آجاتی۔ کچی روٹی کو لے کر وجے بہادر اور میرا نظریہ سب سے مختلف تھا۔ میں کبھی شکایت نہیں کرتا تھا، وجے بہادر جب روٹیوں کو برباد کرتے ہوئے کسی کو دیکھ لیتا تو وہ اپنے غصہ کو روک نہیں پاتا تھا:

''اوے کھوتے! تو اس روٹی کی کیمت نی جاڑتا! اسے کھیت میں اگانے میں کتنی محنت لگتی ہے... تجھے پتا ہے۔''

اس بات کو سن کر کوئی بھی روٹی پھینکنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ اصل میں کسان سے زیادہ روٹی کی قیمت کون جان سکتا ہے۔ وجے بہادر پنجاب کے کسان گھرانے سے ہی تعلق رکھتا تھا اور میں نے بچپن سے ہی روٹی کو بہت قیمتی چیز مانا ہے، اسے برباد کرنے والے لوگ مجھے

گناہ گار لگتے ہیں۔

ہاسٹل کے دن کچھ لوگوں کے لیے مستی بھرے دن تھے۔ مگر میرے لیے شخصیت سازی کے دن۔ ہاسٹل میں رہ کر میں نے پہلی بار شطرنج دیکھی تھی، ہاتھی گھوڑے کے اس کھیل نے مجھے بہت متاثر کیا تھا، اس کھیل کو سیکھنے میں بہت زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ ہاسٹل کے کئی ساتھی ایسے تھے جو انسٹی ٹیوٹ سے واپس آتے ہی کھیلنے ہی بیٹھ جاتے۔

میرے ایک استاد تھے او پی گرگ، جو شطرنج کے بہت زیادہ شوقین تھے، جب انھیں یہ خبر ہوئی کہ میں بھی کھیلتا ہوں تو وہ ہاسٹل میں ہی شطرنج کھیلنے آنے لگے۔ بہت بار ایسا ہوا کہ دیر رات تک کھیلتے رہتے۔ ان دنوں شطرنج کا نشہ اس قدر حاوی تھا کہ اس کی بازیاں ہی دماغ میں گھومتی رہتیں۔ وہی دن تھے جب پریم چند کی کہانی، 'شطرنج کے کھلاڑی' پڑھنے کو مل گئی تھی۔ اس کہانی کو پڑھ کر ایسا لگا کہ جیسے شطرنج جان لیوا بیماری ہے۔ جس میں ڈوب کر اپنے گھر گرہستی، صوبہ، ملک تک کی کوئی خبر نہیں رہتی۔ اُف کیا کہانی تھی... اس کہانی کو پڑھ کر میں کئی دن تک بے قرار اور بے چین سا رہا۔ اس کہانی کا یہ اثر ہوا کی میں اس کھیل سے دور ہونے لگا اور شطرنج کا نشہ زیادہ دن تک مجھے باندھ نہ سکا میں ایک اچھا کھلاڑی بنتے بنتے رہ گیا۔ اس بات کا مجھے افسوس نہیں بلکہ خوشی ہوئی تھی۔

نئی جگہ اور نئے ماحول میں پہنچ کر ایک نیا تجربہ ہوا۔ یہ ہاسٹل کافی بڑا تھا اس میں تقریباً پانچ سو بچے ایک ساتھ رہ سکتے تھے۔ اس کے بڑے بڑے کمرے تھے اور ایک ایک کمرے میں دس سے بارہ طالب علم ہوتے تھے۔ وہ بھی الگ الگ جگہوں سے آئے ہوئے۔ میرے کمرے میں دہرادون، مرادنگر، کان پور، پونا وغیرہ کے لڑکے تھے۔ سب کے پاس اپنے اپنے بستر تھے صرف میرے پاس ہی بستر نہیں تھا۔ ایک لوہے کی چارپائی اور ایک کرسی بھی سب کو ملی تھی میز کا کام دیوار سے لگی چھوٹی الماری سے ہی چل جاتا۔ ہاسٹل جاتے ہی میرے سامنے جو مشکل کھڑی ہوئی وہ بستر کا نہ ہونا تھا۔ میرے پاس ایک سستا سا سوٹ کیس تھا جس میں برائے نام ہی کپڑے تھے اور کچھ پڑھنے لکھنے کی چیزیں تھیں۔ کافی دن تک مجھے وجے بہادر کے ساتھ ہی سونا پڑا... تقریباً ایک مہینے تک۔ اسکے بعد رانجھی کے

دکاندار سے کپڑا لے کر گدا بنوالیا اس گدے کی قیمت ہر مہینے تھوڑی تھوڑی کر کے دیتا رہا۔ ٹریننگ کے دوران جو وظیفہ ملتا تھا اسی سے کھانے کا خرچ بھی نکلتا اور جو تھوڑے بہت پیسے بچتے اس سے باقی کے خرچے پورے کرتا۔ وہ دن بہت تنگی کے تھے۔ دوسرے دوستوں کی طرح موج مستی کرنے کی حالت میری تھی ہی نہیں بلکہ میری کوشش تو یہ ہوا کرتی کہ اس وظیفہ میں سے کچھ رقم بچ جائے تو میں اپنے گھر والوں کو منی آڈر کرسکوں۔

وہاں پر مختلف خیالات کے لڑکے تھے، مارکسی خیالات کے بھی، انہیں کے اثر سے میں نے مارکسی ادب پڑھا تھا۔ خاص طور پر 'گورکی کی ماں' نے تو مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ چیخوف کی کہانیوں سے بھی تعارف ہوا۔ انھیں لڑکوں کے ساتھ مل کر تھیئٹر گروپ بنایا تھا ہاسٹل ہی میں ڈراموں کی مشق ہوا کرتی۔ انسٹی ٹیوٹ کے آڈیٹوریم ہی میں ہم لوگوں نے کئی ڈرامے پیش کیے تھے۔

یہی وہ دن تھے جب میں شاعری کرنے لگا تھا۔ میرے برابر والے کمرے میں گووند موریہ نام کا ایک لڑکا تھا جو ہر وقت کتابوں میں ڈوبا رہتا۔ راہی معصوم رضا کا 'آدھا گاؤں' ان دنوں کافی مشہور تھا۔ گووند موریہ نے ہی وہ ناول مجھے دیا تھا۔ یش پال کا 'جھوٹ سچ' رات رات بھر جاگ کر پڑھا تھا۔

جس روز میں ہاسٹل پہنچا تھا میری میز کی دراز میں راجیند ریادو کی 'سارا آکاش' کی کاپی ملی تھی۔ میں دو سال اس کمرے میں رہا اور کئی بار اس ناول کو پڑھا۔ درمیاتی طبقہ کے لوگوں پر اس سے بہتر تحریر میری نظر سے نہیں گذری۔ صرف میں نے ہی نہیں بہت سے لڑکوں نے اس ناول کو ان دنوں پڑھا تھا۔ وہی دن تھے جب میں نے ڈرامے لکھ کر ان کو اسٹیج کرنا شروع کر دیا اور خود بھی اداکاری اور ہدایت کاری کرنے لگا تھا۔ وہ میرے لئے اسٹیج پر شروعاتی دن تھے۔ خمریا (جبل پور) میں ایک مشہور اداکار تھے شری ورما جی۔ ان کی ہدایت کاری میں، مَیں نے کئی ڈرامے بھی کیے تھے۔ گاندھی جی کی یوم پیدائش کے موقع پر میں نے ڈرامہ 'چھایا' بھی کیا تھا جو خمریا کے بڑے میدان میں پیش کیا گیا تھا۔

وجے بہادر سول اور میں ایک ہی کمرے میں تھے دونوں کی ایک ہی مشکل تھی کہ ہم

دونوں کی پڑھائی ادھوری رہ گئی تھی اور ہم لوگ آگے پڑھنا چاہتے تھے اور ہمیں یہ بات بہت کھلتی تھی تب ہم نے یہ طے کیا کی اب کچھ کرنا ہے۔

اے۔ایم۔آئی۔ای (انجینئرنگ) سے پرائیوٹ امتحان پاس کیا جا سکتا ہے۔فارم بھی لے کر آئے لیکن فیس بھرنے کی رقم میرے پاس نہیں تھی تو میں اس فارم کو بھرنے سے پھر رہ گیا۔وجے نے کہا بھی تھا:

''یار تو کہے تو میں اپنے باپو سے مانگ لیتا ہوں۔''

میں نے ہی منع کر دیا۔ایک بار پھر پڑھائی جاری رکھنے والے منصوبے پر پانی پھر گیا۔
جبل پور میں گذارے دنوں نے مجھے بدل کر رکھ دیا تھا میری زبان بھی بدل گئی تھی۔ زبان ہی نہیں بلکہ میرے اٹھنے بیٹھنے کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا تھا۔بہت سے ایسے دوست بنے، جو لگاتار سماجی موضوعات پر بحث و مباحثہ کیا کرتے۔سیمینار اور ثقافتی سرگرمیوں کی طرف میرا رجحان بڑھنے لگا۔جبل پور کے ادبی پروگراموں سے میں منسلک ہو گیا تھا۔ادب کے متعلق میرا خود کا نظریہ بننے لگا تھا۔ادبی تحریروں کی جگہ میں عام خیالات کی طرف زیادہ متوجہ ہوا تھا۔

گاؤں سے بابا کے ہر خط میں صرف شادی کے لیے ہاں کہہ دینے کی فرمائش ہوا کرتی۔انھیں لگ رہا تھا کہ میری عمر بڑھ رہی ہے اس عمر میں تو لڑکے باپ بن جاتے ہیں۔ اور میں لگاتار ان کی بات کا انکار کرتا چلا آ رہا تھا۔میں گھر گرہستی کے چکّر سے دور رہنا چاہتا تھا۔مجھ سے دو سال چھوٹی بہن مایا کی شادی کو تین سال پورے ہو چکے تھے۔دو سال تو بہت ہی مصروفیت میں گذرے۔ٹریننگ بھی صحیح چل رہی تھی۔انسٹی ٹیوٹ میں پہچان بن گئی تھی ۔ہاسٹل میں ذات پات کو لے کر ایسا کوئی خاص نہیں ہوتا، جو تکلیف دہ ہو۔ہاں کبھی کبھی دتی ،مرادنگر کے ساتھی چھینٹا کشی ضرور کرتے۔دہرادون اور میرٹھ کے لڑکوں کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میری ذات ہے کیا۔جبکہ میرے نام کے ساتھ عرف 'والمیکی' لگا ہوا تھا۔

انسٹی ٹیوٹ میں کچھ لوگ ایسے تھے، جن کا مجھے بہت پیار ملا۔ایک شری لال جی تھے۔ جو ہمیشہ اپنے گھر بلایا کرتے تھے۔اور پرکاش کا ملے تھے جن سے میں نے بہت کچھ

سیکھا ہے۔

انھیں دنوں آرڈیننس فیکٹری ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ امبرناتھ (بمبئی) میں ڈرافٹ مین کی ٹریننگ کے لیے فارم نکلے ہوئے تھے۔ ہمارے ہاسٹل میں سارے ہی لڑکوں نے فارم بھرا تھا۔ آل انڈیا مقابلے کے تحت اس ٹریننگ کے لیے انتخاب ہونا تھا۔ تحریری امتحان میں تو پاس ہو گیا لیکن انٹرویو کے لیے بمبئی جانا تھا۔ پھر سے وہی معاشی مسئلہ آ کھڑا ہوا۔ وجے نے کچھ پیسے دیے تھے۔ تب جا کر میں انٹرویو کے لیے جا پایا تھا۔ خمریا کی ٹریننگ پورا ہوتے ہوئے بمبئی سے بھی بلاوا آ گیا۔ خوشی تو بہت ہوئی تھی لیکن گھر کی شکستہ حالت میری آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔

ٹریننگ ختم ہوتے ہی فیکٹری میں کام مل جانے کی پوری امید تھی۔ نوکری مل جانے کا مطلب تھا گھر کے حالات میں بہتری۔ اور زندہ رہنے کے لیے نوکری کی ضرورت تھی۔ اسی لیے ڈھائی سال اور ٹریننگ میرے لیے مشکل تھی۔ میں نے اپنی پریشانی انسٹی ٹیوٹ کے سینئر استاد شری تھومس کے سامنے رکھی۔ انھوں نے بہت توجہ سے میری بات سنی۔ اور کہا:

''جہاں اتنے دن چل گیا ہے، ڈھائی سال اور چلنے دو امبرناتھ (بمبئی) کی ٹریننگ کے بعد تم اچھی حالت میں آ جاؤ گے۔''

انھوں نے مجھے سو (100) روپے بھی دیے تھے۔ میں نے بہت کہا:

''نہیں سر یہ روپے نہیں لوں گا۔''

لیکن وہ نہیں مانے۔

''رکھ لو۔ بمبئی بڑا شہر ہے ضرورت پڑے گی۔ نوکری لگ جانے پر واپس کر دینا۔''

اسی کے ساتھ ایک سینئر ساتھی لیش پال نے بھی سو (100) روپے دیے تھے۔ ان دو سو (200) روپیوں کی بدولت میں بمبئی پہنچ پایا تھا۔

وجے بہادر سول جس کو چھوڑ کر میں بمبئی کے لیے روانہ ہوا، اس سے جدا ہونے کی تکلیف مجھے بہت تھی۔ تین سال تک ہر لمحہ ہم دونوں ساتھ تھے۔ وجے کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ ہم دونوں کے درمیان گہرے تعلقات بن گئے تھے۔ اس کے بغیر مجھے ادھورا پن

محسوس ہو رہا تھا۔ وہ میرے اپنوں سے بھی کہیں بڑھ کر تھا۔

خمریا ہاسٹل میں میرے پاس بہت سی کتابیں جمع ہو گئی تھیں۔ انھیں بمبئی لے جانے کے لیے میرے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔ وہیکل (Vechile) فیکٹری، جبل پور میں میرے دوست کرن سنگھ تھے۔ میں اور وجے کچھ دن اسی کے ساتھ رہے تھے۔ بمبئی جانے سے پہلے ہی تمام کتابیں اسی کے پاس رکھوا دیں۔ اس نے بھی وعدہ کیا تھا کہ کسی کے ساتھ بمبئی بھیج دے گا لیکن حالات کچھ ایسے بنے کہ نہ میں لوٹ کر جبل پور آسکا اور نہ کرن سنگھ نے کتابیں بھیجوائیں۔ چند دن خط و کتابت بھی رہی لیکن کچھ وقت کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ بھی ٹوٹ ہو گیا۔ کرن سنگھ اور وجے بہادر سول کو میری ان ادبی کتابوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی ان کے لیے وہ صرف ردّی تھیں۔ اسی میں 'سارا آکاش' کی وہ کتاب بھی تھی جو کسی اجنبی نے میرے میز کی دراز چھوڑ دی تھی یا پھر دھوکے سے چھوٹ گئی تھی۔

8/جولائی 1970ء کی شام تھی میں اپنے تھوڑے سے سامان کے ساتھ آرڈیننس فیکٹری ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ امبرناتھ کے ہاسٹل میں پہنچا۔ کلّیان ریلوے اسٹیشن پر انسٹی ٹیوٹ کی گاڑی کھڑی تھی۔ میرے ساتھ جبل پور سے اور بھی لوگ ساتھ تھے۔ ہاسٹل امبرناتھ کی پہاڑی کے بالکل نیچے بہت ہی خوبصورت جگہ پر تھا۔ آرڈیننس فیکٹری کے اس انسٹی ٹیوٹ اور ہاسٹل کی ایک اور اہمیت تھی کہ یہاں کے اساتذہ اور ڈرافٹ مین کا ہندوستان کے بڑے ٹیکنیشین اور ڈرافٹ مین میں شمار ہوتا تھا۔ ہاسٹل کی شام بے حد خوشگوار ہوتی۔ جمناسٹک، انڈور گیمس کی سہولیات کے ساتھ ساتھ سوئمنگ پول، لائبریری اور اور ریڈنگ روم بھی تھا۔

ہاسٹل کی لائبریری دیکھ کر میں بہت خوش ہو گیا تھا۔ اسی لائبریری میں میں نے پاسترناک، ہمنگ وے، وکٹر ہیوگو، پیرے لوئی ٹالستائی، پرل ایس بک، ترگ نیو، اسٹی ونسن، آسکر وائلڈ، رومیاں رولا، ایمل ژولہ کو پڑھا تھا۔ یہیں رہتے ہوئے رابندر ناتھ ٹیگور، کالی داس کو بھی پڑھا تھا۔

ہاسٹل کے ایک کمرہ میں دس دس لڑکے رہتے تھے۔ میرے ساتھ سُدا ما پاٹل (مراٹھی

بھساول)، وی کے اُپادھیائے (کانپور)، پی سی مردھا (بنگالی)، کے سی رائے (بنگالی)
، دلیپ کمار مترا (بنگالی)، بی کے جان (کٹنی، مدھیہ پردیش)، گورموہن داس (بنگالی۔کلکتہ)
، گلاٹی (سکھ) تھا۔ سداما پاٹل سے بہت دوستی ہوگئی تھی۔ اس کو بھی ادب سے دلچسپی اور
ڈراموں سے اسے بہت گہرا لگاؤ تھا۔ ہر سنیچر اتوار کو ہم دونوں بمبئی ڈرامے دیکھنے جاتے۔
کبھی کبھی ہفتہ کے بیچ میں بھی کوئی اچھی پیشکش ہوتی تو ہاسٹل سے چوری چھپے چلے جاتے۔
رات کے جیسے ہی دس بجتے تھے گیٹ کا تالا بند ہوجاتا۔ اگر دیوار کود کر آتے تو پکڑے جانے
کا ڈر تھا۔ کئی بار نالے کے راستے سے ہو کر ہاسٹل میں داخل ہوئے تھے۔ ایک روز کیا ہوا کہ
گیٹ کی چابی میرے ہاتھ لگ گئی۔ اسی دن فیکٹری میں جا کر میں نے چابی بنالی۔ چابی بنتے
ہی ہماری مشکلوں کا حل نکل آیا۔ لیکن ایک روز ہم بری طرح پھنس گئے۔ رات کے بارہ بجے
تک دربان لائبریری کے برآمدے میں سو جاتا تھا، اور ہم دونوں آہستہ آہستہ تالا کھول کر اندر
آجاتے، اندر آکر پھر سے تالا بند کردیتے۔ اس روز دربان جاگا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں
تالا کھولتے ہوئے دیکھ لیا۔ جیسے ہی دیکھا وہ چلّایا۔ تالا تو کھل چکا تھا اور ہم دروازے کے اندر
کھڑے تھے۔ اس نے وارڈن سے شکایت کی دھمکی بھی دی۔ میں نے اس سے پوچھا:

''کیا شکایت کروگے؟''

''تم لوگ تالا کھول کر باہر سے اندر آئے ہو۔'' دربان نے کہا۔

میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا:

''ہم باہر نہیں اندر ہی تھے۔ تم تالا لگانا ہی بھول گئے ہو۔ اسے بند کرو۔''

کافی گہما گہمی کے بعد وارڈن نے بھی آواز سن لی تو وہ بھی وہیں آگئے۔ مجھے دیکھتے
ہی بولے:

''مہارشی تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

(وہ مجھے اسی نام سے بلاتے تھے) میں نے پورے اعتماد سے کہا:

''وارڈن صاحب یہ دربان تالا بند کرنا بھول گیا۔ دیکھو تالا کھلا ہے ابھی بھی۔
وہی اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہ مانتا ہی نہیں۔''

اس روز تو معاملہ کسی طرح رفع دفع ہو گیا لیکن وارڈن کو ہمارے اوپر شک ہو چکا تھا۔ ہم نے بھی کچھ دن کے لیے آنا جانا بند کر دیا۔ امبر ناتھ کے گاندھی آشرم میں شری رام لاگو کے کیے ہوئے ڈراموں کو اسٹیج کیا جانا تھا۔ ناٹک کے ٹکٹ ہی بہت مشکل سے ملے تھے۔ ''نٹ سمراٹ'' کے کردار میں شری رام لاگو نے دھوم مچا رکھی تھی۔ میس سے کھانا کھا کر ہم لوگ خاموشی سے باہر نکل آئے۔ ڈرامہ ساڑھے نو بجے سے تھا۔ اس وقت سوا نو بج رہے تھے۔ پاٹل اور میں جلدی جلدی اسٹیشن جانے والی سڑک سے جا رہے تھے کہ اچانک سامنے وارڈن آتے دکھائی دیے۔ انھوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا۔

''مہارشی، اس وقت کہاں چلے؟'' انھوں نے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے کہ اچانک پاٹل نے کہہ دیا:

''سر میں درد تھا، اسٹیشن تک جا رہے ہیں، چائے کافی پی کر ابھی واپس آجائیں گے۔''

کیوں میس میں چائے کافی نہیں ملتی؟''

''ملتی تو ہے سر، لیکن آج دودھ ختم ہو گیا ہے۔ اس لیے اسٹیشن تک جا رہے ہیں۔''

پاٹل نے بہانا مارنے کی کوشش کی۔

انھوں نے کہا: ''آؤ میرے ساتھ میں کافی پلاؤں گا۔''

وہ ہمیں روک کر اپنے کوارٹر میں لے گئے۔ ناٹک کے ٹکٹ ہماری جیب میں کلبلا رہے تھے۔ یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر انھوں نے اپنی بیوی سے چائے بنانے کو کہا۔ اور خود سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے پاٹل کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ وہ اندر ہی اندر مسکرا رہا تھا۔ وارڈن کی بیوی صاحبہ جیسے ہی چائے بنانے کے لیے باورچی خانے میں گئیں، میں نے اٹھتے ہی کہا:

''اماجی، وارڈن صاحب بے کار میں ہی آپ کو تکلیف دے رہے ہیں۔

لائیے چائے میں بناتا ہوں۔''

وہ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گئیں۔

''مہارشی تم آئے ہو، بیٹھو بیٹھو... میں بناتی ہوں چائے۔''

میں نے ان کے پاس جا کر دھیرے سے کہا:

''امّا جی آج ہم دونوں گاندھی اسکول میں ناٹک دیکھنے جا رہے تھے کہ وارڈن صاحب گھیر کر یہاں لے آئے۔ یہ دیکھو ٹکٹ، لیکن انھیں پتا نہیں ہے۔''

امّا جی اوپر سے نیچے تک مجھے گھورتے ہوئے بولیں: ''اچھا ڈرامہ ہے؟''

میں نے کہا: 'امّا بہت اچھا ہے۔''

''تو جاتے کیوں نہیں؟'' وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

''کیسے جائیں وارڈن صاحب اجازت نہیں دیں گے۔'' میں نے رونی شکل بناتے ہوئے کہا۔

وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔

''ارے کیسے وارڈن ہو۔ بچّوں کو گھومنے پھرنے بھی نہیں دیتے ...جاؤ مہارشی... لیکن جلدی ہی لوٹ آنا...''

وارڈن تو کچھ بول نہیں پائے۔ ہم دونوں نے جو دوڑ لگائی سیدھے گاندھی اسکول میں آ کر ہی سانس لی۔ ڈرامہ شروع ہو چکا تھا۔ رات کے ایک بجے ڈرامہ ختم ہوا۔ ہاسٹل کا تالا کھلا چھوڑ کر دربان سویا ہوا تھا۔ سدامانے تالا بند کرتے ہوئے کہا:

''جے امّا جی۔''

ان دنوں ہم نے وجے تینڈولکر کے مراٹھی ناٹک 'سکھارام بائینڈرز'، 'گدھاڑے'، 'خاموش عدالت جاری ہے' دیکھے تھے۔ بمبئی میں تھیٹر یونٹ کے ڈرامہ میں ڈرامہ ہیودن، اشاڑھ کا ایک دن، وغیرہ ڈراموں میں امریش پوری، امول پالیکر، سنیلا پردھان، سلبھا دیش پانڈے کی اداکاری نے ان ڈراموں کو اور بہترین بنا دیا تھا۔

ہاسٹل میں بھی ہم نے ڈرامے کے لیے ایک گروپ بنا لیا تھا۔ اور مشق بھی کیا کرتے تھے۔ امبرناتھ میں ہم نے کئی جگہ اسٹیج بھی کیے تھے۔ اسی دوران پونا میں گویّوں کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا۔ پونا کے پاس ایک گاؤں میں اونچی ذات والوں نے گویّوں کی انکھیں

پھوڑ ڈالی تھیں۔ اس حادثہ سے بمبئی اور پونا میں جھگڑا بڑھ رہا تھا۔ دلت پنتھر کی سگبگاہٹ شروع ہو چکی تھی۔ اس حادثہ کو ذہن میں رکھ کر میں نے دلتوں کی مشکلات پر ایک مضمون لکھا جو نو بھارت ٹائمس، بمبئی کے لیے بھیجا۔ جو اسی دوران شائع ہو گیا۔ اس مضمون کا زبردست ردّعمل ہوا۔ شیوسینا کے حامی سرکاری ملازمین نے میری اس تحریر کی شکایت انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل شری دیسائی سے کر دی۔ پرنسپل نے مجھے اپنے دفتر میں بلا کر نو بھارت ٹائمس کی وہ تحریر میرے سامنے رکھ دی۔

''یہ تم نے لکھا ہے؟''

''جی''

انھوں نے دوبارہ پوچھا: ''ٹھیک سے دیکھ کر بتاؤ یہ تحریر تمہاری ہے؟''

''جی میری ہی ہے۔'' میں نے اقرار کر لیا۔

''تم سرکاری انسٹی ٹیوٹ میں ہو اس کی وجہ سے تمہارے خلاف سرکاری کارروائی ہو سکتی ہے۔''

میں تو خاموش تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بولے:

''ٹریننگ کے دوران یہ سب مت کرو... نکال دیے جاؤ گے۔ جاؤ... آگے سے دھیان رکھنا۔''

انھوں نے تنبیہ کے بعد مجھے چھوڑ دیا لیکن اس مضمون کی وجہ سے دوستوں کا برتاؤ بھی بدل گیا۔ وہ میری ذات ڈھونڈنے لگے کیوں کہ میں نے دلتوں کے لیے اپنی ہمدردی ظاہر کی تھی، جو ان کی نظر میں میرا گناہ تھا۔

اسی دوران سداما پاٹل نے اچاریہ اترے کے ایک ڈرامہ 'مارو چی ماوشی' کا ہندی میں ترجمہ کر ڈالا۔ اس میں اہم کردار میرا ہی تھا۔ جب وہ ڈرامہ اسٹیج پر پہلی بار پیش کیا گیا، اس کے بعد تو امبرناتھ کے لوگ مجھے اداکار کے طور پر پہچاننے لگے۔ اوم پرکاش والمیکی کے بجائے وہ اس کردار کے نام سے پکارتے تھے میں اپنے اندر ایک طرح کا جوش و ولولہ محسوس کر رہا تھا۔ اسی دوران امبرناتھ میں مراٹھی کے اداکار کلکرنی سے تعارف ہوا۔ جو آگے چل کر

گہری دوستی میں بدل گیا۔ کئی مشہور ہدایت کاروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ جہاں ایک طرف میں اپنے لیے راستہ کی تلاش میں بھٹک رہا تھا وہیں میرے بابا کے خط لگاتار آرہے تھے۔ وہ میری شادی کے لیے فکرمند تھے۔ مجھے ٹریننگ کے دوران جو وظیفہ مل رہا تھا، کھانے کا خرچ نکال کر ہر مہینے معینہ رقم گھر بھیج دیتا تھا۔ ہاتھ میں جو بھی بچتے تھے انھیں سے خرچ چلاتا۔ ڈرامہ کے لیے ٹکٹ پر ہمیں چھوٹ ملتی تھی۔ ہم طالب علم ہونے کا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ریل میں بنا ٹکٹ سفر کرنے کے طریقے بھی ہم نے سیکھ لیے تھے۔ دادر وی۔ ٹی چرچ گیٹ کے ٹکٹ دیکھنے والوں کو چکما دینے کے کئی فارمولے ہم نے ایجاد کر رکھے تھے۔ کم سے کم خرچ میں ہم بمبئی گھوم لیتے تھے۔

انھیں دنوں میرا تعارف مراٹھی کے دلت ادب سے ہوا۔ دلت ادب کی کہانیاں مراٹھی ادب کو ایک نئی پہچان دے رہی تھیں۔ دیا پوار، نام دیو، ڈھسال، راجہ ڈھالے، گنگادھر پان تاوڑے، بابوراؤ، باگول، کیشو میشرام، نارائن سُروے، رامن نمبالکر، یشونت منوہر کے الفاظ رگوں میں چنگاری بھر رہے تھے۔ ایسی نئی نئی چیزیں ظاہر ہو رہی تھیں جس سے ایک طاقت پیدا ہو رہی تھی۔

میرا جیسے جیسے دلت ادب سے تعلق بڑھ رہا تھا، میرے لیے ادب کے معنی بھی بدل رہے تھے۔ سداما پاٹل نے ان دنوں میری بہت مدد کی تھی۔ مراٹھی کی معلومات دھیرے دھیرے بڑھنے لگی تھی۔

ہمارے بعد والے بیچ (Batch) میں جبل پور سے گووند موریہ بھی آ گیا تھا۔ اب ہم دو سے تین دوست ہو گئے۔ ہم تینوں نے بمبئی کی وہ تمام دکانیں چھان ڈالیں جہاں ہندی کی کتابیں ملتی تھیں۔ گرگاؤں میں 'ہندی گرنتھ رتنا کر' کے مالک سے دوستی ہو گئی۔ مہینے میں کم سے کم ایک بار ہم کتابیں لینے کے لیے 'ہندی گرنتھ رتنا کر' ضرور جاتے تھے۔ ہمارے گروپ میں وجے شنکر، نریندر گوگیا، اِمت اگروال، راجیش واجپئی بھی جڑ گئے تھے۔ ٹریننگ کی تکنیکی پڑھائی کے ساتھ ساتھ ادب میں دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ یہ دنیا ہمارے اندر ایک نئی فکر پیدا کر رہی تھی۔ ہاسٹل کے مستی بھرے دنوں میں بھی ہم زندگی کی مشکلات اور حقائق کو محسوس،

کرتے ۔جیسے ہی چھٹی ہوا کرتیں ہمارے ساتھی پکنک اور سنیما کی طرف بھاگتے ۔اور ہم لوگ مسائل پر لمبی لمبی بحث و مباحثہ میں گھنٹوں گذار دیتے تھے ۔ہم ان تمام کاموں میں شامل تھے جو سماج کو بدل سکیں۔کئی بار وجے شنکر کہتا تھا:

''یار! تم لوگ کبھی جوان بھی ہوئے ہو یا نہیں...؟''

ہاسٹل میں جوانی کا مطلب ہی کچھ اور تھا، جس میں ہم فٹ نہیں بیٹھتے تھے۔کیوں کہ ادب جیسی فالتو چیزوں نے ہمارے ذہنوں کو جھلسا دیا تھا۔

آرڈیننس فیکٹری ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ امبر ناتھ (بمبئی) سے ہاسٹل زیادہ دور نہیں تھا۔ پہاڑی کے نچلے حصہ میں ہاسٹل بنا ہوا تھا۔وہ جگہ بہت خوبصورت تھی اور میرے کمرے میں رہنے والا سداما پاٹل بھساول کا رہنے والا تھا۔اس کا ایک دوست رمیش، وہ بھی بھساول کا ہی رہنے والا تھا۔اس نے ہمارا تعارف کلکرنی سے کرایا۔ونا یک سداشیو کلکرنی کالونی کے ہی فلیٹ میں رہتے تھے۔کلکرنی امبر ناتھ میں ہونے والی تمام ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی ہمارے درمیان دوستی ہوگئی۔اکثر ہم لوگ شام کو ان کے فلیٹ پہنچ جاتے۔انھیں ماس، مچھلی کھانے کا شوق تھا۔اس لیے اتوار کی دوپہر ہاسٹل کا پکا گوشت انھیں ہاسٹل میں کھینچ لاتا۔گھر میں تو ممکن نہیں تھا کہ وہ گوشت کھا پاتے۔ان کی باتوں میں بہت اپنا پن جھلکتا تھا۔کلکرنی ہم دونوں سے کافی بڑے تھے۔بات چیت میں بھی بہت اچھے تھے۔ان کی چھوٹی بیٹی سویتا میری ہم عمر تھی۔اس وقت کالج میں پڑھتی تھی۔ ہر اتوار کو کلکرنی ہمارے ساتھ کھانا کھانے آجایا کرتے۔سداما پاٹل اور میرے میس کے بل بڑھنے لگے۔ٹریننگ کے دوران ملنے والے وظیفہ میں سے مجھے اپنے گھر بھی کچھ رقم بھیجنی ہوتی تھی۔ پاٹل کے حالات بھی ایسے ہی تھے۔ہاں! مجھ سے بہتر ضرور تھے۔اس کے دو چھوٹے بھائی کالج میں پڑھ رہے تھے۔اسے ان دونوں بھائیوں کو خرچہ بھیجنا پڑتا تھا۔ہم دونوں ہی میانہ روی سے چلتے۔پھر بھی ہاتھ ہمیشہ تنگ ہی رہتا۔میرے پاس تو کپڑوں کی بھی کمی تھی۔بس کسی طرح گذر رہی تھی۔ایسے میں کلکرنی کا ہر اتوار کو آنا ہمارے کھانے کے خرچ کو اور بڑھا رہا تھا۔ایک دن سداما پاٹل نے بہت ہی مغموم دل سے کہا:

''یہ بامن (برہمن) ہراتوار کوٹپک پڑتا ہے۔''

ہماری شامیں تو کلکرنی کے گھر گذرتی لیکن کھانا واپسی پر میس میں ہی کھاتے۔

سداما پاٹل کا برت اور پوجا میں عقیدہ بہت مضبوط تھا۔ ہر روز مندر جاتا۔ امبرناتھ میں بہت ہی خوبصورت پرانا شیومندر تھا۔ پاٹل ہفتہ میں دودن مندر ضرور جاتا تھا۔ مجھے ان سب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ امبیڈکر اور مارکسی ادب نے میرے خیالات ہی بدل دیے تھے۔ لیکن میں پاٹل کے ساتھ مندر تک جاتا تھا اور باہر ہی پُلیا پر بیٹھ جاتا۔ خاموش جگہ پر مندر کا میدان بے حد خوبصورت لگتا تھا۔ اکثر و بیشتر کلکرنی کی بیوی اوران کی بیٹی مندر آجاتی تھیں۔ اکثر مندر کے میدان میں ہم سب لوگ ساتھ ہوتے تھے۔ ایک روز میں پُلیا پر بیٹھا تھا مجھے دیکھ کر سویتا بھی وہیں آگئی اوراس کی ماں مندر کے اندر چلی گئی۔

''آپ مندر میں کیوں نہیں جاتے؟'' سویتا نے نرمی سے پوچھا۔

''ان پتھر کی مورتیوں پر میرا کوئی یقین نہیں ہے۔'' میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

وہ میرے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ مجھے ایک عجیب سا احساس گدگدا رہا تھا۔ وہ ضد کرنے لگی۔

''چلو! مندر میں چلتے ہیں۔ سدامادادا (بڑے بھائی) اندر ہیں۔''

''ہاں پاٹل اندر ہے۔ آپ بھی جاؤ۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' میں نے اس کوٹالنا چاہا۔

وہ چپ چاپ پُلیا پر میرے ساتھ بیٹھی رہی کچھ دیر خاموشی کے بعد بولی:

''آپ اتنا چپ کیوں رہتے ہیں۔''

''مجھے سننا اچھا لگتا ہے۔'' میں نے بہت ہی نرمی سے کہا۔

وہ کھل کھلا اٹھی۔ اس کا ہنسنا مندر کی گھنٹیوں کی طرح تھا۔ اچانک اس نے کہا:

''آپ فلم دیکھتے ہیں؟''

''ہاں... کبھی کبھی...''

''ہمارے ساتھ چلو گے؟''

اس نے میرے بازؤں کو اپنے بازو میں لے لیا تھا۔ میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا

کہ میں سداماپاٹل سے معلوم کر کے بتاؤں گا۔تو سویتاناراض ہوگئی۔

''کیوں آپ میرے ساتھ نہیں چل سکتے ؟''

اس روز کہیں دل میں جھرنا پھوٹنے کی آواز سنائی دی۔ یہ فطری بات تھی۔ گھر کا سارا ماحول میرے دل ودماغ پر حاوی تھا۔اس احساس کی خود کو بھی بھنک نہیں لگنے دی کیوں کہ ہم دونوں کے درمیان کئی طرح کے فاصلے تھے، جو لگاتار مجھے روکتے تھے۔ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات کئی بار ہوئے، جن میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اس کا جھکاؤ میری طرف بڑھ رہا ہے۔وہ ہاسٹل میں بھی آنے لگی تھی۔سداما اسے ہاسٹل آنے سے روکتا۔کبھی کبھی تو ڈانٹ بھی دیتا۔لیکن سداما کی ڈانٹ کا اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ہاسٹل میں آکر میری کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی۔کبھی کبھی ادھر ادھر پھیلی کتابوں کو قرینے سے سجا دیتی۔ہاسٹل کا کھانا اسے پسند نہیں تھا۔وہ شاکاہاری (صرف سبزیاں) ہی کھاتی تھی۔

دیوالی سے ایک دن پہلے، صبح کو مسز کلکرنی نے اپنے گھر بلایا تھا۔وہ بھی صبح چار بجے۔ میں نے پاٹل سے پوچھا تو وہ ہنس پڑا۔اس کے ہنسنے کی وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔تب میں نے زور دے کر معلوم کیا تو اس نے بتایا:

''مزے کرو مسز کلکرنی تمھیں تیل اور ابٹن سے نہلائیں گی۔''

''مطلب!''میں نے حیرانی سے پوچھا۔

پاٹل نے بتایا تھا کہ مہاراشٹر کے برہمنوں میں یہ رسم ہے کہ گھر کی عورت گھر کے آدمیوں کو ابٹن اور تیل مالش کر کے نہلاتی ہے، بالکل صبح ہی صبح۔اس کی بات سن کر میں نے اس سے پوچھا:

''تم جاؤ گے؟''اس نے منع کر دیا۔

ساتھ ہی کہا کہ اس کو نہیں بلایا ہے۔اس رات میں ٹھیک سے سو بھی نہیں پایا۔ایک تو صبح چار بجے اٹھ کر جانا تھا، دوسرے میں ایک عجیب سے دل میں اٹھنے والے خیالات میں الجھا ہوا تھا۔کلکرنی کے گھر کی قربت مجھے متاثر کر رہی تھی۔پھر بھی میں اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے خوف زدہ تھا۔

برآمدے میں تین چوکیاں رکھی تھیں۔ کلکرنی، اجے اور میں چوکیوں پر بیٹھ گئے۔ اس وقت مجھے رہ رہ کر اپنے گھر گاؤں کا دم گھوٹنے والا ماحول یاد آرہا تھا۔ مسز کلکرنی نے باری باری سے ہم تینوں کو ابٹن اور تیل لگایا۔ تیل کی بہت اچھی خوشبو آ ہی تھی۔ میں نے کچھے کے اوپر تولیا لپیٹ رکھا تھا۔ انھوں نے تولیا کو الگ رکھنے کو کہا۔ میں نے کہا کہ مجھے شرم آرہی ہے۔ تب مسز کلکرنی نے تولیا چھینتے ہوئے کہا:

''تم میرے بیٹے اجے جیسے ہو، پھر ماں سے شرم کیسی۔''

اس لمحہ میں جذباتی ہو گیا۔ اچانک ماں یاد آ گئی، جو کچھ دنوں سے بیمار تھی۔ مسز کلکرنی کے نرم ملائم، شفقت بھرے ہاتھوں نے مجھے اپنی ماں کے کھردرے ہاتھوں کی یاد دلا دی۔ سرہانے بیٹھ کر میری ماں انگلیاں پھیرتی تھی، میرا شعور جیسے نیند کے آغوش میں چلا جاتا تھا۔ مسز کلکرنی نے غسل خانے میں ہمیں گرم پانی سے نہلایا۔ مجھے لگاتار اس بات کا ڈر لگ رہا تھا کہ اگر انھیں اسی وقت یہ معلوم ہو جائے کہ میری پیدائش ایک اچھوت ذات (چوہڑا) میں ہوئی ہے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

انھیں دنوں پونا میں گویّوں کی آنکھیں پھوڑ دی گئی تھیں جس کو لے کر بمبئی اور پونا کے دلت سماج نے مورچہ بندی کر دی تھی۔

کلکرنی کے گھر میں مجھے بے انتہا پیار اور اعتماد ملا۔ کبھی بھی پرایے پن کا احساس نہیں ہوا۔ لیکن سویتا کا میری طرف جھکاؤ مجھے خوف زدہ کر رہا تھا۔ میں ایسے لمحوں میں سہم سا جاتا۔ سویتا جتنا قریب آتی میں اتنا ہی اس سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا۔ ایک دن ان کے گھر پروفیسر کانبلے سے ملاقات ہوئی۔ کانبلے اور کلکرنی میں مراٹھی ڈراموں پر گہری بحث چل رہی تھی۔ میں اور پاٹل اس بحث کو خاموشی سے سن رہے تھے۔ اسی دوران مسز کلکرنی چائے لے کر آئیں۔ چائے پیتے پیتے میری نگاہ کانبلے کے پیالے پر پڑی۔ ان کا پیالہ ہمارے پیالوں سے الگ تھا۔ میں نے سداما سے سوال کیا تو اس نے مجھے کہنی مار کر خاموش کر دیا۔ ہاسٹل آتے وقت میں نے پھر وہی بات چھیڑ دی۔ پہلے تو وہ ٹالتا رہا آخر اس نے بتا ہی دیا۔

''مراٹھی برہمن، وہ بھی پونا کے، مہاروں کو اپنے برتن چھونے نہیں دیتے۔ اس

لیے ان کے برتن الگ رکھے جاتے ہیں۔ چائے کے چھوٹے کپ مسز کلکرنی اٹھانے آئی تھیں لیکن کانبلے کا کپ کلکرنی اٹھا کر لے گیا تھا۔''

یہ سب سن کر تو میرے کان ہی گرم ہو گئے۔ جیسے کسی نے گرم پانی ڈال دیا ہو۔

''کیا سبھی دلتوں کے ساتھ ان کا سلوک ایسا ہی ہے۔''

میں نے پاٹل سے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ میرے گاؤں میں تو چھوا چھوت تھی ہی، ان دنوں دہرادون اور اتر پردیش کے حالات تو اور زیادہ خراب تھے۔ بمبئی جیسے بڑے شہر میں پڑھے لکھے لوگوں میں ایسے حالات کے بارے میں خیال سے میرے اندر ایک لاوا ابلنے لگا تھا۔

''ہاں ایسا سبھی کے ساتھ ہے۔'' پاٹل نے بڑی صفائی سے جواب دیا۔

پاٹل کے دل میں بابا صاحب امبیڈکر کے لیے عزت تھی اور دلتوں کی تحریک میں بھی وہ ساتھ ہی تھا۔ وہ اعلیٰ ہوتے ہوئے بھی چھوٹا نہیں تھا۔ میں اپنے دل میں اٹھنے والے طوفان کو پہچان گیا تھا۔ اس واقعہ نے میرا سکون چھین لیا تھا۔ میں نے پاٹل سے پوچھا:

'میرے بارے میں وہ جانتے ہیں۔''

''شاید نہیں...'والمیکی' سے شاید وہ تمھیں برہمن سمجھتے ہیں۔ تبھی تو اس روز دیوالی پر نہلانے کے لیے بلایا تھا۔''

پاٹل کچھ کچھ فکر مند ہونے لگا۔

''تم نے انھیں کبھی نہیں بتایا؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں بتاتا؟'' ...دلت ہونا کیا گناہ ہے؟'' پاٹل نے غصہ میں کہا۔

''کل انھیں پتہ چل جائے...تو...؟'' میں شک وشبہ میں تھا۔

''تو گنہگار تم کیسے ہو گئے؟...انھوں نے بھی پوچھا نہیں ....تو ہم اپنی طرف سے ڈھنڈورا کیوں پیٹیں؟ ہاں اگر وہ پوچھتے اور تم جھوٹ بول کر ان کے دائرہ میں شامل ہو جاتے تب تمھیں گنہگار کہا جا سکتا تھا...وہ بھی جھوٹ بولنے کی وجہ سے۔''

پاٹل نے غصہ سے یہ ساری باتیں کہی تھیں۔اس واقعہ کے بعد میں ویسا نہیں تھا جیسے پہلے ہوا کرتا تھا۔میری اپنے دل کی بے چینی مجھے تنگ کر رہی تھی۔ایسے ماحول کو میں جھیل نہیں پاتا ہوں سب کچھ جھوٹ لگتا ہے۔یہ بے چینی پاٹل سے چھپی نہیں تھی۔اس نے مجھے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔

''بامنوں کا پورا دکھاوا ہی جھوٹ اور دھوکے پر منحصر ہے...بھول جاؤ اور مزے کرو۔''

ایسے پیار اور عزت کا خواہش مند میں نہیں ہوں، جو جھوٹ کے سہارے ملے۔ان دنوں میں اندرونی کرب سے گذر رہا تھا۔اسی پس وپیش میں کئی دن گذر گئے، میں کلکرنی کے گھر نہیں گیا۔انتظار کر کے سویتا خود ہاسٹل آگئی۔ میں سویتا سے کھل کر بات کرنا چاہ رہا تھا۔لیکن ہاسٹل میں یہ ممکن نہیں تھا۔میں نے سویتا سے کہا:

''مجھے تم سے بات کرنی ہے، اکیلے میں۔''

''اکیلے میں ...کیا بات ہے؟''اس نے شرارت سے اپنی آنکھوں کو گھماتے ہوئے پوچھا۔''....

''کل شام کو مندر چلتے ہیں؟''

''لیکن آپ کی ماں ساتھ ہوں گی۔''میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''نہیں میں اکیلے ہی آؤں گی۔''اس نے مجھے یقین دلایا۔

سویتا کے چلے جانے کے بعد میں نے پاٹل سے کہا کہ میں سویتا کو صاف صاف بتا دوں گا۔پاٹل نے مجھے روکنا چاہا۔

''نہیں! یہ تماشا مت کرو وبال کھڑا ہو جائے گا۔''

لیکن میں تو اس روز طے کر چکا تھا کہ بات تو صاف ہونی ہی چاہیے۔جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔وہی دن تھے جب پونا اور بمبئی تحریک زوروں پر تھی۔سویتا مجھے امبرناتھ ریلوے اسٹیشن پر ریسٹورنٹ 'اُپکار' کے پاس ملی۔اس نے سفید رنگ کا اسکرٹ بلاؤز پہن رکھا تھا جو اس کے دودھیا رنگ پر خوب جچ رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں کشش اور چال میں الھڑپن تھا۔وہ اپنی عادت کے مطابق کچھ نہ کچھ بولے ہی جا رہی تھی۔ میں صرف ہوں، ہاں میں جواب

دے رہا تھا۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں یہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ اچانک سویتا کو کچھ یاد آیا۔

''ارے میں تو بھول ہی گئی، آپ کچھ بات کرنے والے تھے؟''

اس نے بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ لمحہ بھر کو لگا جیسے میں کچھ کہہ ہی نہیں سکوں گا۔ ہمت جٹاتے ہوئے میں نے کہا:

''تمہارے گھر اس روز جو پروفیسر کانبلے آئے تھے؟''

میری بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے میری بات کاٹ دی۔

''وہ مہار... ایس سی!'

اس کے اس انداز سے ہی میرے کان گرم ہو گئے۔

''ہاں وہی...''میں نے تلخی سے کہا۔

''آج اچانک اس کا خیال کیسے آ گیا، اس وقت؟''سویتا نے حیرانی سے پوچھا۔

''اسے چائے الگ برتنوں میں پلائی تھی؟''میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''ہاں گھر میں جتنے بھی ایس سی اور مسلمان آتے ہیں ان سب کے لیے برتن الگ رکھے ہوئے ہیں۔''سویتا نے نرمی سے جواب دیا۔

''یہ بھید بھاؤ تمہیں صحیح لگتا ہے؟''میں نے پوچھا۔

میرے الفاظ کی سختی کو اس نے محسوس کر لیا تھا۔

''ارے تم ناراض کیوں ہوتے ہو؟ انھیں اپنے برتنوں میں کیسے کھلا سکتے ہیں؟''اس نے سوال کیا۔

'کیوں نہیں کھلا سکتے؟''

ہوٹل میں... میس میں تو سب ایک ساتھ کھاتے ہیں پھر گھر میں کیا تکلیف ہے؟''

میں نے اپنی دلیل پیش کی... سویتا اس بھید بھاؤ کو صحیح اور تہذیب کا حصہ مان رہی تھی۔ اس کی ساری دلیلیں مجھے غصہ دلا رہی تھیں۔ پھر بھی اس روز میں قابو میں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایس سی غیر مہذب اور گندے ہوتے ہیں۔

میں نے اس سے پوچھا:

''تم ایسے کتنے لوگوں کوقریب سے جانتی ہو؟اس موضوع پر تمہاری رائے اور تجربات کیا ہیں؟''

وہ خاموش ہوگئی اس کا تعارف ایسے کسی انسان سے نہیں ہوا تھا پھر بھی گھریلو اثرات اس پر بری طرح حاوی تھے۔اس کا کہنا تھا آئی (ماں) بابا نے بتایا ہے۔یعنی یہ کہ یہ سب گھروں میں بچوں کو سکھایا جاتا ہے کہ ایس سی سے نفرت کرو۔ وہ چپ ہوگئی اور اس کی ساری شوخی غائب ہوگئی تھی۔ کچھ دیر تک ہم پُلیا پر خاموشی سے بیٹھے رہے۔میں نے اس سوال کیا:

میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

''آئی بابا تمہاری تعریف کرتے ہیں...کہتے ہیں یوپی والوں کے لیے ان کی جو رائے تھی اس سے الگ ہو۔تمہیں اچھا مانتے ہیں۔''سویتا نے چھکتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہاری رائے پوچھی تھی۔''

''اچھے لگتے ہو۔''

اس نے میرے کندھے پر جسم کا سارا بوجھ ڈال دیا تھا۔میں نے اس کو دور کیا اور کہا:

''اچھا اگر میں ایس۔سی ہوں...تو بھی...''

''تم ایس۔سی کیسے ہوسکتے ہو؟''اس نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟اگر ہوا تو۔''میں نے زور دیا۔

''تم تو برہمن ہو۔''اس کے لہجہ میں پختگی تھی۔

''یہ تم سے کس نے کہا؟''

''بابا نے''

''غلط کہا میں ایس سی ہوں...''میں نے پوری طاقت سے کہا۔میرے اندر جیسے کوئی چیز جل رہی تھی۔

''ایسے کیوں کہتے ہو؟''اس نے غصہ دکھایا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں.... تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا نہ میں نے کبھی کہا کہ برہمن ہوں۔''

میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

وہ حیرت سے میرا چہرہ تکتی رہی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے میں مذاق کر رہا ہوں۔ میں نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اتر پردیش کے ''چوہڑا'' گھرانے میں میری پیدائش ہوئی ہے۔

سویتا فکر مند ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اس نے روتے ہوئے کہا:

''تم جھوٹ بول رہے ہو نا؟''

''نہیں سویتا... یہ سچ ہے... جو تمہیں جان لینا چاہیے...'' میں نے اس کو یقین دلایا۔

وہ رونے لگی جیسے کہ میرا ایس سی ہونا کوئی گناہ ہو۔ بہت دیر تک سبکتی رہی۔ ہمارے بیچ میں اچانک فاصلہ بڑھ گیا۔ ہزاروں سال کی نفرت ہمارے دلوں میں گھر کر گئی تھی۔ ایک جھوٹ کو ہم نے تہذیب مان لیا تھا۔ واپسی پر ہم دونوں ہی خاموش تھے لیکن اندر ہونے والے شور وغل میں ڈوبے ہوئے۔ اس وقت میری ذہنی الجھن دور ہو چکی تھی۔ جیسے میرے دل سے کوئی بھاری بوجھ ہٹ گیا ہو۔ اسٹیشن کے پاس ریلوے لائن کو پار کرتے ہوئے میں نے سویتا سے کہا:

''یہ آخری ملاقات ہے۔''

''کیوں؟... گھر نہیں آؤ گے؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

''نہیں اب میں نہیں آؤں گا۔''

وہ چلتے چلتے رک گئی اور بولی:

''گھر آؤ یا نہ آؤ لیکن اگر یہ سچ ہے تو بابا کو مت بتانا...'' وہ پھر رونے لگی۔

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''لیکن کیوں؟'' میں نے جاننا چاہا۔

''نہیں کہو گے، وعدہ کرو۔''

سویتا کی آنکھوں میں ایک عجیب التجا تھی۔

اس کے بعد ہم کبھی نہیں ملے۔کچھ دن بعد امبر ناتھ سے میرا تبادلہ چندر پور (مہاراشٹر) ہوگیا۔ میں ان لوگوں سے بنا ملے ہی چلا آیا۔اچانک تمام تعلقات ٹوٹ گئے۔ ٹریننگ کے بعد آرڈیننس فیکٹری چاندا (چندر پور) میں میری نوکری لگ گئی۔

شروع شروع کے دنوں میں دنیش واجپئی اور آنند شرما کے ساتھ رہتا تھا۔ بعد میں مجھے ہاسٹل ہی میں ایک کمرہ مل گیا۔ اس کمرہ میں میرا ساتھی جے کشن جیسوال تھا۔شروع شروع میں اس نے تھوڑا تکلف دکھایا۔ دھیرے دھیرے وہ بھی ختم ہوگیا۔

کافی دنوں تک ہم دونوں ساتھ رہے۔ فیکٹری کی زندگی کو سمجھنے اور اس رنگ میں اپنے آپ کو ڈھالنے میں تھوڑا وقت لگا۔ ڈیوٹی کے بعد سارا وقت پڑھنے میں ہی گذرتا۔اسٹیج اور ادب کے لیے یہاں ماحول اچھا تھا۔لیکن زیادہ تر لوگ روایتی خیالات کے تھے۔

چندر پور میں ہندی اور اردو کے شاعر اور ادیب موجود تھے۔جن سے میرے تعلقات بن گئے تھے۔

میرے بابا کا خط آیا وہ بہت جلدی میری شادی کرنا چاہتے تھے۔جسبیر نے کوئی لڑکی دیکھ بھی لی تھی لیکن میں برابر انکار کرتا رہا۔ میں ابھی ٹھیک سے کامیاب بھی نہیں ہوا تھا لیکن وہ سب بار بار اصرار کررہے تھے۔اور میں خود کو مختلف کانٹوں بھری جھاڑیوں میں الجھا ہوا محسوس کررہا تھا۔آخر تنگ آکر جس لڑکی کو جسبیر نے دیکھ رکھا تھا اس سے میں نے انکار کر ہی دیا۔ 27/دسمبر 1973ء کو سورن لتا بھابھی کی چھوٹی بہن چندا سے شادی کرلی۔

سن 1974ء کو کچھ ساتھیوں کے ساتھ مل کر میں نے 'میگھ دوت ناٹیہ سنستھا' قائم کی۔ کچھ ہی دنوں میں یہ انسٹی ٹیوٹ ناگ پور کے آس پاس اپنے بہتر کام کے لیے جانا جانے لگا۔اسٹیج ڈراموں کے علاوہ نکڑ ناٹک کے ذریعہ عوامی پریشانیوں کا حل عوام کے سامنے پیش کرنے کی مہم شروع ہوئی۔نوجوان لڑکوں کا ایک گروپ محنت کے ساتھ اس میں لگا ہوا تھا۔

جے پی تحریک کی گونج ملک میں سنائی پڑ رہی تھی۔ان دنوں میں نے تک بندیاں چھوڑ

کر کچھ اچھی نظمیں لکھی تھیں ۔نو بھارت، یُگ دھرم، نئی دنیا وغیرہ کی وجہ سے مجھے لوگ شاعر کے طور پر پہچاننے لگے۔ چندر پور میں ایک ہفتہ وار رسالہ 'جن پرتی ندھی' میں ایک کالم بھی لکھنا شروع کیا تھا۔

چندر پور میں رہتے ہوئے ہی میں نے دلت تحریک کی طاقت کو اپنے اندر محسوس کر لیا تھا۔ دلتوں افکار کی حیرت انگیز باتیں اس علاقہ میں دیکھنے کو ملی تھیں ۔میں نے اپنے آپ کو اس تحریک سے جوڑا۔ اور اس کے ساتھ جڑنے سے مجھے جو سکون ملا تھا وہ ایک الگ ہی تجربہ تھا۔ جیسے جیسے میں اس تحریک کا حصہ بن رہا تھا ویسے ویسے کئی دوست مجھ سے دور ہو رہے تھے۔ان کے خیال سے میں بھٹک رہا ہوں اور اپنی عقل اور تخلیقی صلاحیت کو ختم کر رہا ہوں۔

گوتم بدھ کی انسانی آزادی والی سوچ نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔تبدیل ہونے والی اس کائنات میں کچھ بھی ایسا نہیں ہے جو بدلا نہ جا سکے۔انسان ہی کامل ہے۔رنج و غم اور علم وفہم، ہنر ہی انسان کو بلندی کی طرف لے جاتے ہیں۔

ناگپور کی عقیدت سے پُر زمین جو کہ دلتوں کے لیے مقدس اور پاک جگہ ہے وہیں پر بھدنت آنند کوسلیان جی سے ملاقات ہوئی تھی۔ بودھ مذہب کے شکوک وشبہات کے انھوں نے مدلل جوابات دیے تھے۔ ناگپور میں ہی بھاؤ سمرتھ سے ان کے گھر ہی ملاقات ہوئی ۔وہ ایک سیدھے اور سچے آدمی تھی جو کہ شاعر ،مصوّر اور ایک سچے انسان بھی تھے۔ جب بھی ملتے بہت ہی کھل کر ملتے۔ان سے ملاقاتیں تو بہت کم ہوئی تھیں لیکن ان کی چند ملاقات بھی یاد کرنے کے لائق تھیں۔

بابا کا خط آیا: ''ماں بیمار ہے جلدی آجاؤ۔''

خط ملتے ہی میں گھر کے لیے نکل پڑا۔راستے بھر ماں کا خیال ذہن میں گھومتا رہا کہ پتا نہیں کیسی ہوگی۔بس اڈّے پر اترا ہی تھا کہ گھر جانے کی اس قدر جلدی ہو رہی تھی کہ جیسے اڑ کر پہنچ جاؤں۔ ماں کو خیریت سے دیکھ کر راحت کی سانس لی۔

میں نے ماں سے پوچھا: ''بیمار تھی؟''

ماں نے سر سہلاتے ہوئے کہا: ''بیماری کی بات سُن کے تو آگیا۔''

''ایسی بھی کیا بات ہوگئی...جو اس طرح بلایا؟'' میں نے اپنے غصہ کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

''تیرے بھائی نے رشتہ پکّا کر دیا ہے اِب تو بیاہ کر لے۔ ہماری آنکھ کد (کب) بند ہو جاگی، کوڑ جاڑے ہے۔''

ماں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ میں خاموشی سے ماں کی تمام باتیں سنتا رہا لیکن میرے دل میں ہلچل پیدا ہو چکی تھی کیوں کہ جسبیر نے میرا رشتہ پکا کر دیا تھا، بغیر میری رضامندی جانے ہوئے ہی۔ بابا بھی جسبیر کی طرف داری کرر ہے تھے۔ انھوں نے میرے اردو گرد گھیرابندی کر دی۔ میری کوئی بھی بات یا دلیل سننے کو تیار ہی نہیں ہوا۔ جب میں دہرادون گیا تو خبر ملی کہ اس رشتہ کے پیچھے میرے ماما کا ہاتھ ہے۔ وہ میرے گلے کسی ایسی لڑکی کو باندھ دینا چاہتے ہیں جس سے کہ میں ماما کے شکنجے سے باہر ہی نہ نکل سکوں۔

جسبیر کو گاؤں میں ہی چھوڑ کر اچانک دہرادون آ گیا۔ میں نے سُرجن سے پوچھا:

''تم نے لڑکی دیکھی ہے؟''

اس نے صاف انکار کر دیا کہ اس کو اس معاملے میں مت گھسیٹو۔ اس نے نہ ہاں کی اور نہ ہی نا کی تھی۔ اس نے بے تعلقی ظاہر کی۔ سورن لتا بھابھی بھی بات کو ٹال گئی تھیں۔ ان دونوں کے اس برتاؤ نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ ہیم لال کا سُرجن کے گھر آنا جانا ابھی تک جاری تھا بلکہ میرے باہر جانے کے بعد اس کی سُرجن سے کافی حد تک گہری دوستی ہوگئی تھی۔ ہیم لال نے ہی میرے دل میں اس رشتہ کو لے کر شک پیدا کیا تھا۔ اس نے وہاں ہونے والی سازشوں کی خبر مجھ تک پہنچائی۔ میں ناامید اور پریشان ہو گیا تھا۔ گاؤں واپس آ کر جسبیر سے میں نے صرف اتنا کہا تھا:

''میں لڑکی دیکھنا چاہتا ہوں۔''

ان دنوں ہمارے سماج میں لڑکی دیکھنے کا رواج نہیں تھا۔ ساری باتیں بزرگ ہی طے کر دیتے تھے۔ جس کو لڑکا اور لڑکی دونوں ہی مان لیتے تھے۔ گھر کا کوئی بھی فرد لڑکی نہیں دیکھتا تھا۔ لڑکی دیکھنے کو تو بہت ہی برا خیال کیا جاتا تھا۔ بچولیا کے پکّے کیے گئے رشتے پر ہی یقین کیا

جاتا تھا۔ کئی بار اس بات سے بہت بڑے حادثے پیش آچکے تھے۔ میرے فیصلے سے گھر میں جیسے دھماکا ہو گیا۔ سب ہی مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ کافی گرما گرمی کے بعد جسبیر مان گیا۔ اور ہم دونوں دہرادون چلے آئے۔ ان دنوں لڑکی اپنے ماما کے گھر رہ رہی تھی۔ جیسے ہی ہم دہرادون پہنچے، پتا چلا کہ لڑکی اپنی ماں کے پاس مظفر نگر چلی گئی ہے۔ جسبیر مجھے لے کر مظفر نگر گیا تو معلوم ہوا کہ لڑکی دہرادون میں ہے۔ دراصل لڑکی کو نہ دکھانے کا یہ ایک بہانہ تھا۔ میں ایک عجیب سی الجھن میں پھنس گیا۔ اور میں بالکل تنہا۔ گھر سے لے کر باہر تک کوئی ایسا نہیں جس کے سامنے دل کی گرہیں کھول سکوں۔ ایک سورن لتا بھابھی تھیں۔ وہ بھی ایسے وقت میں کنّی کاٹ گئیں۔

انھیں حالات میں مَیں چندر پور واپس چلا گیا۔ کافی دن اداس رہا۔ اسی بیچ جسبیر کی طرف سے کئی خط آچکے تھے۔ وہ بار بار یہی لکھ رہا تھا کہ میں ان کی عزت نیلام کر رہا ہوں۔ جاتی برادری کے کچھ اصول ہیں، اسے ہم کیسے چھوڑ دیں؟ پڑھائی لکھائی کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم من مانی کرو؟

جسبیر کے خط سے مجھے گہری چوٹ لگی۔ میں شادی ہونے سے پہلے کچھ بن جانا چاہتا تھا لیکن یہ تمام لوگ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ ایسے لمحوں میں میں نے اس معاملے کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں سیدھے دہرادون پہنچا جسبیر مجھے دیکھ کر حیرانی میں تھا۔ جسبیر نے اس لڑکی کی ماں سے جو ان دنوں وہیں تھیں مجھ سے ملایا بھی تھا۔ وہ مجھے بہت سیدھی سادی عورت لگی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش بھی ہوئی تھیں۔ ان سے مل کر میں اور زیادہ مشکل میں آ گیا۔ ایک بار پھر میں نے جسبیر سے لڑکی دیکھنے کی بات کہی۔ جسبیر نے کہا:

''تجھے میرے پر یقین نہیں ہے۔ ماں سے تو ملوایا ہے اور کیا چاہیے؟''

''ماں سے نہیں مجھے لڑکی سے شادی کرنی ہے۔''

میرا تجسس اور زیادہ بڑھ گیا۔ تین دن تک جسبیر اور میرے بیچ میں خاموشی چھائی رہی۔ چوتھے دن میں سورن لتا بھابھی کی بہن چندر کلا عرف چندر عُرف چندا سے ملا۔ میں نے تمام حالات اس کے سامنے رکھ دیے۔ اور اپنے دل کی بات اس سے کہہ ڈالی:

''مجھ سے شادی کروگی؟''

چندا تب انٹر میں تھی۔اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔اور تعجب سے پوچھا:

''کیا کہہ رہے ہو؟''

''سوچ کر جواب دینا۔''میں نے اطمینان سے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

اگلے روز چندا اپنی بہن کے گھر آئی۔اس وقت سیما، راجیو، ونیتا بہت چھوٹے تھے۔ ونیتا تو گود میں تھی۔چندا نے آہستہ سے پوچھا:

''تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟''

''میں نے کہا: بالکل نہیں۔''

''تمہارے بھائی، ماں، باپ مانیں گے؟''

چندا نے شک کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔''میں مطمئن تھا۔

دوسرے دن میں گاؤں چلا گیا۔بابا سے بات کی تھوڑے بہت منع کرنے کے بعد وہ راضی ہوگئے۔انھوں نے ایک شرط رکھی:

''دیوتا کے لیے سور کی پوجا شادی سے پہلے ضروری ہے۔''

میں نے اس بات سے صاف انکار کر دیا کیوں کہ میں کسی دیوتا کی پوجا پر یقین نہیں کرتا۔اس بات سے وہ ناراض ہوگئے۔میری بے یقینی نے ان کی عقیدت پر گہری چوٹ لگائی تھی، جس کے لیے وہ مجھے معاف کرنے کو تیار ہی نہ تھے۔ابھی تک شاید پوجا میں شامل نہ ہونے کو مرا بچپنا سمجھ کر مجھ پر کوئی خاص زور نہیں ڈالتے تھے۔لیکن شادی جیسے موقع پر میری مخالفت دیکھ کر وہ بہت غصہ ہوئے۔اور یہ ناراضگی عمر کے آخری حصہ تک برقرار رہی اور میں ان کی بات ماننے کو قطعی تیار نہیں تھا۔

شادی کے بعد چندا کو ساتھ لے کر چندر پور جانا تھا۔مخالفت کے باوجود بھی گھر والوں نے چندا کو قبول کیا تھا لیکن ماما اس بات سے بہت خفا تھے۔اور جسبیر بھی ماما کے ساتھ تھا۔ سرجن اس لیے ناراض تھا کہ میں اس کی سالی سے شادی کر رہا ہوں۔اس شادی کو توڑنے

میں ماما نے ہیم لال کو مہرے کی طرح استعمال کیا، جس میں ہیم لال کامیاب نہیں ہوا۔ ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ مجھے اس بات کی بھی تکلیف تھی کہ میں نے ایک اچھے دوست کو کھو دیا تھا۔

شادی کے بعد چندا کو ساتھ لے کر چندر پور جانا تھا لیکن سب سے پہلے جس پریشانی کا سامنا کرنا پڑا وہ تھی مکان کی۔ اور اس وقت تک مجھے سرکاری کالونی میں گھر بھی نہیں ملا تھا۔ میں ہاسٹل میں ہی رہ رہا تھا۔ اس وقت میرے کمرہ میں جے کشن رہتا تھا۔ تب میں نے اپنے دوست اجے سنہا کو ایک خط لکھا۔ کچھ دن پہلے میں اس کے ساتھ رہ چکا تھا۔ اس نے جواب میں لکھا:

''بیوی کو لے کر آجاؤ... انتظام ہو جائے گا۔''

دلی میں سکھن سنگھ تھا۔ آر کے پورم میں رہتا تھا۔ انٹر تک 'تیاگی انٹر کالج' میں میرے ساتھ تھا۔ کافی دھکّے کھانے کے بعد اسے بھی 'سروے آف انڈیا' میں نوکری ملی تھی۔ اس نے 'دکھن ایکسپریس' میں چندر پور کے لیے سیٹ پہلے ہی ہمارے لیے بک کر دی تھی۔

میں اجے سنہا اور اپنے آفس کے ساتھی سورج خرتڑ کو چندر پور پہنچنے سے پہلے ہی خط بھیج چکا تھا۔ رات کے دس بجے گاڑی چندپورا سٹیشن پر پہنچی۔ مجھے اس بات کی امید تھی کہ فیکٹری کی گاڑی ضرور لینے آجائے گی، پر کوئی نہیں آیا۔ رات کے دس بجے فیکٹری جانے کے لیے بس بھی ملنا مشکل تھی۔ ویسے بھی ہمارے ساتھ گھر گرہستی کا بہت سارا سامان تھا۔ وہ رات ہم دونوں نے چندر پور ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں گذاری۔ اسٹیشن ماسٹر نے خود ہی تالا کھولا اور ہمیں آرام کرنے کو کہا تھا۔ اس وقت اسٹیشن پر زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ اکا دکا مسافر ہی دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے ہی صبح ہوئی ہم پہلی بس پکڑ کر آرڈیننس فیکٹری آگئے۔ ہم نے سارا سامان ہاسٹل میں رکھا اور ہم دونوں سورج کے کوارٹر میں چلے گئے۔ سورج اس وقت تک دفتر جا چکا تھا۔ چندا کو بھی سوشیلا بھابھی (سورج کی بیوی) کے پاس چھوڑ کر میں بھی اسی دن دفتر چلا گیا۔ کیوں کہ میری چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ جب سورج کو اس بات کی خبر ملی کہ میں چندا کو اس کے گھر چھوڑ کر آیا ہوں تو وہ بہت خوش ہوا۔ سورج

سے میرے تعلقات بہت گہرے تھے۔ وہ بلاّ رشاہ (چندر پور کے پاس) کا ہی رہنے والا تھا۔ وہ اچھا انسان اور کھلے مزاج کا آدمی تھا، جو مجھے ہمیشہ متاثر کرتا تھا۔ ایک رات ہم سورج خرنڑ کے ہی کوارٹر میں رکے۔ دوسرے روز اجے سنہا کے گھر جانا تھا، سورج اس شام کو چندا سے ملنے بھی آیا تھا۔ سورج اور اس کی بیوی نے چندا کا استقبال بہت ہی اپنے پن سے کیا۔ اجے کے کواٹر میں جانے سے پہلے چندا نے ایک نئی ساڑی اپنے بکس سے نکال کر سوشیلا بھابھی کو بہت ہی عزّت سے دی تھی لیکن انھوں نے وہ ساڑی لینے سے انکار کردیا۔ میں ان کی بہت ہی عزّت کرتا تھا اور چندا نے بھی عزّت کے ساتھ ہی ساڑی دینے کی کوشش کی تھی لیکن ان کے انکار نے جیسے لمحہ بھر میں سب کچھ بکھیر کر رکھ دیا۔ چندا نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ان سے گزارش کی:

''بھابھی جی اگر یہ ساڑی پسند نہیں ہے تو دوسری لے لیجیے۔''

لیکن وہ دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گئیں۔ اور کسی سے بات بھی نہیں کی۔ جب میں نے سورج سے پوچھا تو اس نے بھی کوئی خاص جواب نہیں دیا۔ صرف اتنا کہا:

''نہیں لیتی ہے تو نہ لے تم جی چھوٹا نہ کرو، خوشی خوشی اپنی گرہستی چلاؤ ہمیں خوشی ہوگی۔''

اس لمحہ میری آنکھیں بھر آئیں اور ہم لوگ اجے کے فلیٹ میں آگئے۔ سورج ہی ہم دونوں کو چھوڑنے آیا تھا لیکن سوشیلا بھابھی کے برتاؤ سے سب لوگوں کا دل اکھڑ سا گیا۔ میں نے بھابھی سے اچھا سلوک کیا لیکن وہ نہ جانے چندا کی کس بات سے خفا ہوگئیں کہ آج تک پتا نہیں چلا۔ سورج اکثر اپنے بیٹے آیرتم کے ساتھ چندا سے ملنے آتا تھا لیکن ہم لوگ اس کے گھر بہت کم جاتے۔

اجے سنہا نے اپنا فلیٹ ہمیں دے دیا۔ اور خود آنند شرما کے ساتھ رہنے لگا۔ آنند کی بیوی ان دنوں بچے کی پیدائش کے لیے ماں کے یہاں گئی ہوئی تھی۔ اسی ہفتہ اجے کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ اسے بھی اپنے گھر بنارس جانا تھا اس کی شادی کی خبر سے جہاں ہمیں ایک طرف خوشی ہوئی تو دوسری طرف تکلیف بھی کیوں کہ اب اس کا فلیٹ بھی خالی کرنا تھا۔

لیکن اجے نے جاتے جاتے کہا:

''والمیکی فکر مت کرنا اگر اس دوران تمہیں مکان نہ ملا تو ہم ایک ساتھ رہیں گے۔ایک کمرہ میں تم رہنا اور ایک میں ہم۔کھانا ساتھ پک جایا کرے گا۔''

اس کا یہ اپنا پن دیکھ کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔لیکن کافی بھاگ دوڑ کے بعد مکان مل ہی گیا۔ وہ بھی دو کمروں کا جو میرے نام سے ہی ملا تھا۔ 31 سی، ٹائپ 11۔سیکٹر 5،اجے سنہا کے فلیٹ کے بالکل ہی نزدیک۔ ہم ایک ہفتہ کے اندر اندر اپنے فلیٹ میں آ گئے۔اجے بھی شادی کے بعد سیدھا ہمارے ہی فلیٹ پر آیا۔کئی دن تک وہ دونوں ہمارے ساتھ رہے۔حقیقت میں وہ دن کتنے اچھے تھے۔اجے اور میرے بیچ میں ایک ایسا رشتہ بن گیا تھا،جس کی مٹھاس ابھی تک میرے ذہن میں موجود ہے۔اور سنہا کی بیوی بھی بہت ہی خوش اخلاق عورت تھیں ۔زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے لیکن دونوں کے لیے میرے دل میں ہمیشہ ایک ایسا خیال رہا جس میں کوئی میل یا گندگی نہیں ہے۔

انھیں دنوں دلتوں کے بیچ سماجی کام کے کئی منصوبوں کو اہم رخ بھی دیا گیا۔مہاراشٹر میں ڈاکٹر امبیڈکر اور جیوتی با پھولے نے جو زمین تیار کی تھی،اس سے لاکھوں لوگوں کو طاقت ملی تھی،اور سماجی زندگی میں اتر پڑے تھے۔اس فکری تحریک نے میری تخلیقات کو ایک الگ ہی رخ عطا کیا۔

چندر پور سے ہی ہم نے 'ہم جھرنا' نام کا ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔اس کے ایڈیٹر تھے جگدیش راہی۔کئی شمارے اس رسالے کے کئی شمارے نکلے لیکن یہ اچانک بند ہو گیا۔ راہی میرے اچھے دوست تھے اور نغمہ نگار (گیت کار) بھی بہت اچھے تھے۔لیکن ان کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ ہوا کہ ان کو کوئلہ کی کان والی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔نوکری گئی تو رسالہ بھی بند ہو گیا۔اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ جگدیش راہی نے سب کچھ سمیٹ لیا اور چندر پور چھوڑ کر چلے گئے۔یاد رہ گئے تھے صرف وہ دن جب ان کے میٹھے گیتوں کے بیچ چندر پور سے ہندی کے اس اہم رسالہ کی منصوبہ بندی کی تھی۔ہم نے ایک ساتھ کام کیا۔رات بھر جاگ جاگ کر پروف پڑھے تھے۔بھیانک گرمی سے جھلستے ہوئے اس شہر میں ''ہم جھرنا''

کیخیال حقیقت میں راہی جیسے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔

مراٹھی شاعر لوک ناتھ یشونت بھی انھیں دنوں چندر پور واپس آ گئے تھے آرڈیننس فیکٹری کالونی میں آتے۔ بہت سے پروگرام میں ہم ساتھ جاتے وہ کچھ تکلف والے انسان تھے لیکن سنجیدہ اور خیالات کے پابند۔ چندر پور میں رہتے ہوئے ان لوگوں کی وجہ سے مجھے کبھی بھی پرایہ پن محسوس نہیں ہوا بلکہ امرناتھ ورمانے تو دوستی کے ساتھ ساتھ ایک رشتہ بھی بنالیا تھا۔ وہ چندا کے بڑے بھائی بن گئے تھے اور مجھے اکثر جیجا جی کہہ کر ہی بلایا کرتے۔ یہ سب لوگ بہت ہی پیارے تھے۔ پدما بھابھی نے جو پیار مجھے اور چندا کو دیا تھا، وہ ہماری زندگی کی کبھی نہ ختم ہونے والی دولت ہے۔

چندپور میں مجھے ایسے دوست ملے، جو اپنوں سے زیادہ اپنے تھے جس کے بغیر میری شخصیت نامکمل ہے۔ جن کے پیار اور اعتماد نے مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا ہے۔

سال 1978ء میں 'دلت پینتھر' نے مارواڑا یونیورسٹی کا نام بدل کر ڈاکٹر امبیڈکر یونیورسٹی کردینے کے لیے بمبئی میں بہت بڑا جلوس نکالا۔ جس میں پورے مہاراشٹر کے دلت مزدور بمبئی اسمبلی ہاؤس کے سامنے جمع ہوئے تھے۔ اسمبلی ہاؤس میں نام کے تبدیل ہونے کی تجویز پیش کی گئی تھی لیکن اونچی ذات والوں نے اس تجویز کی مخالفت کی، جگہ جگہ توڑ پھوڑ، دنگے شروع ہوئے۔ احمد پور، اورنگ آباد، ناگپور، سولاپور، بمبئی، ناسک اور امراوتی وغیرہ میں تو حالات بہت ہی خراب تھے۔ مارواڑ میں دنگوں کا اثر کچھ زیادہ ہی تھا۔ دلت بستیاں پھونکی جارہی تھیں۔ سیکڑوں لوگ مارے جا چکے تھے۔ اخباروں میں چھپی خبریں دل دہلادینے والی تھیں۔

دلتوں نے نام کی تبدیلی کو اپنی پہچان کی علامت بنالیا تھا۔ ناگپور میں آگ لگنے کے بہت حادثات ہوئے۔ چندر پور میں بھی جلوس نکلا۔ مہاراشٹر سرکار نے نام بدلنے کے فیصلے کو واپس لے لیا۔ تب دلتوں کو سرکار کے اس فیصلے سے ناامیدی ہوئی لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ لگاتار اس تحریک کو آگے بڑھاتے رہے۔ انھوں نے اپنی ساری طاقت اس تحریک میں جھونک دی۔ باپوراؤ جگ تاپ، جوگیندر کواڑے کے متاثر کردینے والی تقاریر

دلتوں میں حوصلہ پیدا کر رہی تھیں۔ ہزاروں سالوں کی نفرت ایک بار پھر پورے طور پر دکھائی دینے لگی۔ اس تحریک کو میں نے بھی بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میرا رواں رواں اس تحریک کو محسوس کر رہا تھا۔ ہندوستانی سماج کا یہ نفرت بھرا قانون انسانیت کی اہمیت سے انکار کر رہا تھا۔ ان کے خیال میں امبیڈکر پیدائشی مہار (چمار) تھے۔ چاہے ان کی علمیت آسمان کی بلندی پر ہی کیوں نہ چلی جائے۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی زندگی میں دلتوں کے لیے جو لڑائی لڑی تھی وہ ایک ایسی جنگ تھی جس نے دلتوں میں نئی امید پیدا کی تھی۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے سیاسی پارٹی جو کہ 'ری پبلکن' نام سے بنائی تھی ان کے ختم ہونے بعد ہی یہ پارٹی بہت سے ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ ہر ایک لیڈر میں خود کو بابا صاحب کا وارث مان کر صدر بن جانے کی ہوس بھری ہوئی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک لیڈر کی ایک الگ پارٹی بن گئی۔ 'دلت پنتھر' نے مہاراشٹر کی دلت تحریک کو ایک نیا موڑ دیا تھا۔ دلت پنتھر میں لیڈر اور ملازمین مارکسی، امبیڈکر وادی خیالات کو جوڑ کر ایک نیا تجربہ کر رہے تھے۔ جس کی روشنی میں تمام مہاراشٹر ایک بار پھر دلت تحریک کی شروعات دیکھ رہا تھا۔ لیکن یہ منصوبہ بھی بری طرح ناکام رہا پھر بھی دلت پنتھر میں جو ادیب اچھے تھے انہوں نے مراٹھی دلت ادیب کو نئے تیور دیے تھے۔ روایتی ادب کے بر خلاف یہ ادب زیادہ زندہ اور ترقی یافتہ تھا۔ اور صحیح معنوں میں نیا بھی۔

ان ہی دنوں گجرات میں ریزرویشن کے خلاف سخت رویّہ اپنایا گیا۔ دیہاتی علاقوں میں حق کے خلاف بے انتہا ظلم ڈھائے گئے۔ چاروں طرف تشدّد کی آگ تھی۔ گاندھی نگر، بڑودا وغیرہ شہروں میں گاندھی کی مورتیوں کے نیچے کھڑے ہو کر ریزرویشن کے مخالفین دلتوں کے درمیان نفرت پھیلا رہے تھے۔ جس کا اثر مہاراشٹر میں دکھائی دیا۔ سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں دلت افسروں، مزدوروں ظلم و زیادتی کے واقعات بڑھنے لگے۔ اونچی ذات والوں نے 'شوشت کرمچاری سنگھ' جیسے نام سے ایک تنظیم بنائی تھی، جو منظّم طریقے سے دلتوں کے خلاف سازشیں رچ رہے تھے۔ چاروں طرف ناامیدی اور دہشت کا ماحول تھا۔ دلت مزدور ہی نہیں افسر بھی ڈرے ہوئے تھے۔ ان کی کوئی تنظیم یا جماعت بھی نہیں

تھی۔ طاقتور نہ ہونے کی وجہ سے وہ اکیلے اکیلے اپنی مشکلوں میں الجھے ہوئے تھے۔اتحاد کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کا اعتماد ڈگمگانے لگا تھا۔اونچی جماعت والوں کی بنائی گئی تنظیم 'شوشت سنگھ' پوسٹر، پرچوں کے ذریعہ دلتوں میں نفرت بھر رہے تھے۔ ایسا ہی ایک پرچہ آرڈینس فیکٹری چندر پور میں بھی تقسیم کیا گیا تھا۔جس کی وجہ سے جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔ اوپر سے تو بس خاموش سا لگ رہا تھا لیکن اندر ہی اندر جیسے کچھ پک رہا ہو۔ایسے دنوں میں خاموشی کا مطلب ہے اپنی خودی یا اپنی پہنچان کو مٹالینا۔

فیکٹری کے گیٹ کے پاس ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا گیا،جس میں کیندر یہ ودیالیہ (K.V) کے پرنسپل شری گوڈانے، پی۔سی کانبلے ،افسران اور مختلف تنظیموں کے ہزاروں کارکنان نے حصّہ لیا۔اس جلسہ میں تمام لوگوں نے ایک ساتھ ہو کر اونچی ذات کی طرف سے چلی گئی سازش کا جواب دینے کی تجویز پاس کی گئی تھی۔ دوسرے دن پرچے بانٹے گئے ،جس کا اثر بہت جلد ہی دکھائی دیا۔'شوشت سنگھ' کے پرچے پر حکومت کو یقین تھا لیکن دلتوں کا پرچہ مخالف ہوتے ہی انتظامیہ چوکنّی ہوگئی۔ دلت لیڈروں سے پوچھ تاچھ ہونے لگی۔ کافی بحث اور جد و جہد کے بعد انتظامیہ نے دلتوں کے خلاف ہونے والے مہم کو روکنے کا یقین دلایا تھا۔

تمام سرگرمیوں کا مرکز سُم تھاڑا گاؤں تھا۔وہاں مجلس جمتی تھی اور 'شوشت سنگھ' سے چھٹکارا پانے کے منصوبے تیار کرتے ،تاکہ دلتوں کارکنان کے حوصلے اور ہمّت کو ٹوٹنے سے بچایا جا سکے۔ان حالات میں ہمت جیسے پست ہو گئی تھی۔فرقہ وارانہ طاقتیں اپنی سازشوں میں کامیاب ہو رہی تھیں۔ وہ دلت کارکنان کے بیچ نفرت کا بیج بو چکے تھے۔ جسے 'مزدور ایک زندہ آباد' کے نعرے لگانے والی جماعت بھی نہ روک پائی تھی۔ دلت اور غیر دلتوں کے درمیان یہ نفرت کی کھائی لگا تار بڑھ رہی ہے جس کو پاٹنے کا ارادہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ جب دلت اپنے لیے اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے تو اس پر ذات پات کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔یہ الزام لگانے والے وہ لوگ ہوتے ہیں، جو ذات پات کے کٹّر ماننے والے ہیں، یہ ایک چال ہے۔رسم و رواج کو ماننے والے اور اپنی حیثیت بنائے رکھنے والوں کی ،جو دلتوں کے

لیے ہمیشہ مشکوک ہوتے ہیں۔

مہاراشٹر کی شہری اور دیہی دونوں جگہ دلت بستیوں کی حالت دیکھ کر دل تکلیف سے بھر جاتا تھا۔ مہار بستیوں میں ڈاکٹر امبیڈکر نے جو احساس جگایا تھا۔اس کے نتیجہ میں مہاروں میں تعلیم کی شروعات ہوئی تو تھی لیکن پھر بھی مانگ۔ مہتر وغیرہ تعلیم سے دور ہی تھے۔ دلتوں میں ایک جنون تھا۔ان کی لڑائی اور محنت دیکھ کر امید پیدا ہوئی تھی لیکن سرکاری عہدہ داروں میں بھی ذاتی بھید بھاؤ کا جذبہ تھا۔ مہار، مانگ، چمار اور مہتر تمام طرح کے بھید بھاؤ بھلانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اندرونی طور پر وہ خود بھی اس احساس سے جڑے ہوئے تھے۔ایسے لمحوں میں میرا دل ٹوٹ جاتا۔ مہتر بستیوں میں جانے کے وقت ان لوگوں کی ہچکچاہٹ صاف دکھائی دیتی تھی۔

ڈاکٹر امبیڈکر کی یوم پیدائش کے موقع پر بھی زیادہ تر مہار ہی دکھائی دیتے تھے۔ باباصاحب بھیم راؤ امبیڈکر نے بودھ مذہب کی تعلیم لی تھی۔ مہار بھی ان کے ساتھ بودھ ہی ہو گئے تھے۔لیکن ایسے بہت سے خاندان تھے، جو بودھ ہو کر بھی ہندو دیوی دیوتاؤں میں الجھے ہوئے تھے۔ مہتر بستیوں میں تو باباصاحب کا پیغام پہنچا ہی نہیں تھا۔ جو پہنچا تھا وہ بھی ذات کے ساتھ۔ جب بھی کسی مہتر (والمیکی) سے بات ہوتی تو وہ چونک کر میری طرف دیکھتا۔ باباصاحب کے لیے ان کے دل میں عزت تھی لیکن تحریک کے کارکنا اور لیڈران کے دل میں یقین پیدا نہیں کر پائے تھے۔وہ مہتر تھے، سماج میں سب سے نیچے۔ یہ احساس انھیں تحریک سے جڑنے سے روکتا تھا۔ وہ دلتوں کا ساتھ دینے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔دلت تحریک کی اس اندرونی مخالفت نے انھیں کمزور کر دیا ہے جس کا اثر سیاسی سطح پر بھی دکھائی دیتا ہے۔ مہاراشٹر کے مہتر اور اتر پردیش کا چوہڑا والمیکی ایک دوسرے سے مختلف نہیں تھے۔بس زبان کو چھوڑ کر باقی تمام چیزیں ایک جیسی ہیں۔وہ بھی سور پالتے ہیں بالکل ویسے ہی دیوی دیوتاؤں کی پوجا میں سور اور شراب چڑھاتے تھے۔تمام رسم ورواج بھی ایک جیسے ہی ہیں۔ دلتوں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس میں ڈاکٹر امبیڈکر کا پیغام نہیں پہنچا تھا۔ان کی نفرت صدیوں سے چلی آ رہی تھی، جو بہت زیادہ ڈراؤنی تھی۔اس لیے اپنی پہچان کو چھپا کر

رکھنا ان کی مجبوری تھی۔ کئی لوگ تو ایسے تھے جو تھے تو دلت لیکن اونچی ذات والوں کے ساتھ رہنے کے لیے دلتوں سے دور بھاگتے تھے۔ ان کے خلاف کام کرتے، ان کے کاموں کی تمام خبریں ان لوگوں تک پہنچاتے تھے۔

آرڈیننس فیکٹری چندر پور کالونی میں امبیڈکر کی یوم پیدائش خوب دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ میں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ نظمیں، ڈبیٹ، پوسٹر، تصویروں کی نمائش، ڈرامہ، نکڑ ناٹک وغیرہ کیے تھے۔ ہماری انجمن 'میگھ دوت ناٹیہ سنستھا' کے بڑے عہدے دار ایسے دنوں میں ضروری کاموں میں الجھ جاتے۔ امبیڈکر کی یوم پیدائش کے موقع پر غائب ہی ہو جاتے تھے۔ گنیش چترتھی، شیواجی جینتی، جنم آشٹمی، رام نومی کے موقع پر ہی وہ محنت ولگن سے سارے پروگرام کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ حالت اکثر ہمارے بیچ ہونے والے بھید بھاؤ کو نمایاں کرتی تھی۔ میری کوشش یہ رہتی کہ ہم سب ان سب باتوں پر غیر جانب دار ہو کر بحث کریں لیکن آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنے سے وہ سب کتراتے تھے۔ پیٹھ پیچھے باتیں بناتے۔ امبیڈکر کے لیے غلط الفاظ بولا کرتے۔ میرا ان سب باتوں سے خون کھولنے لگتا۔ آخر کار ہوا یہ کہ میں نے ان تمام مذہبی جشن کا بائیکاٹ کر دیا۔ اور ایسے لوگوں کو تلاش کیا جو تبدیلی کے خواہش مند تھے۔ کئی دلت ڈراموں کو اسٹیج بھی کیا۔ ایسے ہی ایک ڈرامہ کا نام 'بمبئی نگری' کیا، جس کو دیا پوار نے لکھا ہے۔

ناگپور یونیورسٹی کا ایک اجلاس چندر پور میں ہوا تھا۔ وہاں بھی 'میگھ دوت ناٹیہ سنستھا' کا ایک ڈرامہ اسٹیج پر پیش کیا گیا تھا۔ کئی ادیبوں، پروفیسروں اور دانشوروں نے اس پر اپنی رائے ظاہر کی تھی۔

گاؤں سے خط آیا، ماں بیمار ہے۔ میں اور چندا گاؤں چلے گئے۔ ایک ہفتہ تک رکے بھی۔ ماں کی طبیعت بھی ٹھیک ہونے لگی لیکن سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ ماں کو اس حالت میں دیکھ کر میں اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کہیں کچھ ہے جو بکھر رہا ہے۔ جیسے سب کچھ مٹھی سے ریت کی طرح پھسل رہا ہے۔ ہم چندر پور آ گئے اور ایک ہفتہ بعد ماں گذر گئی۔ لیکن ماں کے گذرنے کی خبر مجھے دو مہینوں بعد ملی۔ گاؤں سے دیویندر نے

پوسٹ کارڈ لکھا تھا۔ جو گھومتے گھومتے دو مہینوں بعد ملا۔ کارڈ پڑھ کر میں خود کو سنبھال نہیں پایا۔ ماں کے آخری رسومات میں بھی شامل نہیں ہو پایا۔ اس بات کی تکلیف مجھے کانٹے کی طرح سینے کو چھلنی کر رہی تھی، جس کو میں اتنے سالوں بعد بھی بھول نہیں پایا ہوں۔ بابا نے خط بھیجوا دیا ہوتا تو شاید میں وقت پر پہنچ جاتا... لیکن شکایت کرنے کا بھی کوئی مطلب نہیں بنتا۔ ماں کے گذر جانے کے بعد بابا بھی بیمار رہنے لگے تھے۔ مجھے لگاتار یہ احساس ٹیس مار رہا تھا کہ کہیں ماں کی طرح بابا بھی نہ گذر جائیں... اور ہوا بھی وہی... انھیں دیکھنے گیا۔ جس دن واپس آرہا تھا اسی روز ان کا انتقال ہو گیا۔ میں اس وقت شاید ٹرین میں تھا۔ چندرپور آکر کئی دن بعد خط ملا تھا۔ ماں اور بابا کے جنازے کو کاندھا دینے کا مجھے موقع نہیں ملا، جس کو بنانے میں وہ محنت کرتے رہے وہی ان سے اتنا دور ہو گیا تھا۔ یہ ایک ایسی تکلیف ہے جسے میں اپنے دل کے تہہ خانوں میں چھپا کر بیٹھا ہوں۔

کانپور میں آر۔ کمل تھے، جو 'نرنائک بھیم' رسالہ نکالتے تھے۔ میری تخلیقات تقریباً ہر شمارے میں شائع کرتے تھے۔ ایک پروگرام میں انھیں چندرپور بلایا تھا۔ وہ محنتی آدمی تھے۔ ہندی میں ڈاکٹر امبیڈکر کے خیالات کو پھیلا رہے تھے۔ ہندی دلت رسالوں میں 'نرنائک بھیم' نے ایک خاص جگہ بنالی تھی۔ دلت ادب لکھنے والوں کو ایک پہچان ملی تھی۔ مہاراشٹر کے دورے سے واپس آکر انھوں نے لکھا تھا کہ: ہندی ریاستوں میں دلت فکر کا ایسا اُبھار ابھی نہیں آیا ہے۔ اس موضوع پر ہمیں اور کوشش کرنی ہوگی۔

ایسے ہی موہن داس نیمش رائے بھی آئے تھے۔ کئی جگہ ان کے پروگرام تھے۔ نیمش رائے ان دنوں آزاد ہو کر لکھ رہے تھے۔ میری سرگرمیاں صرف مہاراشٹر تک محدود نہیں تھیں۔ مدھیہ پردیش کے کئی شہروں میں دلت پریشانیوں کو لے کر پروگرام ہوئے تھے۔ جیسے جیسے دلت تحریک میں میرا رجحان بڑھ رہا تھا، میرے آس پاس کے لوگ مجھے شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ جیسے کہ میں ان کی مقبولیت ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایسے لوگوں میں زیادہ تعداد اونچی ذات والوں کی ہی تھی۔ اس کا اثر دفتر کے ساتھیوں میں بھی دکھائی دینے لگا تھا۔

ضلع چندر پور کا ایک گاؤں تھا سدّ ور۔ جس میں ترقی اور تہذیب کا نام ونشان نہیں تھا۔ عورتیں اوپری حصہ پر کوئی بھی کپڑا نہیں پہنتی تھیں۔ کھانا پینا بھی نچلی سطح کا تھا۔ کھیتی کے نام پر صرف جوار اور موٹا چاول ہی ملتا تھا۔ وہ بھی صرف بارش پر منحصر تھا۔ ان گاؤں میں گھوم لینے کے بعد جس ہندوستان کو دیکھا تھا، وہ بے حد غریب اور بدعقیدگی میں ڈوبا ہوا تھا۔

ایسے ہی ایک گاؤں میں ایک جادوگر نے کھیت کی فصل کو بڑھانے کے لیے ایک بچے کو ذبح کر دیا تھا۔ ہم پانچ چھ دوست اس گاؤں میں گئے۔ مراٹھی اخبار 'لوک مت' نے اس خبر کو چھاپ کر پورے ملک کی توجہ اس واقعہ کی طرف کھینچ لی۔ پولس چوکنّی ہوگئی اور اس جادوگر کے ساتھ کئی اور گاؤں والے بھی پکڑے گئے تھے۔ ان حادثات نے مجھے لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ تاریخ پر فخر کرنے بجائے عوام کی تکلیف کو اپنی تحریروں میں اتارنا زیادہ بہتر لگا۔

سال 1984ء جنوری کا مہینہ تھا۔ امراوتی ضلع کے ملکہ پور میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا کہ جو تنگ ذہنیت کی خرابی کی ایک ناگوار علامت تھی۔

ساتویں کلاس میں مراٹھی کتاب کی سبق میں ڈاکٹر امبیڈکر پر ایک باب تھا۔ ایک برہمن استاد کے حکم پر تمام بچوں نے اپنی اپنی کتاب کے اس سبق کے صفحات کو پھاڑ دیا۔ کلاس میں مہار ذات کے بھی کچھ بچے تھے۔ جنھیں بابا صاحب کے سبق کو پھاڑ دینا صحیح نہیں لگا۔ تو ان بچوں نے کتاب کے وہ صفحات چپکے سے جا کر کوڑے دان سے اٹھا لیے۔ اور اپنے گھروں میں جا کر دکھائے۔ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی تو مخالفت شروع ہونے لگی۔ کسی نے اس واقعہ کے تمام حالات پھٹے ہوئے صفحات کے ساتھ 'لوک مت' (مراٹھی) اخبار، ناگپور کے دفتر بھیج دیے۔ لوک مت نے ان صفحات کی تصویر مع خبر چھاپ دی۔ جیسے ہی خبر چھپی اس کے بدلے میں جگہ جگہ مخالفت، جلوس اور جلسے ہونے لگے۔ دلتوں کی اہمیت کی علامت بن گیا تھا یہ واقعہ۔

بھدراوتی میں بھی ایک بہت بڑا جلسہ ہوا تھا۔ کئی ہزار لوگ اس جلسہ میں آئے تھے۔ بھدراوتی کے آس پاس کے گاؤں سے جوق در جوق (جھتے کے جھتے) آئے۔ اِس اجلاس کو مخاطب کرنے کا موقع مجھے ملا۔ زیادہ تر بولنے والوں نے مراٹھی ہی میں تقریر کی تھی۔ میں ہی

صرف ہندی میں بولا تھا۔ میرے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ بھیڑ میں چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں۔ دلت تحریک سے جڑنے کا احساس مجھے تیزی سے محسوس ہو رہا تھا۔ 'وِدروپ چہرا' کے عنوان سے ایک نظم انھیں دنوں لکھی تھی، جو کئی رسالوں میں شائع ہوئی۔ یہ تحریک دن بہ دن تیز ہو رہی تھی۔ کئی جگہوں پر اونچی ذات والوں نے دلتوں کے اجلاس اور جلوس پر پتھراؤ بھی کیے۔ لیکن پولس چوکنّی تھی۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے بھی اس استاد کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ جگہ جگہ ممانعت کے باوجود اجلاس ہو رہے تھے لیکن سرکاری طور پر معاملے کو رفع دفع کرنے کی کوشش جاری تھی۔ دلتوں میں غیرت جاگنے لگی تھی۔ اس حادثہ نے مجھے بہت گہرائی تک متاثر کیا۔ میرا زیادہ سے زیادہ وقت دلتوں کی بستیوں میں گذرنے لگا تھا۔

آرڈیننس فیکٹری کی کالونی کے پاس 'سُم ٹھاڑا' گاؤں تھا۔ اس کی تحصیل بھدراوتی تھی جہاں دلت بستیوں میں مختلف قسم کے سماجی پروگرام کیے جا رہے تھے۔ اسکول بھی کھولے گئے اور کئی ادارے بھی تھے۔ اومیش میشرام بھی بھدراوتی میں ایک ادارہ، اسکول اور لائبریری بھی چلا رہے تھے، جہاں ڈاکٹر امبیڈکر اور بودھ ادب آسانی سے دستیاب تھا۔ اُمیش میشرام اپنے پروگراموں میں اکثر مجھے بلایا کرتے تھے۔ بھدراوتی میں ایک قدیم بودھ گپھا بھی تھی جہاں بودھ پورنیما کو بودھ کی یوم پیدائش کے موقع پر بہت سے پروگرام ہوا کرتے تھے۔

اُمیش میشرام اور ان کے ساتھیوں نے مل کر بودھ ادب پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا تھا، جس میں مراٹھی کے بہت سے دلت ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ جیوتی لانجوار، بھیم سین دیٹے، لوک ناتھ یشونت، بھگوان ٹھگ وغیرہ سے پہچان ہوئی۔ ڈاکٹر گنگادھر پان تاوڑے جی سے خط و کتابت تو تھی لیکن کبھی ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک دن اچانک لوک ناتھ یشونت نے خبر بھیجی کہ پان تاوڑے گرو جی آمٹے کے آشرم میں ہونے والے 'آنند میلے' میں حصہ لینے آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر گنگادھر پان تاوڑے جی کو زیادہ تر ساتھی پان تاوڑے گرو جی ہی کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ آنند میلا تو مَیں ہر سال ہی جاتا تھا۔ برورا میں بابا آمٹے کا آشرم تھا۔ جہاں کوڑھ کے مریضوں کا علاج کر کے انھیں صحت مند بنایا جاتا تھا۔ اسی آشرم میں ہر

سال آنند میلا ہوتا تھا۔ مہاراشٹر کے تمام ادیب، دانشور اور ماہرین فن اس میلے میں شرکت کرتے۔ یہ دو دن تک چلتا۔ پ۔ ل۔ دیش پانڈے، مراٹھی کے مشہور ڈرامہ نگار، مزاح نگار، داستان گو سے یہیں ملاقات ہوئی۔ وسنت راؤ دیش پانڈے، بھیم سین جوشی، کشوری آموڑ کر وغیرہ کے گیت بھی اسی آنند میلے میں ہی سننے کا موقع ملا تھا۔ لوک ناتھ یشونت نے پان تاوڑے گرو جی سے ملوایا تھا اور وہ بہت نرمی سے ملے تھے۔ نہ کوئی دکھاوا، نہ تصنع اور نہ ہی علمیت کا ڈھونگ۔ ہندی کے کے لفظوں میں مراٹھی کا اثر تھا۔ بہت آہستہ آہستہ بات کرتے۔ لیکن ان کا ایک ایک لفظ گہرائی سے پُر ہوتا۔ کئی دن تک اس چھوٹی سی ملاقات کا نشہ میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ پان تاوڑے گرو جی نے میری نظموں کا ترجمہ مراٹھی میں کیا تھا۔ سچ مچ مجھ جیسے ایک انجان شاعر کے لیے بہت بڑی اہمیت کی بات تھی۔ 'اَسمتا درش' رسالے نے مراٹھی دلت ادبا کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم تیار کیا تھا جس نے نئے لکھنے والوں کو بلندی عطا کی۔ ڈاکٹر گنگادھر پان تاوڑے جی نے ایڈیٹر ہونے کے ناطے اپنی ذمہ داریاں پوری طرح نبھائی تھیں۔ دلت ادب میں ان کا ہاتھ میل کا پتھر ہے۔

قریشی سے ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی۔ مہاراشٹر پولس میں سب انسپکٹر تھے۔ ہم عمر، ملنسار، ادب میں دلچسپی رکھنے والے دبلے پتلے قریشی ناگپور کے رہنے والے تھے۔ بغیر خواہش کے پولس کی نوکری میں آ گئے تھے۔ پولس والا بننے میں انھیں وقت لگا تھا۔ آرڈیننس فیکٹری اسٹیٹ میں پولس چوکی کے انچارج تھے۔ پولس چوکی کے پاس ہی ڈی۔ ایس۔ پی لائن کے ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ دو چار ملاقات کے بعد ہی ہماری دوستی گہری ہو گئی۔ قریشی کو جب بھی رات کی ڈیوٹی کے لیے جانا ہوتا، یا دو چار دن کے لیے کہیں باہر جاتے تو اپنی بیوی کو میرے یہاں چھوڑ جاتے تھے۔ وہ بہت خوبصورت تھیں۔ پولس لائن میں انھیں اکیلا چھوڑنا قریشی کو گوارہ نہیں تھا۔ کئی بار تو رات کے دو ڈھائی بجے بھی اپنی بیوی کو میرے یہاں لے کر آئے تھے۔ چندا اور قریشی کی بیوی میں خوب پٹتی تھی۔ ان کے دو جڑواں بیٹے تھے... بہت ہی پیارے... چندا نے ان کا نام رام اور شیام رکھا۔ قریشی بھی انھیں اسی نام سے بلاتا تھا۔ ہم دونوں سے وہ بچے بھی کافی گھل مل گئے تھے۔ قریشی کے برابر

والے بنگلے میں ڈی۔ ایس۔ سی کے نئے کمانڈیٹ تبادلہ ہو کر آئے تھے۔ ضلع مظفر نگر کے ہی رہنے والے تھے۔ قریشی کو معلوم ہوا تو اس نے مجھ سے ذکر کیا:

''آپ کے ہی ضلع کے ہیں۔ آج شام کو آ جاؤ... ملاقات کرا دیں گے۔''

میں نے کوئی خاص خواہش ظاہر نہیں کی۔ قریشی اس بات کو تاڑ گیا۔ تھوڑا بہت ناراض بھی ہوا۔

''عجیب آدمی ہو اپنے ہی ضلع کا ایک آدمی اتنی دور سے مل جانے پر بھی تم خوش نہیں ہو۔''

میں نے کہا: ''کیا ہو گا مل کر؟ ملتے ہی پہلے 'ذات' پوچھے گا۔ ذات پتا چلتے ہی اس کے منھ کا ذائقہ بگڑ جائے گا۔ پھر بھلا مجھے کیا خوشی ملے گی۔''

قریشی نے عجیب سی کڑواہٹ سے کہا تھا:

''والمیکی، تم اس خول سے باہر کب نکلو گے؟''

اس روز ہم دونوں میں اس بات کو لے کر تلخ بحث شروع ہو گئی تھی۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ آزمائش کے طور پر ہی ملتے ہیں۔ قریشی کا ماننا تھا کہ فوج کے لوگ ان باتوں پر دھیان نہیں دیتے۔ تم ڈرے ہوئے ہو اس لیے ہر ایک آدمی پر شک کرتے ہو۔

اگلے روز میں چندا کے ساتھ قریشی کے بنگلے پر گیا۔ ان کی بیوی کے ہاتھ کی بریانی کھانے کا ذائقہ ہی کچھ الگ تھا۔ چندا کو وہیں چھوڑ کر میں قریشی کے ساتھ کمانڈیٹ کے بنگلے پر گیا۔ وہ برآمدے ہی میں مل گئے۔ قریشی نے میرا تعارف کرایا۔ صرف اوم پرکاش ہی نام بتایا تھا۔ والمیکی کو گول کر دیا۔ کمانڈیٹ صاحب بہت ہی گرم جوشی سے ملے۔ یہ سن کر خوش تھے کہ میں برلا کا رہنے والا ہوں۔ ابھی ٹھیک سے بیٹھے بھی نہیں تھے کہ انھوں نے کہنا شروع کیا:

''برلا تو تیاگیوں کا گاؤں ہے، آپ کس ذات سے ہیں؟''

میں نے قریشی کی طرف دیکھا، اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ سوال عمومی تھا۔ کمانڈیٹ کے چہرے پر اس وقت سکون تھا۔ میں نے جیسے ہی اپنی ذات 'چوہڑا' بتائی

ان کے چہرے سے بے سکونی ظاہر ہونے لگی۔اور ساتھ ہی بات چیت کا سلسلہ بھی تھم گیا۔ قریشی کے لیے یہ تجربہ بالکل نیا تھا۔میں نے قریشی سے کہا چلیں یا کچھ اور باقی ہے۔اس کا موڈ اکھڑ سا گیا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اچھا کمانڈیٹ صاحب چلتے ہیں...''

قریشی اور میں ان کے بنگلے سے باہر آگئے اور دوسرے دن کمانڈیٹ نے قریشی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔

''قریشی صاحب ہمارے ضلع میں انھیں (میری طرف اشارہ تھا) نیچ ذات مانا جاتا ہے۔گھر کی دہلیز میں ان کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔اور آپ کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ساتھ میں کھانا بھی کھاتے ہیں؟''

قریشی نے ان کی تقریر پر وہیں لگام لگائی۔اس روز کے بعد ان دونوں میں دعا سلام بھی ختم ہو گئی۔اس واقعہ کے بعد قریشی اور زیادہ میرے قریب آ گیا۔

چندر پور مہاراشٹر کا پچھڑا ضلع تھا۔اس کی سرحدیں مدھیہ پردیش اور آندھرا پردیش سے ملی ہوئی ہیں۔آٹھویں صدی عیسوی میں اس ضلع میں صنعتی ترقی کی رفتار بہت تیز تھی۔ کوئلے کا وافر مقدار میں ہونے والا خزانہ اس ضلع کو کوئلہ نکالنے والے علاقوں میں ایک اہم مقام عطا کیا تھا۔ان تمام حالات میں جرائم بھی بڑھے۔اسی دوران ضلع میں ڈکیتی اور راہزنی کی کئی وارداتیں ہوئی۔پولیس کی چوکسی بڑھ گئی۔شرد پوار پر سیاسی دباؤ تھا۔علاقائی پولس کی مدد کے لیے ریزرو پولس کو بھی لگا دیا گیا تھا۔

چندادہرادون چلی گئی تھی۔میں گھر میں اکیلا تھا۔رات کے دس بجے پولس کی جیپ رکنے کی آواز آئی۔میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو قریشی جیپ سے اتر کر زینے کی طرف بڑھ رہا ہے۔میں نے دروازہ کھولا۔قریشی نے اندر آتے ہی کہا:

''چلو آج تمھیں رات کی سیر کراتے ہیں۔''

میں نے پوچھا:''کہاں''

''چلو تو صحیح...'' قریشی نے اتاولے پن سے کہا۔

جیپ میں قریشی کے ساتھ ضلع کے ایک انسپکٹر ورما کے ساتھ چار پانچ اور سپاہی تھے۔ راستے میں قریشی نے انسپکٹر ورما سے تعارف کرایا۔ وہ ڈاکو انمولن فورس کے اہم انچارج تھے۔ آج کی رات پیٹرولنگ ڈیوٹی پر نکلے ہوئے تھے۔ اچانک میں پریشان سا ہوگیا۔ پتا نہیں قریشی کس مصیبت میں پھنسانے کے لیے جا رہا ہے۔ لیکن انسپکٹر ورما کے برتاؤ اور ان کی گفتگو نے مجھے پُرسکون کر دیا۔ اور میں ایک اور نئے تجربے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔ کالونی چیک پوسٹ سے جیپ بھدراوتی پیٹرول پمپ کی طرف مڑ گئی۔ جیپ میں تیل ڈلوانے کے بعد نیشنل ہائی وے پر آتے ہی جیپ کی رفتار تیز ہوگئی۔ ابھی چار پانچ کلومیٹر بھی نہیں آئے تھے کہ بروراکی طرف سے پولس افسر کی گاڑی کا سائرن سنائی دیا۔ جیپ میں بیٹھے تمام لوگ چوکنے ہو گئے۔ افسر کی گاڑی جیپ کے برابر آ کر رکی۔ وہ سب کے سب جیپ سے اتر کر ایک لائن میں کھڑے ہو گئے۔ مجھے غیر فوجی (شہری) کپڑوں میں دیکھ کر افسر نے قریشی سے پوچھا:

''جیپ میں کون ہے؟''

قریشی نے فوراً ہی جواب دیا: ''سر، تفتیش کے لیے برورالے جا رہے ہیں۔''

نہیں معلوم کہ قریشی کی بات کا افسر پر کتنا اور کیسا اثر ہوا لیکن میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ جیسے ہی افسر گیا سب کے سب جلدی سے جیپ میں گھس گئے۔ سب نے راحت کی سانس لی۔ لیکن میں ابھی بھی گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے قریشی سے پوچھا:

مجھے کس مصیبت میں پھنسا رہے ہو؟''

انسپکٹر ورما نے میرے ہاتھوں کا اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر مجھے اس بات کا یقین دلایا کہ:

''آج کی رات آپ ہمارے ساتھ ہیں، فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔''

اچانک جیپ ایک جگہ رکی۔ وہ سب جیپ سے اتر کر ادھر ادھر کھڑے ہو گئے۔ قریشی اور ورما بھی الگ جا کر کھڑے تھے۔ میں جیپ میں اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ آتے جاتے ٹرکوں، گاڑیوں کی جانچ پڑتال کرنے لگے۔ ایک ٹرک آندھرا پردیش سے لال مرچ لے کر آ رہا

تھا۔ ڈرائیور اور خلاصی کو پولس نے نیچے اُتار لیا۔ پولس انھیں ٹرک خالی کر کے دکھانے کی ضد کر رہی تھی۔ ٹرک ڈرائیور جانتا تھا کہ اس ویران جگہ پر ٹرک خالی کرنے کا مطلب کیا ہے۔ کچھ دیر کھینچا تانی کے بعد ڈرائیور نے ایک سپاہی کی مٹھی میں کچھ روپے ٹھونس دیے اور ٹرک خالی کرنے کا ڈرامہ اچانک ختم ہو گیا۔ آٹھ دس ٹرکوں کے ساتھ یہی ڈرامہ دہرایا گیا۔ میں جیپ میں بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ پولس کے اس رویہ پر قریشی سے کئی بار لمبی بحثیں ہو چکی تھیں۔ اس کے اپنے تجربات تھے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اوپر والوں کی نظر میں سست اور کام چور تھے۔

اسی وجہ سے ان کی اندرونی رپورٹ خراب ہو چکی تھی۔ یعنی اس کو بھی اس مشینری کا حصہ بننا پڑا تھا۔ قریشی کی دلیلوں کی حقیقت کو ناپنے کا کوئی آلہ میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے ایک بار کہا بھی:

”قریشی اپنے گناہوں کو چھپا لینے کا یہ اچھا طریقہ ہے، اپنوں سے اوپر والوں پر گناہ رکھ دو۔ ایسے ہی اوپر والے نیچے والوں کو گنہ گار بتا کر بچ جاتے ہوں گے؟“

رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہم واڑی پہنچے۔ واڑی میں ان دنوں میلہ لگا ہوا تھا۔ جیسے ہی میلے میں جیپ رکی سارے سپاہی ایک ایک کر کے ادھر ادھر ہو گئے۔ قریشی اور ورما چائے کی دکان کے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دکاندار نے ان کی خوب خاطر تواضع کی۔ کافی دیر تک بھی جب سپاہی واپس نہیں آئے تو ورما نے قریشی سے پوچھا:

”یہ سب کہاں گئے؟“

قریشی نے طنزیہ لہجہ میں کہا:

”کہاں جائیں گے... اپنی ماں بہنوں کے سنگ منھ کالا کرنے گئے ہیں۔“

اس میلے میں بہت سی ایسی عورتیں آتی تھیں جو دھندا کرتی تھیں۔ پولس یہ بات جانتے ہوئے بھی انھیں ہٹاتی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں سے وصولی ہی کی جا رہی ہو۔ میرا دل کڑوا سا ہو گیا۔ یہ سوچ کر ہی ایسے لمحوں میں مجھے لگتا تھا جیسے قریشی کے سر میں سینگ نکل

آئے ہیں۔ ایک انسان میں دو کردار ایک ساتھ تھے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ اگر قریشی پولس میں نہ ہوتا تا شاید ایک اچھا شاعر ضرور ہوتا۔

ایک دو بجے کے قریب ڈاکو انمولن فورس میلے سے نکل کر کچے راستوں پر نکل پڑی۔ ایک دو گاؤں میں معمولی سی تفتیش حاصل کر کے پھر سے پکی سڑک پر آ گئے۔ برورا تھانے میں جا کر رات بھر کی رپورٹ درج کرانے قریشی اور ورما اندر چلے گئے۔ میں جیپ کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے جھپکیاں لینے لگا تھا۔ قریشی نے جگاتے ہوئے پوچھا:

''چائے لوگے؟''

ایک سپاہی چائے کا کپ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ چائے کا گھونٹ بھر لینے سے تھوڑی دیر کے لیے نیند دور بھاگ گئی۔ صبح کے پانچ بجے قریشی نے مجھے میرے گھر چھوڑا اور خود پولس لائن میں واپس چلا گیا۔ میری آنکھوں میں تو پہلے سے ہی نیند بھری ہوئی تھی۔ جیسے ہی بستر پر لیٹا ویسے ہی نیند آ گئی۔ دن چڑھے آنکھ کھلی۔ اتوار کا دن تھا اس لیے کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ اٹھنے کے بعد میں نے اپنے لیے ایک کپ چائے بنائی اور اخبار کے صفحات کو الٹنے لگا۔ ایک سرخی پر میری نظر پڑی۔ کسی گاؤں میں ایک اور ڈکیٹی ہو گئی تھی۔ میری آنکھوں میں پوری رات کا منظر گھوم رہا تھا۔ ڈاکو انمولن پر نکلی فورس کے کارنامے میرے ذہن میں درج ہو گئے تھے۔

دو پہر کو ڈھائی بجے قریشی پھر آیا، اپنے اسی گروہ کے ساتھ۔ بڑے افسر نے اپنے آفس میں ان لوگوں کو بلایا تھا۔ دفتر شہر کی کالونی سے تیس کلو میٹر دور تھا۔ قریشی مجھے ساتھ لے جانے آیا تھا۔ میں نے منع کر دیا۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی اور مجھے اس کے ساتھ جانا پڑا۔ گھوڑ پیٹھ سے آگے ایک 15-14 سال کا لڑکا کندھے پر تھیلا لٹکائے پیدل آ رہا تھا۔ قریشی نے جیپ رکوائی اور اس لڑکے کو آواز دی۔ پولس کی گاڑی دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ قریشی نے اس کو ڈانٹتے ہوئے پوچھا:

''کہاں جا رہا ہے؟''

لڑکے نے سہمتے ہوئے جواب دیا: ''اپنے گاؤں۔''

''کون سا گاؤں؟'' قریشی نے پوچھا۔

''واڑی کے پا...لڑکے نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''واڑی کے پاس...اتنی دور پیدل''...قریشی کے اندر والا سپاہی ابھرنے لگا تھا۔

''ہو صاحب... پیسے نہیں ہے بس کے کرایے کے لیے۔'' لڑکے نے روتے ہوئے کہا۔

''کہاں سے آرہے ہو۔'' قریشی نے ایک سوال اور داغا۔

لڑکا گھبرا گیا۔ چندر پور کے کسی ہوٹل کا نام بتا رہا تھا، جہاں وہ کام کرتا تھا۔ ہوٹل مالک نے چھٹی نہیں دی اور نہ ہی چار مہینے کی تنخواہ۔ اس لڑکے کی جیب میں اتنے بھی پیسے نہیں تھے کہ وہ چندر پور سے واڑی بس سے جا سکے۔ اس کی ماں بیمار تھی، جس کی خبر سن کر وہ گھر جا رہا تھا۔ سوالات کے دوران ہی قریشی نے اس کو دو تین تھپڑ جڑ دیے۔

''جھوٹ بولتا ہے؟ سچ سچ بتا، ماجرا کیا ہے؟''

''صاحب می خر سانگ تو... شپتھ دیو چی'' (صاحب میں سچ کہتا ہوں.... خدا کی قسم)

تھپڑ لگتے ہی لڑکا مراٹھی بولنے لگا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے قریشی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا برتاؤ مجھے بہت عجیب لگا میں نے قریشی کو روکتے ہوئے کہا:

''تمہاری نظر میں یہ چھوٹا مکّار، چور یا ڈاکو... کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کی جیب میں پیسے نہیں ہے یہ سچ ہے... پھر بھی تم اسے پیٹ رہے ہو۔ ہوٹل مالک جس نے اس کی تنخواہ نہیں دی... اس کی طرف تم نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے ...اس کی مدد کرنے یا اس کی تنخواہ دلانے کا کوئی بھی قانون تمہاری پولس کے پاس ہے؟ یا صرف اسے مارتے رہنا قانون کی سزا ہے۔''

میرے اس ٹانگ اڑانے نے سبھی کو لمحہ بھر کے لیے حیران کر دیا اور اس لڑکے میں بھی تھوڑی ہمت آ گئی۔ اس نے قریشی کے پاؤں پکڑ لیے۔

''صاحب می خر بولتو'' (میں سچ بول رہا ہوں) چاہے تو ہوٹل میں جا کر پتا کر لو۔''

قریشی نے اسے جیپ میں بٹھایا۔ اس نے چندر پور ریلوے پُل کے پاس ہی ہوٹل کا

نام بتایا۔ جیپ ہوٹل کے ٹھیک سامنے جا کر رکی۔ ہوٹل میں چائے، ناشتے والوں کی بھیڑ لگی تھی۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوٹل کا مالک لڑکے کے ساتھ پولس کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ قریشی نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا۔ میں اس وقت قریشی کے پیچھے کھڑا تھا۔ قریشی نے رعب جمائے ہوئے پوچھا:

''یہ تمہارے ہوٹل میں کام کرتا ہے؟''

''جی صاحب... کیا کیا اس نے؟'' مالک نے معصوم بننے کی کوشش کی۔

''اسے تنخواہ کیوں نہیں دی۔'' قریشی نے سوال کیا۔

''میں ابھی دیتا ہوں صاحب... آج یہ کام پر نہیں آیا تھا'' ہوٹل مالک دراز کھولنے لگا۔

''کتنے مہینے کی تنخواہ نہیں دی اسے؟'' قریشی نے پوچھا۔

''صاحب آج کل دھندا مندا چل رہا ہے...'' مالک نے اپنی بات کو چباتے ہوئے کہا۔

نوکر میں ہمت آ گئی۔ اس نے قریشی سے کہا:

''صاحب چار مہینے سے ایک بھی پیسہ نہیں دیا۔''

ہوٹل مالک نے چار مہینے کی تنخواہ نوکر کے ہاتھ پر رکھ دی۔ لڑکے کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ قریشی نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ میں نے کہا:

''قریشی تمہارے کھاتے (حساب) میں ایک اچھا کام تو جڑا۔''

لڑکے نے ایک بار اور قریشی کے پیر چھو کر شکریہ ادا کیا۔

بلّار پور پیپر ملس، بلّار پور ہر سال ڈراموں کا پروگرام کراتا تھا۔ مراٹھی اور ہندی ڈراموں کا یہ پروگرام اداکاروں کے لیے ہی نہیں بلکہ بلّار پور اور آس پاس کے دیکھنے والوں کے لیے بھی اہم تھا۔ ہماری انجمن 'میگھ دوت ناٹیہ سنستھا' نے بھی اس میں 'آدھے ادھورے'، 'ہمالہ کی چھایہ'، 'سنہاسن خالی ہے'، 'پیسہ بولتا ہے' جیسے ڈراموں کو اسٹیج کیا تھا۔ کئی انعامات بھی حاصل کیے تھے۔ ان مقابلوں میں کئی بار مجھے بڑے بہترین اداکاری اور

ہدایت کاری کا بھی انعام ملا تھا۔ 'آدھے ادھورے' میں ساوتری جی اور 'ہمالہ کی چھایہ' کے اہم کردار کے لیے چندا کو بہترین اداکارہ کا انعام ملا تھا۔ ڈاکٹر ہیرالال ورما، کشن شرما جیسے رہنما دوست اسی پروگرام کے ذریعہ ملے تھے۔ ہیرالال ورما ایک اچھے ڈرامہ نگار تھے۔ ان کا لکھا ہوا 'مرسی کلینگ' کو بہت پسند کیا گیا تھا۔

کشن شرما آکاش وانی، ناگپور کے وِودھ بھارتی میں سینئر نشر نگار اور اسٹیج کے بہت مشہور فن کار تھے۔ انہوں نے ہی میرا آکاش وانی سے تعارف کرایا۔ بڑے بھائی کی طرح ان کا پیار بھی مجھے ملا۔ چندا ان کی بہت عزت کرتی تھی۔ مجھے یہاں تک پہنچانے میں کشن شرما جی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ وہ جتنے اچھے فن کار تھے اتنے ہی اچھے انسان بھی۔ انسانیت کی پرکھ کی قابلیت ان میں موجود تھی۔

ڈاکٹر ہنومنت نائیڈو سے چندرپور میں اڑڈیننس فیکٹری کی کالونی کے ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں اپنے سے لگے تھے۔ ناگپور یونیورسٹی میں شعبۂ ہندی کے صدر تھے۔ اچھے غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ نو بھارت ٹائمس میں مزاحیہ کالم بھی لکھتے تھے۔ گھریلو سطح پر بھی وہ بے حد قریبی تھے۔ جب بھی ناگپور جانا ہوتا ان کے گھر (پہلے موہن نگر، بعد میں صدر چلے گئے تھے) پر میں ضرور جاتا۔ وہ میرے ایک رہنما کی طرح تھے، جنہوں نے میری کمزوریوں سے باخبر کیا، میری زبان کو صاف کیا۔ انھیں کے تعلق سے میں وجے ویاس اور رنجن ترویدی (ناول نگار) سے متعارف ہوا۔ وجے ویاس بھی ان دنوں نو بھارت میں ایک ادبی تحریک چلا رہے تھے۔ نئے (ابھرتے) لکھنے والوں کے لیے یہ کالم بہت ہی اہم تھا۔ اسی میں وجے ویاس نے میری نظموں کو تجزیے کے ساتھ شائع کیا تھا۔

مشہور نغمہ نگار وریندر مشرا جی سے بھی میری ملاقات ڈاکٹر ہنومنت نائیڈو جی کے گھر پر ہی ہوئی تھی۔ ناگپور کے مشہور و معروف فن کار ڈاکٹر نائیڈو کے گھر ہی جمع ہوتے تھے۔ ڈاکٹر نائیڈو میری دلت تحریروں پر کھل کر کچھ نہیں کہتے تھے۔ لیکن انھیں چھوا چھوت والا خیال بہت ہی نچلے درجہ کا لگتا تھا۔ کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ ہمارے خیالات ایک دوسرے سے مختلف ہیں

لیکن ڈاکٹر نائیڈو کے پیار نے ان کی نااتفاقی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

بھدنت آنند کوسلّیان جی کے ساتھ گذارے ہوئے لمحات بھی میری زندگی کی انمول دولت ہیں۔ بھدنت آنند کوسلیان جی ڈاکٹر امبیڈکر اور راہل سانکرتیاین جی کے ساتھ عرصۂ دراز تک رہے۔ راہل جی کی تخلیقات سے میرا تعارف پہلے سے ہی تھا۔ مانو سماج نے جہاں انسانی ترقی کی طرف مجھے متوجہ کیا تھا، وہیں سائنس نے میرے دل سے خدا کا تصور ہی ختم کر دیا۔ 'وولگا سے گنگا' نے ایک نئی خواہش کو جنم دیا تھا۔ تہذیبی وراثت کے نام پر جو جھوٹ کتابوں کے ذریعہ رگوں میں بھرا جارہا تھا، اسے وولگا سے گنگا نے تہس نہس کر دیا تھا۔

انھیں دنوں میں اپنے ایک دوست کو جس کو قدیم ہندوستانی تاریخ پر فخر تھا 'مانو سماج' اور 'وولگا سے گنگا' پڑھنے کو دی۔ وہ ان کتابوں کو پڑھ کر بے چین ہو اٹھا تھا۔ اس کے خیالات منتشر ہو رہے تھے لیکن روایت کے بندھن سے چھٹکارا پانا، اس کے بس میں نہیں تھا۔ راہل جی کا نام سنتے ہی وہ پریشان ہو جاتا تھا۔

بودھ مذہب کی بہت سی کتابیں میں نے راہل جی کی ترجمہ کی ہوئی پڑھی تھیں۔ 'انگتر نکائے' 'مجھم نکائے'، 'سنیوکت نکائے'، 'ستپٹک'، 'دِرگھ نکائے'، 'بودھ دراشن' وغیرہ راہل جی کی کتابوں نے میرے اندر ایک نئی فکر پیدا کی تھی۔ بھدنت آنند کوسلّیان سے راہل جی کا تذکرہ سننا اچھا لگتا تھا۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہا کہ میں راہل جی کو دیکھ نہیں پایا۔ لیکن ان کی کتابیں میرے لیے اتنی ہی ضروری ہیں جتنا زندہ رہنا۔ درشن دِگ درشن، تبت کی یاترائیں، چین یاترا جیسی کتابیں دنیا کو میرے سامنے واضح کر دیا تھا۔ ایک ایسے فکر کی ترسیل کر رہی تھی، جس کے لیے میں بھٹکتا رہا ہوں۔

راہل جی کے بارے میں ایسی ایسی معلومات بھدنت آنند جی کے پاس تھیں جو نہ کہیں پڑھی تھیں اور نہ سنی تھیں۔

شاعری، ڈرامہ کے ساتھ ساتھ میرا رجحان کہانیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ پڑھنے کا شوق تو شروع سے ہی تھا۔ 79-1978ء کے آس پاس میں نے کہانیاں لکھنی شروع کی۔ 'جنگل کی رانی'' آدیواسی' جیسی کہانیاں میں نے (رسالہ) 'ساریکا' کو بھیجی تھیں۔ ان دنوں

اودھ نارائن مُدگل، ساریکا کے ایڈیٹر تھے۔ اُمیش بترا، سوریش اُنیال وغیرہ بھی ساریکا میں ہی تھے۔ سوریش انیال دہرادون کے تھے۔ ساریکا سے منظوری نامہ آگیا تھا۔ ساریکا ان دنوں ادبی رسالہ تھا۔ کہانی کی منظوری پاکر میں اُچھل پڑا۔ منظوری نامہ یعنی وہ خط میرے لیے صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا نہیں تھا۔

لیکن کئی سال تک ساریکا نے وہ کہانی روک کر رکھی۔ اس کو شائع نہیں کیا۔ اس دوران جب بھی گھر آتا ساریکا کے دفتر جا کر اپنی کہانی یاد دلاتا۔ سوریش انیال ہر بار یقین دلاتے۔ لیکن وہ کہانی آخر تک شائع نہیں ہوئی۔ سبھاش پنت اور سوریش انیال کی دوستی بہت گہری تھی۔ میں نے سبھاش پنت سے کہا کہ آپ سوریش انیال سے کہیں۔ لیکن سبھاش پنت نے کہا یا نہیں کہا یہ میں نہیں جانتا۔ ہاں دوبارہ سے بھیجنے کو مجھ سے سبھاش پنت نے کہا تھا۔ اور میں نے اس کو بھیج دیا۔ 1990ء میں کہانی کی دو کاپیاں ایک خط کے ساتھ میں واپس آگئیں۔ کہ ابھی تک ہم آپ کی کہانی چھاپ نہیں پائے ہیں۔ انتظار کا اور حوصلہ ہو تو واپس بھیج دیجیے۔ یعنی پورے دس سال انتظار کرانے کے بعد پھر اور انتظار... یہ کیسا مذاق ہے۔ ادب کے اندر بھی سیاست ہے۔ جو ابھرتے ہوئے پودھے کو کچل ڈالتی ہے۔ ساریکا بند ہوئی۔ مجھ جیسے نہ جانے کتنے لکھنے والوں کا قتل کیا ہوگا۔ ساریکا کے چلانے والوں نے، جو بلندیوں کی کی باڑ میں اپنی ناؤ کو بچا نہیں پائے ہم جیسوں کو کیا پار لگاتے۔ ادبی زندگی کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے لگ رہا تھا کہ نئے لکھنے والوں کو روکنے کی شاید ایڈیٹر اور ادیبوں کی کوئی چال ہے۔ شکر ہے 'ہنس' کا جس نے میری کہانیاں چھاپی۔ راجیندر یادو جی نے جس پیار و محبت سے مجھے چھاپا، میرے ایک نئی پیدائش تھی۔ ورنہ تو مارنے والوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

دہرادون میں ہمارے ہی محکمہ کا ایک نیا پروجیکٹ شروع ہوا۔ جس کے لیے نام مانگے گئے تو میں نے بھی اپنا نام دے دیا۔ اپریل 1985ء کو میرے نام کی منظوری آگئی لیکن منیجر نے اسے ابھی تک روک رکھا تھا۔ ناظم اعلیٰ شری گوئل سے میرے تعلقات اچھے تھے۔ شاعری کا انھیں بہت شوق تھا۔ انھیں کے ذریعہ مجھے خبر ملی تھی۔ ان کی خبر کے مطابق میں منیجر

ایس ایس نٹراجن جی سے ملا تھا وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن جب میں نے اپنے دل کی بات بتائی تو وہ راضی ہو گئے۔

22/جون 1985ء کو چندر پور سے میرا تبادلہ آرڈیننس فیکٹری دہرہ دون ہو گیا۔ تقریباً 13/سال تک میں چندر پور میں رہا۔ چندر پور چھوڑتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اپنے گھر کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ بہت کچھ ایسا تھا، جو مجھے چندر پور نے دیا تھا۔ میرے تجربات کی فہرست میں جو کچھ بھی ہے وہ بس چندر پور کا ہی دیا ہوا ہے۔

چندا بھی چندر پور چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہاں کی زندگی میں وہ ایسے گھل مل گئی تھی کہ اس کے لیے چھوڑ پانا مشکل ہو رہا تھا۔ سالنگ سنگھ سپکالے کی بیوی وندنا اور اس کے بیٹے بیٹیاں جیسے ہمارے ہی بچے تھے۔ منّی مجھے ڈیڈی اور چندا کو آئی (ماں) کہتی تھی اور اپنی ماں کا نام لیتی تھی۔ ان سب کو چھوڑنا چندا کے لیے دشوار تھا۔ اس رات ہم سو بھی نہیں پائے۔ وندنا اور سالنگ، منّی ہمارے پاس ہی بیٹھے رہے۔ صبح نکلنا بھی تھا۔ وہ صبح بہت ہی تکلیف دہ تھی۔ جی ٹی ایکسپریس سے ہم دہرہ دون کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ تمام لوگ پیچھے چھوٹ گئے جس کے ساتھ رہ کر ہم زندگی کے سکھ دکھ بانٹتے تھے۔ آج بھی مہاراشٹر کی ماٹی کی گندھ میرے پور پور میں بسی ہوئی ہے۔

میرے نام کے آگے جو نام لگا ہوا ہے، جس کو عرف یا لقب یا خاندانی نام کہتے ہیں، میرے نام کے ساتھ جڑ کر اس نے کئی طرح کی مشکلات پیدا کر دیں تھیں۔ وہ بھی اپنی ذات کی وجہ سے۔ یہ حالات اندرونی حالات کو متاثر کرنے لگتے ہیں تو اس نام سے چھٹکارا پانے کی سوچنے لگتا ہوں۔ لیکن جیت آگے لگے ہوئے نام کی ہی ہوتی ہے۔ ابھی تک ہونے والے تمام حادثوں کے بعد بھی میں اس کو چھوڑ نہیں پایا بلکہ یہ اور زیادہ اہم اور قریبی لگنے لگا ہے۔ مراٹھی کے مشہور دلت شاعر لوک ناتھ یشونت کو میرا 'والمیکی' نام بہت متاثر کرتا ہے۔ اور بھی ایسے دوست ہیں جنھیں میرا خاندانی نام پسند ہے اوم پرکاش گھسا پٹا سا نام والمیکی کے لگنے سے ہی مکمل ہوا... بہت سے لوگوں کا یہ بھی ماننا ہے۔ مکمل ہوا یا نہیں۔ ہاں! اس نام کی وجہ سے میں نے بہت سے خطرات اٹھائے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میری محنت اور سروکار کا

ساتھی بن گیا ہے۔اوم پرکاش پر یہ 'والمیکی' بھاری پڑنے لگا ہے۔

اسکول، کالج، دوستوں، ساتھیوں سے لے کر اساتذہ نے بھی بہت بار اس نام پر کیچڑ اچھالی ہے۔ بہت مذاق اڑایا۔لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں یہ ہمّت بھرا اقدم لگتا تھا۔ ان کی دلیل تھی کہ ایک اچھوت کہی جانے والی ذات کا آدمی اپنے نام کے آگے اپنی ذات کے نام کو لگائے وہ بھی عظیم جذبے کے ساتھ تو یہ بہت ہی ہمّت کی بات ہوئی۔ایک آدمی نے تو اس دلیل کی بھی دھجیاں آڑا دیں تھیں۔اس کا کہنا تھا:

''ہمّت کی کیا بات ہے... ہے تو چوہڑا ہی اچھا ہے ذات پوچھنے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔''

کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ احمقانہ اقدم ہے۔اس وقت جبکہ سماج میں ذات کے ساتھ عزّت اور بے عزتی کا سودا ہو۔خاندانی نام جان لینے سے لوگوں کا برتاؤ بدل جاتا ہے۔ایسا کہنے والوں میں زیادہ تر میری ہی ذات کے پڑھے لکھے، میرے گھر والے رشتہ دار ہوتے ہیں۔اور دلت ادب کے فن کار بھی اور کئی افسر، عالم اکثر مجھ سے دوری رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔آرڈیننس فیکٹری ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، خمریا جبل پور میں تکنیکی تعلیم کے دوران ایک سال کی ٹریننگ پوری ہوتے ہی میں نے ایک مقابلہ جاتی امتحان کے لیے فارم بھرا۔ جس کو پروفیسر ہردواری شری گپتا کے سامنے پیش کرنا تھا۔ پروفیسر گپتا میرٹھ کے پاس کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔والمیکی نام کی اصلیت سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔انھوں نے الٹ پلٹ کر فارم کو کئی بار دیکھا۔انھیں تو جیسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔مستقل پتا میں برلا مظفر نگر دیکھ کر ان کی حیرانی اور غصہ ایک ساتھ پھوٹ پڑے...

''ابے سوہرے (سسرے) یہاں تک پہنچ گیا۔''

ان کا اس طرح بولنا مجھے نامناسب لگا۔میں نے اس بات کی مخالفت کی تو وہ اور زیادہ بھڑک گئے۔

''تو... مجھے بولنے کی تمیز سکھائے گا...؟''

ان کے اس سلوک سے میرا غصہ بھی امڈ آیا۔میرے پاس ہی دوست کھڑا تھا۔اور وہ

اس واقعہ کا گواہ ہے۔ وہ مجھے سمجھا بجھا کر گپتا کے آفس سے باہر لے آیا۔ باہر آ کر اس نے کہا:

''ٹریننگ میں ہو... یہ تو چاہتے ہیں کہ تو غصہ میں کچھ الٹا سیدھا کرتا کہ انسٹی ٹیوٹ سے باہر نکالنے کا موقع مل جائے... ان کی چال کو سمجھو!''

یہ واقعہ کانٹے کی طرح سینے میں چبھ گیا تھا۔ اس روز ٹریننگ پوری کر کے میں آگے کے کورس کے لیے امبرناتھ (ممبئی) آرڈیننس فیکٹری میں جانے والا تھا۔ میرا انتخاب ہو گیا تھا۔ اب مجھے دو سال کا کورس اور پورا کرنا تھا۔ یہ کورس میری زندگی کے لیے ضروری تھا۔ اگر اس روز گپتا سے ہاتھا پائی ہو جاتی.... حالات تو پوری طرح بن گئے تھے کہ لڑائی ہو.... اگر ایسا ہو جاتا تو مستقبل پر سوالیہ نشان لگ جاتا۔ کتنا کچھ جھیلنا پڑا ہے یہاں تک آتے آتے۔

مہاراشٹر قیام کے دوران ایسے تجربات پیش آئے کہ کچھ لوگ تو 'والمیکی' کی وجہ سے مجھے برہمن سمجھ بیٹھے تھے۔ ایسا ہی خیال امبرناتھ (بمبئی) میں ایک دیش پانڈے نے پال رکھا تھا۔ اکثر اپنے گھر بلا لیتا۔ گھنٹوں بیٹھک جمتی۔ وہ شاعر تھے۔ ایک دن ان کی باتوں سے ایسا ظاہر ہو کہ وہ مجھے برہمن سمجھ رہے ہیں۔ میں نے اسی وقت اپنے نام کا بھید ان کے سامنے کھول دیا تو وہ گم سم سے ہو گئے تھے۔ اچانک ہی ہمارے درمیان ایک گہری کھائی نے جگہ بنا لی تھی۔ اس کے بعد پھر ہم کبھی خوش اسلوبی سے نہیں مل پائے۔

باہر کے ہی نہیں اپنے بھی اس نام سے بہت پریشان ہو گئے تھے۔ میرے بابا دوسروں سے مختلف تھے کیوں کہ جاہل ہوتے ہوئے بھی ان کی سوچ دوسروں سے الگ تھی۔ ان کے دل میں بے انتہا ایمان داری تھی۔ وہ اپنے آپ کو 'شر بھنگ' کہا کرتے تھے، جس کا مطلب میں آج تک نہیں سمجھ پایا۔ ان کے اندر نفرت تو بالکل بھی نہیں تھی۔ ہاں! اکھڑ پن ضرور تھا، جو ان کے بولنے سے لے ان کی چال میں بھی دکھائی دیتا تھا۔ انھیں بہت دنوں بعد پتا چلا کہ میں اپنے نام کے آگے والمیکی لگاتا ہوں۔ جب پتا چلا تو وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک چمک تھی، جو خوشی ظاہر کر رہی تھی۔ جس کو میں آج تک بھول نہیں سکا ہوں۔

میری بیوی میرے اس نام کو قبول نہیں کر پائی اور نہ ہی وہ اس کو اپنے نام کے آگے لگاتی تھی۔ میرے نکمے پن کی گنتیوں میں یہ نام بھی ایک ہے، جس کا ذکر کبھی کبھار کر دیا

کرتی ہے۔ وہ اپنے نام کے آگے خیروال لگانا زیادہ پسند کرتی تھی۔

چندر پور (مہاراشٹر) میں ہمارا ایک تھیٹر گروپ تھا 'میگھ دوت ناٹیہ سنستھا' کے نام سے جس کو ہم نے دس سال تک چلایا۔ یعنی جب تک میرا تبادلہ دہرادون میں نہ ہوا تھا۔ ان دنوں ہم دونوں میاں بیوی ڈراموں میں ایک ساتھ کام کرتے تھے۔ کئی ڈراموں میں ہم دونوں نے ایک ساتھ کام کیا تھا۔ 'آدھے ادھورے'، 'دلاری بائی'، 'ہمالہ کی چھایہ'، 'سنہاسن خالی ہے' وغیرہ ہمارے کامیاب ڈرامے تھے۔ ڈراموں کی پبلی سیٹی (تشہیر) میں وہ اپنا نام چندا خیروال ہی چلاتی تھی۔ اور مجھ پر اس بات کا دباؤ ڈالتی تھی کہ میں بھی اپنے نام کے ساتھ 'خیروال' ہی لگاؤں۔ اکثر میں ٹالنے کی کوشش کرتا تو وہ ایسی مثالیں پیش کرتی کہ مجھے ہار ماننی پڑتی۔ ایک بار تو طے بھی کر لیا تھا کہ اس روز روز کی چک چک سے چھٹکارا ملے، اور اس نام کو بدل ہی ڈالوں۔ لیکن دو چار دن بعد میں پھر سے اپنے پرانے نام پر ہی ڈٹ گیا۔ آج بھی گھر میں جب میرے اس نام پر بحث ہوتی ہے تو میری بیوی سخت لفظوں میں کہتی ہے:

''اگر ہمارا کوئی بچہ ہوتا تو میں ان کا نام ضرور بدلوا دیتی۔''

اس وقت مجھے لگتا کہ جیسے وہ مکان یا کپڑے بدلنے کی بات کر رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ باتیں مجھے تکلیف نہیں دیتی تھیں۔ میں ایسے لمحوں میں بے چین ہو جاتا ہوں۔

میرے ایک دوست ہیں دنیش مانو جو آج کل (رام پور) اتر پردیش میں ہیں۔ وہ ان دنوں الہ آباد میں تھے، صحافت میں سرگرم تھے۔ 'مہودیکا' نام کا ایک رسالہ بھی انھوں نے نکالنا شروع کیا تھا۔ ایک ہی شمارہ نکلا تھا کہ بند ہو گیا۔ اس شمارے میں میری ایک نظم اور ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ ایڈیٹر نے حاشیہ میں لکھا تھا کہ ہم نام کے ساتھ کسی بھی ذات کا نام نہیں چھاپیں گے۔ اس طرح وہ ذات پات کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

دلتوں میں جو پڑھ لکھ گئے ہیں ان کے سامنے جو خطرناک مشکل درپیش تھی وہ تھی پہچان کی جس سے نکلنے کا وہ فوری طور پر راستہ ڈھونڈنے لگے ہیں۔ اپنی نسل کے قلیل ہونے کے باوجود تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اپنے نام کے آگے لگانے لگے ہیں۔ جیسے 'چنا لیے' سے 'چندرل' یا 'چینچل'، 'سودے' سے 'سودائی' یا 'سود' لکھنے لگے ہیں۔ ایک سجن نے تو 'پارچہ' کو

'پارتھ' بنالیا ہے۔ میری ماں کی نسل 'کیسلے' ہے۔ جس کو کچھ لوگ 'کیس وال' لکھتے ہیں۔ انھیں یہ آسان لگتا ہے۔ ان سب کے پیچھے پہچان حاصل کرنے کی تڑپ ہے، جو ذات پات کے گھور انسانیت کے خلاف ہونے کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ دلت پڑھ لکھ کر سماج میں سب کے برابر آنا چاہتے ہیں لیکن اونچی ذات والے انھیں اس برابری سے روکتے ہیں۔ ان سے بھید بھاؤ برتا جاتا ہے۔ اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں۔ ان کی فہم ''صلاحیت'' کام کرنے کی طاقت پر شک کیا جاتا ہے، بے عزت کرنے کے تمام ہتھکنڈے اپنائے جاتے ہیں۔ اس تکلیف کو وہی جان سکتا ہے، جس نے نشتر کے زخموں کو اپنے جسم پر محسوس کیا ہو، یا انھیں جھیلا ہو۔ ان کے جسم کو صرف باہر سے ہی زخمی نہیں کیا بلکہ اندر سے بھی تہس نہس اور توڑ کر رکھ دیا۔ اپنیو جود کے اس مشکل وقت میں مجھ جیسا کوئی جس سے اس کی ذات کی پہچان ہو، ایسے نام کے ساتھ آ جاتا ہے تو وہ سارے لوگ چوکنے ہو جاتے ہیں۔ انھیں لگتا ہے جیسے کوئی ان کا بھید کھول رہا ہے کیوں کہ مشکل سے تبدیلی انھیں آسان لگتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تبدیلی سے بدلاؤ نہیں محنت اور بات چیت کرنے سے بدلاؤ آئے گا۔

موہن داس نیمش رائے (شاعر، ادیب، صحافی) آریہ نگر (نئی دلّی) میں رہتے تھے۔ ان دنوں میں دلّی جاتا تھا۔ ان کے گھر پر ہی ٹھہرتا۔ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس (AIIMS) نئی دلّی میں چندا کا علاج چل رہا تھا۔ چندر پور (مہاراشٹر) سے آنا پڑتا تھا۔ نیمش رائے کی بیوی شکنتلا جی نے بالکل سگے رشتہ داروں سے بھی زیادہ ہماری مدد کی تھی۔ انھوں نے دفتر سے چھٹّی لے کر ہمارے ساتھ اسپتال اور ڈاکٹروں کے چکّر کاٹے ہیں۔ AIIMS کے برآمدوں میں گھنٹوں بھوکے پیاسے رہ کر اپنے نمبر کا انتظار کیا ہے۔

ایک دن وہ اپنے کسی ایڈیٹر دوست سے ملوانے لے گئے۔ ان کے رسالے میں کچھ وقت تک نیمش رائے جی نے مجلس مشاورت میں کام کیا تھا۔ رسالہ کا دفتر اور ایڈیٹر کا گھر ایک ہی ساتھ تھا۔ مکان کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے نیمش رائے جی نے کہا تھا:

''آپ کا تعارف اگر صرف 'اوم پرکاش' کہہ کر ہی کرایا جائے...''

ان کی یہ بات سن کر مجھے عجیب سا جھٹکا لگا تھا۔

میں نے پوچھا: ''کیوں''

''انھیں میرے بارے میں زیادہ معلوم نہیں ہے۔ آدمی تو اچھے ہیں ...میری کافی عزت بھی کرتے ہیں پھر بھی''

نیمش رائے جی نے صفائی دی۔ میرے سامنے سب کچھ صاف ہو گیا۔ ایک بار دل میں آیا کہ واپس چلا جاؤں لیکن بھاگنا کسی بھی مشکل کا حل نہیں ہوتا اور پھر میں ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ جین صاحب سامنے کی کرسی پر بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے کہ نیمش رائے دائرہ میں رہ کر تعارف کراتے، میں اپنا فرض سمجھتے ہوئے خود ہی جین صاحب سے اپنا تعارف کرا دیا۔ وہ بہت ہی گرم جوشی کے ساتھ ملے تھے۔ ان کی باتوں یا برتاؤ سے ایسا کچھ نہیں لگا کہ ان پر میرے والمیکی نام کا کوئی برا اثر پڑا ہے۔

دلت تحریک سے وابستہ ادیب، عالموں اور کارکنان کو اپنے ضمیر سے لگاتار جوجھنا پڑ رہا ہے۔ دل کے اندھیر خانوں میں کس قدر خوف چھپا ہوا ہے، جو ہمیں باقاعدگی سے زندگی گذارنے نہیں دیتا۔

میری بھتیجی، سیما بی۔ اے کر رہی تھی۔ فن کار ڈاکٹر کُسم چترویدی ہندی شعبہ کی صدر تھیں۔ ایک دن بات کے دوران میں نے اس بات کا ذکر کیا کہ میری بھتیجی آپ کی طالبہ ہے۔ اگلے دن کلاس میں جاتے ہی ڈاکٹر چترویدی نے سیما سے پوچھ لیا کہ اوم پرکاش والمیکی کو جانتی ہو؟ سیما نے کلاس میں نظر دوڑائی اور انکار کر دیا۔ اسی دن شام کو سیما نے پورا قصہ سناتے ہوئے اپنی صفائی دے ڈالی تھی۔

''سب کے سامنے اگر مان لیتی کہ آپ میرے چاچا ہیں تو ساتھیوں کو معلوم ہو جاتا کہ 'والمیکی' ہوں۔ آپ سامنا کر سکتے ہیں میں نہیں کر سکتی... گلے میں ذات کا ڈھول باندھ کر گھومنا کہاں کی عقل مندی ہے؟''

سیما کی تمام دلیلیں قانون کی دوہری تصویر بن کر سامنے کھڑی تھیں۔ سیما اور چندا دونوں نے مل کر میرے نام کے خلاف موچہ بندی کر دی تھی۔

چند پور (مہاراشٹر) سے تبادلہ ہو کر دہرادون آیا تو مکان کی مشکل سامنے کھڑی تھی۔

مہینوں بھر بھٹکنے کے بعد کرن پور میں ڈاکٹر سندھوانی کا مکان ملا تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے کمروں میں سامان کو سمیٹنا پڑا۔ ایسا نہیں کہ دہرادون میں مکانوں کی کمی تھی یا میں کرایہ دینے کی حالت میں نہیں تھا بس مکان مالک میرا نام سنتے ہی منع کرنے لگتے۔ یا کوئی بہانہ مار دیتے۔ ڈاکٹر سندھوانی کے مکان سے آگے والے موڑ پر بھولا رام کھرے رہتے تھے۔ ان کی بیوی رامیشوری کو میں پہلے سے جانتا تھا۔ تھے تو وہ بھی والمیکی ہی لیکن اپنے نام کے آگے کھرے لگاتے تھے۔ یہ مکان ان ہی کی وجہ سے ملا تھا۔ ان کی بیٹی منجو بینک میں نوکری کرتی تھی اکثر شام کو یا چھٹی کے دن چندا کے پاس آجاتی۔ دونوں کے بیچ نند بھابھی کا رشتہ بن گیا۔ اس رشتے کی چپیٹ میں مجھے بھی گھسیٹ لیا۔ منجو میری منھ بولی بہن بن گئی۔ اسی دوران منجو کا رشتہ طے ہوا۔ شادی کا سارا انتظام میں نے ہی کیا۔ بڑے بھائی کی ذمہ داری کو نبھانے کی پوری کوشش کی۔ دفتر سے چھٹی لے کر گھر باہر کے تمام کام کیے۔ چندا نے گھر کے اندر کی ذمہ داری سنبھالی۔ سبھی کام بہتر طریقے سے پورے ہو گئے۔ جس دن منجو کی شادی کا کارڈ چھپ کر آیا، ایک واقعہ پیش آیا۔ کارڈ پر گھر والوں کے نام چھپے تھے صرف میرا نام اس فہرست سے غائب تھا۔ میں نے اس بات کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیا لیکن میری بیوی کو یہ بات پریشان کر رہی تھی۔ اس نے منجو سے پوچھ ہی لیا کہ کارڈ پر ان کا نام کیسے چھوٹ گیا۔ منجو نے بہانہ بنا کر بات کو ٹالنے کی کوشش کی لیکن چندا کی عادت ضدی ہے وہ بھی اڑ گئی۔ منجو سے سچائی اگلوا کر ہی دم لیا۔

''بھابھی یہاں کوئی نہیں جانتا کہ ہم والمیکی ہیں سبھی کو یہ معلوم ہے کہ ہم کھرے ہیں۔ بھیا کا نام چھپتے ہی بھید کھل سکتا تھا۔''

منجو رونے لگی تھی اور چندا کو ایک اور موقع مل گیا تھا میرے نام کے خلاف مورچہ بندی کرنے کا۔

ایسا ہی ایک اور حادثہ دوسرے رشتہ داروں میں ہوا۔ چندا کی بھتیجی کے کارڈ پر بھی سب ہی کے نام تھے، مجھے اس میں بھی چھوڑ دیا گیا۔ ان سب کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ ان سب سے میرے تعلقات خراب ہیں۔ وہ سب میرے اپنے ہیں۔ میرے نام سے ان

کا بھید کھل جانے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ اس نام کی وجہ سے جو تکلیفیں مجھے ملی ہیں، ان کو بیان کرنا ذرا مشکل ہے۔ پرایوں کی بات تو چھوڑیں اپنوں نے جو تکلیف دی ہیں، وہ بیان نہیں کی جا سکتیں۔ پرایوں سے لڑنا جتنا آسان ہے، اپنوں سے لڑنا اتنا ہی مشکل۔

ڈاکٹر سکھبیر سنگھ دلی یونیورسٹی کے شیواجی کالج میں ریڈر تھے۔ ہندی کے عالم، شاعر، ادیب اور محقق تھے۔ وہ بھی میرے نام سے دکھی تھے۔ ان کے گھر (وشواس نگر، شاہدرا، دلی) ایک رات رکنے کا موقع ملا تھا۔ پراگ پبلیکیشن کے شری کرشن جی سے 'کالی ریت' (ناول) کے شائع ہونے کے تعلق سے بات کرنی تھی۔ ڈاکٹر سکھبیر سنگھ کے ساتھ ہی پراگ پبلیکیشن گیا۔ شری کرشن جی ناول چھاپنے کو تیار تھے یہ الگ بات ہے کہ وہ ناول آج تک منظر عام پر نہیں آیا۔ اس رات 'والمیکی' نام کو لے کر سکھبیر سنگھ سے لمبی بحث ہوئی تھی۔ اس رات انھوں نے میرے نام سے 'والمیکی' ہٹا کر 'کھیروال' چسپا کر دیا تھا۔ ان کی شائع ہوئی کتاب 'سوریانش' پر میں نے ریویو (تبصرہ) لکھا تھا۔ جس کو وہ 'آج کل' میں خود لے کر گئے تھے۔ مشاورتی مجلس کے ایک رکن نے اوم پرکاش کے ساتھ کھیروال لگا دیکھ کر حیرانی جتائی تھی اور ڈاکٹر سکھبیر سنگھ نے کہا تھا:

''نہیں اب سے ہم انھیں 'والمیکی' نہیں 'کھیروال' ہی کہیں گے۔''

والمیکی کو اپنے ہاتھ سے مٹا کر انھوں نے کھیروال ہی لکھا تھا۔ 'آجکل' میں وہ ریویو (تبصرہ) اوم پرکاش کھیروال کے نام سے ہی شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر سکھبیر سنگھ کو بھی اپنی پہچان ظاہر ہو جانے کا ڈر تھا۔ اس لیے وہ والمیکی کو اپنے سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ یہی مشکل ہری کشن سنتوشی جی کی بھی تھی۔ کئی بار وہ اس نام (والمیکی) پر طعنہ کشی کر چکے تھے۔

ہری کشن سنتوشی جی کے ایک دوست ہیں سردار گیان سنگھ جو میرٹھ کے پاس ایک گاؤں کھیکھڑا کے رہنے والے ہیں۔ وہ مجھے میری دلت تحریروں کی وجہ سے ہی جانتے ہیں۔ میری شاعری اور کہانیوں سے بہت متاثر ہیں۔ اکثر لمبے لمبے خط لکھتے ہیں۔ جہاں ایک طرف وہ میری تخلیقات پر حوصلہ بڑھانے والی باتیں کہتے ہیں، وہیں وہ مجھے یہ بھی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ میں پڑھا لکھا بے وقوف ہوں۔ 'والمیکی' نام کی وجہ سے وہ

مجھے ایک جاہل آدمی سے بھی گیا گذرا مانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ میں جان بوجھ کر برہمن وادی دل دل میں پھنسا ہوا ہوں۔ مجھے ذات کا نام 'والمیکی' چھوڑ دینا چاہیے۔ اکثر ہری کشن سنتوشی جی اور ان کی بیوی کی مثال دے کر سمجھاتے ہیں۔

محکمۂ صفائی میں کام کرنے والوں کے خط میرے پاس بہت بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ جن میں نشستوں، اجلاس وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔ ایک بار میں نے ہری کشن جی سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ بولے

''والمیکی لکھوگے تو ایسا ہی ہوگا۔ صفائی کرنے والے ہی سمجھے جاؤ گے۔''

میری تخلیقات کو پڑھنے والوں کے جو خط آتے ہیں ان میں کچھ خط والمیکی نوجوانوں کے بھی ہوتے ہیں، جو اپنے نام کے ساتھ والمیکی جوڑنا یا لگانا چاہتے ہیں۔

جدید شاعر مہیندر بینی وال نے بھی 'والمیکی' کو اپنے نام کے آگے لگانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لمبی خط و کتاب چلی تھی۔ کچھ دن لکھا بھی لیکن بعد میں بینی وال لگالیا۔

ابھی حال ہی میں مجھے ایک پروگرام میں 'بودھ ساہتیہ اور درشن' پر اظہار رائے کے لیے بلایا تھا۔ مجھ سے پہلے دو تین مقررین بول چکے تھے۔ جیسے ہی میں بولنے کے لیے مائک پر بڑھا، سامعین میں سے ایک نے ٹوک دیا:

''والمیکی بودھ درشن اور ساہتیہ پر بولے گا شرم نہیں آتی۔''

اس کی اس بات پر پورا ماحول خراب ہوگیا تھا۔ منتظمین نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی وہ میری کوئی بھی دلیل سننے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے ہندو سماج میں پھیلی 'ذات پات' کی برائیوں پر بولنا شروع کیا تب جاکر وہ خاموش ہوا۔ مجھے لگا کہ مشکل بہت گہری ہے اور اس کے حل کرنے کے طریقے چند ہی ہیں۔ اندرونی حقیقت پر بولنا بہت مشکل ہے۔ اس واقعہ سے آئے ہوئے لوگ دکھی اور پریشان ہوگئے تھے لیکن میرے لیے یہ ایک ایسا تجربہ تھا، جس نے مجھے اور زیادہ مضبوط اور طاقتور بنادیا۔

ڈاکٹر دھرم ویر سے ایک ملاقات کے دوران اس نام (والمیکی) پر قابلِ اطمینان گفتگو ہوئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ:

''اس کو ہٹائیں مت... یہ آپ کی پہچان بن گیا ہے۔''

چنڈی گڑھ کے پانچ صوبوں (دلّی ، پنجاب ، ہریانہ ، ہماچل اور یو پی) کے دلت ادیبوں کی ایک کانفرنس ہوئی ۔ دو دن تک چلنے والی والی اس کانفرنس کے آخری حصّہ میں مجھے اپنا مضمون پڑھنا تھا۔ میرے بعد دلیپ سنگھ ایڈوکیٹ (ہماچل) کا لکچر ہوا تھا۔ وہ ماضی کے ایم۔ ایل۔ اے بھی رہ چکے تھے۔ اچھے مقرر ہیں۔ انھوں نے میرے نام پر ایک پر جوش تبصرہ کیا تھا۔ ساتھ ہی میری شاعری اور کہانیوں پر بھی تجزیاتی بحث کی تھی۔ اس بحث میں کچھ ایسی باتیں سامنے آئی تھیں کہ مجلس پر جوش ماحول میں اختتام پذیر ہوا۔ والمیکی نام نے یہاں بھی اثر دکھایا تھا۔ سبھی ادیب کسان بھونمیں ہی ٹھہرے تھے۔ میں اپنے دوست رام سنگھ کے گھر سیکٹر 47 میں رکا تھا۔ ان کی بیوی بھی ادب سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ کتابوں کو پڑھنے کا انھیں بہت شوق ہے۔ نشست میں ہوئی بحث کا ان سے ذکر کیا تھا۔ ویسے وہ بھی کھل کر نہیں کہہ سکیں لیکن اس روز انھوں نے بھی دبی ہوئی آواز میں کہہ ہی دیا تھا:

''والمیکی' نام کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔''

اس وقت ہم اس بات پر زیادہ بحث نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی کوئی گنجائش تھی۔ اگلے روز وہ لوگ مجھے بس اڈّے تک چھوڑنے آئے تھے سیکٹر۔ 47 میں جہاں بسیں رکتی ہیں۔ بینچوں پر ڈرائیور اور کنڈکٹر بیٹھے رہتے ہیں۔ جس وقت ہم وہاں پہنچے ہو بس زور زور سے بحث کر رہے تھے۔ زیادہ تر ڈرائیور سکھ تھے ایک ڈرائیور نے بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا:

''کچھ بھی کہو... چاہے جتا (جتنا) بڈّا افسر وڑ جاوے۔ اس دی جات نی بدل سکدی... چوہڑا ہے تو رہے گا چوہڑا ہی۔''

اس گفتگو کو سن کر اندو جی نے میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھ میں جیسے کوئی سوال تھا۔ اب کہو ادیب صاحب۔ اس کے بعد بھی آپ کے لیے کوئی معقول دلیل ہے۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد اندو جی نے کہا تھا:

''آپ کا یہ نام کسی دن آپ کی عزت کو زبردست دکھا پہنچائے گا۔''

اسی لمحہ ان کے پاس کھڑی بیٹی سونیا بول پڑی:

''انکل جی میں اپنے نام کے ساتھ والمیکی لکھوں گی۔''

ان کا بیٹا ساحل اس گفتگو کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اندو جی مستقبل کو لے کر شک میں مبتلا ہو گئی تھیں، کچھ بول نہیں پائیں۔ بس ڈرائیور کی طرف ایک ٹک دیکھے جا رہی تھیں۔

دفتر میں بھی کئی افسر ساتھی، نچلے درجے کے کام کرنے والے بھی میرے اس نام کی وجہ سے میری اہمیت کم دیتے تھے۔ شروع شروع میں بہت غصہ آتا تھا۔ الجھ بھی جاتا تھا۔ احتجاج تو اب بھی کرتا ہوں لیکن الگ طریقے سے۔ اب کچھ معمولی سمجھتا ہوں کیوں کہ یہ ایک سماجی روگ (مرض) ہے، جو مجھے جھیلنا پڑ رہا ہے۔ ذات ہی جہاں مان سمان اور اہمیت کی وجہ ہو۔ سماجی طور پر اعلیٰ ہونے کے لیے اہم ہو تو یہ لڑائی ایک دن میں نہیں لڑی جا سکتی۔ لگاتار مخالفت اور محنت کی طبیعت ہونی چاہیے، جو صرف ایک رخ ہی نہیں بدلاؤ بھی ہو۔ جو سماجی تبدیلی کو ایک موڑ دے سکے۔ اب تو یہ نام میرے نام کا ضروری حصہ بن گیا ہے۔ اس کے بغیر اوم پرکاش کی کوئی پہچان نہیں ہے۔ پہچان اور اہمیت دونوں الفاظ اپنے آپ میں بہت کچھ کہہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر دلت گھرانے میں پیدا ہوئے تھے لیکن امبیڈکر برہمن کا لقب تھا جو ایک برہمن ٹیچر نے دیا تھا۔ لیکن بھیم راؤ کے ساتھ جڑ کر ان کی پہچان بن گیا جس کے معنی ہی بدل گئے۔ آج بھیم راؤ کا امبیڈکر کے بغیر کوئی معنی نہیں۔

بات سن 1980ء کے آس پاس کی ہے میں اور میری بیوی چندا راجستھان گھوم کر دلّی سے چندر پور (مہاراشٹر) واپس جا رہے تھے۔ جے پور پنک سٹی ایکسپریس میں سیٹ ملی تھی۔ پاس والی کرسی پر ایک پریشان کرنے والا گھرانہ، میاں بیوی اور دو بچے بیٹھے تھے۔ جو جے پور سے نئی دلّی جا رہے تھے۔ بات چیت سے معلوم ہوا کہ اس کا شوہر افسر ہے۔ عام گفتگو ہو رہی تھی۔ پرسکون ماحول تھا۔ راجستھان کی خوبصورتی پر بحث ہو رہی تھی۔ میری بیوی اور اس افسر کی بیوی گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ عورتوں میں متعارف ہونے کی دیوار جلدی ٹوٹتی ہے۔ اچانک گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ افسر کی بیوی نے پوچھا:

''بہن جی، آپ لوگ بنگالی ہیں؟''

میری بیوی نے نرمی سے جواب دیا:

''نہیں اتر پردیش کے ہیں۔ میرے شوہر کی آرڈیننس فیکٹری، چندر پور (مہاراشٹر) میں پوسٹنگ ہے۔

''کون جات ہو؟'' افسر کی بیوی نے دوسرا سوال داغا۔

سوال سنتے ہی میری بیوی کا چہرہ فک پڑ گیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ سارا ماحول خراب ہو گیا تھا۔ جیسے کہ ذائقہ دار کھانے میں مکھی گر گئی ہو۔ جب تک میری بیوی جواب دیتی، میں نے جواب دے دیا:

''بھنگی''

بھنگی لفظ سنتے ہی سنّاٹا چھا گیا۔

سارا راستہ دونوں میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ ایک ایسی دیوار بیچ میں کھڑی ہو گئی تھی جیسے ہم نے کسی چور دروازے سے گھس کر ان کی ہنسی خوشی میں خلل ڈال دیا ہو۔ ماحول بوجھل اور بہت ہی تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ ایسے ایک نہیں بہت سے واقعات ہیں۔

بچپن سے لے کر آج تک نہ جانے کتنی تکلیفیں جسم پر ہی نہیں دل میں چبھوئے ہیں۔ اس نفرت کے پیچھے ایسی کون سی تاریخی وجوہات ہیں۔ جب جب بھی ذات پات والے قانون کو مثالی ماننے والوں اور ہندو ہونے پر فخر کرنے والوں سے پوچھا تو سیدھے جواب دینے کے بجائے بات کو اکثر ٹال جاتے ہیں یا ناراض ہو جاتے ہیں۔ علم کی بڑی بڑی باتیں کریں گے لیکن اس حقیقت کو قبول نہیں کریں گے کہ آدمی کو پیدائش کی وجہ سے انسانیت سے ہی دور رکھا جائے، یہ کہاں کی انسانیت ہے۔ اونچی ذات والوں کے دل میں کئی طرح کے تعصب اور بدگمانیاں ہیں، جو آپسی تعلقات کو آسان نہیں ہونے دیتے ہیں۔

ہندوستانی سماج میں (جاتی) ذات ایک بہت اہم بات ہے۔ ذات پیدا ہوتے ہی انسان کی اہمیت طے کر دیتی ہے۔ پیدا ہونا انسان کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا تو وہ بھنگی کے گھر پیدا ہی کیوں ہوتا؟ جو خود کو اس دیس کی اعلیٰ تہذیب کے علم بردار ہیں، کیا وہ اپنی مرضی سے ان گھروں میں پیدا ہوئے ہیں؟ ہاں اسے سمجھانے کے لیے وہ مختلف مذہبی کتابوں کا سہارا ضرور لیتے ہیں۔ وہ مذہبی باتیں، جو یکسانیت، آزادی کی حمایت نہیں کرتے

بلکہ سرداری یا بادشاہت کی ابتدا کرتے ہیں۔

بہادری اور عزّت کی، طرح طرح کی فرضی داستانیں بنائی گئیں۔کل ملا کر کیا حل نکلا؟ شکست، ناامیدی، غریبی، لاعلمی، ذلت، کنویں کا مینڈھک، مذہبی پیر کے چنگل میں پھنسا، مذہبی اعمال میں سلجھا ہوا۔

سماج جو ٹکڑوں میں بٹ کر کبھی یونانیوں سے ہارا کبھی شنکوں سے ہارا اور کبھی ہوڑوں سے، کبھی افغانوں سے، کبھی مغلوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں سے ہارا، پھر بھی اپنی بہادری اور عظمت کے نام پر کمزور، بے سہارا کو مارتے رہے، گھر جلاتے رہے، عورتوں کو بے عزت کر کے ان کی عزت سے کھیلتے رہے۔ اپنے آپ میں ڈوب کر سچائی سے منھ موڑ لینا تاریخ سے سبق نہ لینا آخر کس ملک کی ترقی کی خواب ہے۔

وقت بدلا ہے لیکن کہیں کچھ ہے جو صحیح نہیں ہونے دیتا ہے۔ کئی عالموں، دانشوروں سے جاننا چاہا کہ اونچی ذات والوں کے دل میں دلتوں، شودروں کے لیے اتنی نفرت کیوں ہے؟ پیڑ پودوں، جانوروں، پرندوں کو کی عبادت کرنے والا ہندو دلتوں کے لیے اتنا متعصّب کیوں ہے؟ آج ذات ایک خاص اور اہم چیز ہے۔ جب تک یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ دلت ہیں تو سب کچھ ٹھیک رہتا ہے۔ ذات معلوم ہوتے ہی سب کچھ بدل جاتا ہے۔ چہ میگوئیاں، دلت ہونے کی تکلیف چاقو کی طرح رگ رگ میں اتر جاتی ہے۔ غریبی، جہالت، تہس نہس اور خوفناک زندگی، درواز سے باہر کھڑے رہنے کی تکلیف بھلا اونچی ذات کے خوبیوں سے بھر ہوئے اعلیٰ ہندو کیسے جان پائیں گے؟

ذات ہی میری پہچان کیوں؟ کئی دوست میری تخلیقات میں میری تیز آواز اور مغرور ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان کا اشارہ ہوتا ہے کہ میں تنگ دائرہ میں قید ہوں۔ ادبی شخصیات کو وسیع معنوں میں قبول کرنا چاہیے۔ تنگ نظری سے باہر آنا چاہیے۔ یعنی میرا دلت ہونا کسی عنوان پر اپنے دائرہ، اپنی سماجی، معاشی حالت کے مطابق خیالات بنانا مغرور ہونے کی علامت ہے؟ کیوں میں ان کی نظر میں صرف ایس۔ سی طرح ہوں، دروازے کے باہر کھڑا رہنے والا...

JHOOTAN (Vol. 1)
(AUTOBIOGRAPHY)

by
OMPRAKASH WALMIKI

Translated by
RAHEEN SHAMA

نام : راہین شمع

والد : محمد عثمان

جائے پیدائش : منصور پور معافی، شہباز پور کلاں۔ اسمولی، ضلع مرادآباد موجودہ ضلع سنبھل (یوپی)

تعلیم : عالمیت۔ جامعۃ الصالحات، رام پور (یوپی)
بی۔ اے۔ (آنرس) اردو۔
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (یوپی)
ایم۔ اے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (یوپی)
ایم۔ فل۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)
پی۔ ایچ۔ ڈی (جاری) آل احمد سرور کی ادبی خدمات
زیرنگرانی: پروفیسر احمد محفوظ۔
جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

زیر طبع پہلی مترجم کتاب : (ہندی سے اردو)
اوم پرکاش والمیکی کی آپ بیتی ''جھوٹن''

پتہ : 12/19H ۔ سرسید روڈ، بٹلہ ہاؤس
جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی ۔ 110025

raheenhaya786@gmail.com

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

۱۸ نومبر ۲۰۱۲

چندر پور (مہاراشٹر) سے میرا تبادلہ آرڈیننس فیکٹری، دہرادون ہو گیا۔ ۱ر جولائی ۱۹۸۵ء کو میں نے آرڈیننس فیکٹر میں عہدہ سنبھالا۔ وزارت دفاع، حکومت ہند کی طرف سے ایک نیا پروجیکٹ، آرڈیننس فیکٹری، دہرادون کو ملا تھا۔ روسی تکنیک کی بنا پر T-72 اور B.M.P-2 ٹینکوں کے ویژن ڈیوائسز کا پروڈکشن اس پروجیکٹ کا اہم مقصد تھا۔ مجھے میرے ہی فیلڈ کا کام ملا تھا۔ ویسے تو یہ آپٹو۔الیکٹرانک ڈیوائسز تھی اور میری تعلیم اور تجربہ مکینیکل میں تھا۔ لیکن مجھے ایک نیا کام کرنے کا موقع ملا یہ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ انجینئرنگ ڈرائنگس کا مطالعہ اور درستگی، ان سے جڑے ہوئے تمام عملی کام مجھے سپرد کیے گئے۔ سبھی دستاویز روسی زبان میں تھے جن کا ترجمہ مترجمین کی ٹیم کر رہی تھی۔ روسی ماہرین کا ایک گروہ ہمارے ساتھ کام کر رہا تھا۔ یہ کام مجھے بہت دلچسپ لگا کیوں کہ اس میں کچھ نیا سیکھنے کی گنجائش تھی۔ دن بھر کام میں مشغول رہنا پڑتا۔ میرے کئی پرانے ساتھی بھی آرڈیننس فیکٹریوں سے اس پروجیکٹ کے لیے آئے تھے۔ نریش اگروال، بی۔ کے۔ اگروال جبل پور کے فیکٹریوں سے تبادلہ ہو کر آئے تھے۔ انل بھاردواج اور وی۔ کے۔ ڈھمیجا چندر پور سے آئے تھے۔ آرڈیننس فیکٹری، چندر پور میں ہم ایک ہی شعبہ میں تھے۔ ایک ساتھ ایکسپلوسیو پروڈکشن میں کام کیا تھا۔ میرے پرانے دوست وجے بہادر سول، جن کے ساتھ میں آرڈیننس فیکٹری، جبل پور میں ٹریننگ کے دوران رہ چکا تھا، وہ بھی کافی عرصہ سے اسی فیکٹری میں تھے۔ ہم دونوں میں اور گھریلو سطح پر گہرے تعلقات تھے۔ پہلا دن میرے لیے کافی پر جوش تھا کیوں کہ میں نے اس فیلڈ میں کام کی شروعات اسی فیکٹری سے کی تھی۔ اور بھی کئی ملازمین ایسے تھے جن سے پہلے سے جان پہچان تھی۔ ان لوگوں سے مل کر بہت اچھا لگا۔ میں تقریباً سترہ سال بعد دہرادون واپس آیا تھا، بہت کچھ بدل چکا تھا۔ جس چیز میں تبدیلی نہیں آئی تھی وہ تھی لوگوں کی ذہنیت، جو اسی پرانے ڈھرّے پر چل رہی تھی۔

میرے جوائن کرنے کا آرڈر جیسے ہی شائع اور تقسیم ہوا، مجھے اس بات کا احساس ہوا

کہ لوگوں میں میرے نام (لقب) کو لے کر عجیب طرح کی پھسپھساہٹ ہے، جسے کانا پھوسی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کیوں کہ میرے طبقہ کے کسی بھی فرد کو اس عہدے پر دیکھنے کے وہ لوگ عادی نہیں تھے۔ اوپر سے 'والمیکی' ان کے گلے سے ہی نہیں اتر رہا تھا۔ ایک عجیب سی حالت تھی۔ میں اس فیکٹری میں اعلی عہدے پر فائز ہو کر آیا تھا، وہ بھی ایک خصوصی لیاقت کے ساتھ۔ یہ بات لوگوں کے گلے ہی نہیں اتر رہی تھی۔ وہ اسے ریزرویشن کے تحت ملنے والی رعایت کے ساتھ جوڑ رہے تھے۔ میری پڑھائی لکھائی، ٹریننگ اور تجربات کے بارے میں کسی نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میرے لیے الگ طرح کا تجربہ تھا۔

ڈیزائن آفس میں میری پوسٹنگ ہوئی جس کے انچارج جیٹھی جی تھے جو تیس سالوں سے اسی شعبے میں تھے۔ آفس میں مختلف عہدے سنبھالنے کے بعد انچارج مقرر ہوئے تھے۔ اس لیے تجربات کا دائرہ بھی وسیع ہوگا، ایسا کوئی بھی سوچ سکتا تھا۔ جب میں ان سے ملا تو وہ عجیب سے مغرور لہجے میں بات کر رہے تھے۔ جس میں خود پسندی زیادہ تھی۔ میری قابلیت کو لے کر ان کے ذہن میں بھی شک تھا۔ یہ بات میرے لیے کافی چوکانے والی تھی۔ ان کا پہلا سوال ہی عجیب طرح کا تھا۔ انہوں نے کہا:

''یہاں ڈیزائننگ کا کام ہوتا ہے آپ کر پائیں گے؟''

''کیوں؟ آپ کو ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ میں نہیں کر پاؤں گا، شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے اسی فیلڈ میں ممبئی سے ٹریننگ لی ہے، اور آرڈیننس فیکٹری، چندر پور میں یہی کام کرتا رہا ہوں۔''

میں نے انہیں بتانے کی کوشش کی لیکن جیسے وہ میری کسی بھی بات پر یقین کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ شاید پہلے سے ہی یہ مان کر چل رہے تھے 'والمیکی ...وہ بھی ڈیزائنر...؟' ایک والمیکی کا اس عہدے پر آنا، ان کے تصور سے باہر تھا۔

''کس طرح کا کام کیا ہے ابھی تک...؟'' جیٹھی جی نے میری بات سنے بغیر اگلا سوال کیا۔

مجھے لگا کہ یہ جناب وہی سننا چاہتے ہیں جس کے وہ عادی ہیں۔ اس لیے میں نے

صاف صاف کہا:

''چھوڑیے...ان سب باتوں کو، آپ جو بھی کام دیں گے میں کروں گا۔''

میری اس خود اعتمادی سے جیسے وہ چڑھ گئے۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ چیلنج کرتے ہوئے بولے:

''مسٹر! یہاں ڈیزائننگ کا کام ہوتا ہے، اس میں دماغ لگانا پڑتا ہے، ساتھ ہی رشین ڈرائنگس ہیں جنہیں سمجھنا ہر کسی کے بس کا نہیں۔''

لمحہ بھر کو لگا جیسے میرے اندر جذب غصہ ایک دم پھٹ جائے گا۔ لیکن میں نے جلدی ہی اپنے جذبات پر قابو پالیا۔ پہلے ہی دن میں ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا جو آفس کے نظام کو درہم برہم کردے۔ میں نے دبی آواز میں کہا:

''جی، مانتا ہوں...لیکن شکریہ آپ نے میرے علم میں اضافہ کیا کہ آفس میں ایسے بھی کام ہوتے ہیں جن میں دماغ کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

وہ آگے کچھ بولنا چاہتے تھے لیکن بول نہیں پائے۔ انہوں نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا، یہ سوچ کر کہ یہ کام میرے لیے بہت مشکل ہوگا۔ رعب ودبدبہ کے ساتھ بولے:

''اسے اسٹڈی کر کے بتاؤ کہ یہ کام آپ کب تک پورا کردیں گے؟''

میں نے کاغذ ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس پر سرسری نظر ڈالی اور انہیں مطمئن کرنے کی نیت سے کہا:

''اسٹڈی اور ڈیزائننگ ساتھ ساتھ ہو جائیں گے۔''

میرے ایک ایک لفظ سے جیسے وہ چڑھ رہے تھے جبکہ میں نرمی سے بات کر رہا تھا۔

''پھر بھی کب تک ہو جائے گا؟'' اس نے حاکمانہ لہجہ میں کہا۔

''آپ کو کب تک چاہیے؟...وہ بھی بتا دیجیے۔'' میں نے ان سے ہی پوچھ لیا۔

''دو دن سے زیادہ نہیں۔''

وہ انگلیوں کے بیچ پھنسی ہوئی سگریٹ کا کش لیتے ہوئے ایسا ظاہر کر رہے تھے جیسے مجھے اپنے جال میں پھنسا کر دبوچنا چاہ رہے ہیں۔ لیکن میری خود اعتمادی نے خود انہیں

شکست دے دی تھی۔ میں نے کہا:

''آج شام سے پہلے آپ کی میز پر ہوگا۔ بھروسا رکھیے۔''

جیٹھی جی ہکّا بکّا میری طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں اس بات کا یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کام تین چار دن سے پہلے کیسے پورا ہوسکتا ہے...اور یہ پورے اعتماد سے کہہ رہا ہے کہ آج ہی ہو جائے گا۔ دراصل وہ میری قابلیت کو میری ذات کے ساتھ جوڑ کر دیکھنے کے عادی تھے، جوان کے ہر ایک لفظ سے جھلک رہا تھا۔

میں نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کام کرنا شروع کر دیا۔ تقریباً ایک گھنٹے میں ڈیزائن تیار ہو گیا۔ جیسے ہی کام ختم ہوا، میں نے وہ ڈیزائن ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا:

''اگر کوئی تبدیلی چاہتے ہیں یا یہ آپ کے مطابق نہیں ہے تو بتا دیجیے، میں ترمیم کر دوں گا۔ ویسے میرے حساب سے یہ ایک دم صحیح ہے۔''

اس کے بعد میں آفس سے باہر نکل آیا۔ میرے آفس کے پاس ہی افسانہ نگار، مدن شرما جی کا آفس تھا۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میرے نام کو لے کر پوری فیکٹری میں باتیں ہو رہی تھیں، دلتوں کے علاوہ ہی نہیں بلکہ میری ذات کے ملازمین بھی حیران تھے کہ والمیکی لگانے والا یہ کون ہے؟ اور کہاں سے آ گیا ہے؟ کل ملا کر حالات کافی جذبات کو بھڑکانے والے تھے۔ مجھے جو آفس ملا تھا وہ انتظامیہ ہاؤس میں تھا۔ وہیں ویجی لنس محکمہ میں میری ہی ذات کے رمیش کمار اور رام سوروپ تھے جو ایک سینئر افسر کے پی۔اے۔ تھے۔ وہ دونوں بھی اسی بلڈنگ میں بیٹھتے تھے۔ رمیش کمار اور رام سوروپ جی ٹھیک ٹھاک عہدہ پر تھے لیکن دونوں ہی اپنے سماج سے کٹے کٹے رہتے تھے۔ اور نہ ہی کسی سے ملتے جلتے تھے۔ جب انہیں یہ پتا چلا کہ کوئی اوم پرکاش آیا ہے جو اپنے نام کے آگے والمیکی لگاتا ہے، تو وہ خفیہ طور پر مجھ سے ملے تھے۔ وہ بھی میرے آفس میں نہیں بلکہ انتظامیہ ہاؤس کے گلیارے میں۔ جب وہ مجھ سے بات کر رہے تھے تو بار بار احتیاطاً ادھر ادھر دیکھ لیتے تھے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ وہ دونوں بے حد ڈرے ہوئے تھے۔ ان کی اس حرکت کو میں تاڑ گیا تھا اور میں نے مزہ لینے کے لیے ان سے کہا:

''اگر میرے ساتھ بات کرنے پر آپ کی عزت پر آنچ آتی ہے، تو مہربانی کر کے آگے سے ہم نہیں ملیں گے۔ آپ لوگوں کو سماج سے ڈر لگتا ہے تو لگے، مجھے نہیں لگتا۔''

''ارے نہیں بھائی صاحب! یہاں کے ماحول سے آپ متعارف نہیں ہیں۔ ابھی آپ نئے نئے ہیں جیسے ہی لوگوں کو ذات کا پتا چلتا ہے، ان کا رویہ بدل جاتا ہے۔ تب بہت برا لگتا ہے۔''

رام سوروپ نے اپنے دل میں چھپی تکلیف کو ظاہر کیا جس سے رمیش کمار بھی متفق تھے۔ میں نے زور دے کر کہا:

''دیکھیے! ذات کو لے کر سماج میں جو حالات ہیں، میں اس سے انکار نہیں کر رہا ہوں۔ لیکن جتنا ڈرو گے، لوگ اتنا ہی تمہیں ڈرائیں گے۔ ایک بار دل سے ڈر نکال دو، پھر دیکھو تم سے ڈرنے لگیں گے۔ ڈر ڈر کر ہزاروں سال سے جی رہے ہو، کیا ملا؟ پڑھ لکھ کر اچھے عہدے پر کام کر رہے ہو پھر بھی ڈرے ہوئے ہو، اپنے اندر کی احساس کمتری سے باہر آکر دیکھو بھائی! یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ ہر وقت صرف اس فکر میں گھلتے رہو کہ سامنے والا آپ کی ذات کی وجہ سے آپ کے ساتھ غلط برتاؤ کر رہا ہے۔ ذرا ایک بار مخالفت کر کے تو دیکھو، شاید حالات بدل جائیں۔ جس بات سے ٹکرانا چاہیے اس سے ڈر کر بھاگ رہے ہو۔ کیوں؟ اس سے نجات حاصل کرنے کا کیا یہی ایک راستہ بچا ہے کہ مشکلات سے دور بھاگا جائے۔ اس سے کیا مسائل حل ہو جائیں گے۔ نہیں! کھل کر کہو جو بھی کہنا ہے، اپنی قابلیت ثابت کرو، حالات بدلیں گے۔ یہی تو زندگی کی جدوجہد ہے۔''

وہ چپ چاپ میری بات سن رہے تھے۔ میں اس بات کو سمجھ چکا تھا کہ میری باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ میں جانتا تھا کہ ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو مشکلوں سے سامنا کرنے کے بجائے ان مشکلوں سے بھاگ کر اپنی پہچان ہی چھپا لیتے ہیں، یا

پھر اپنا نام ہی بدل کر غلط فہمی میں زندگی گذارتے ہیں۔اس طرح کے پڑھے لکھے لوگ نہ تو سماج میں کوئی بدلاؤ لا سکتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کے لیے کچھ کر سکتے ہیں، بس اپنے ہی دربے میں دبک کر زندگی گذارتے ہیں۔ کچھ دن بعد خبر ہوتی ہے کہ وہ سرکاری نوکری میں ''والمیکی'' ہے اور باہر کی دنیا میں ''عیسائی'' اسی بنا پر ''والمیکی'' سماج سے دور ہوتے جارہے ہیں۔اپنی پہچان ظاہر ہو جانے کی ڈر سے نہ وہ گھر کے رہتے ہیں اور نہ گھاٹ کے۔ان سے مل کر مجھے بہت گہری چوٹ کا احساس ہوا تھا۔

دوسرے دن جیسے ہی میں اپنی سیٹ پر پہنچا تقریباً پورا اسٹاف اپنے اپنے کام میں لگ چکا تھا۔ جیٹھی جی اپنی سیٹ پر نہیں تھے۔اسی وقت جیٹھی جی کے فون کی گھنٹی بجی۔

اسٹاف کے ایک آدمی نے فون اٹھایا:

''ہیلو....جی...ٹھیک ہے''

''والمیکی جی! پدمنا بھن صاحب کے آفس سے فون ہے، صاحب بلا رہے ہیں۔''اس نے فون رکھتے ہوئے مجھے باخبر کردیا۔

پدمنا بھن جی میرے باس تھے۔جو ڈپٹی جنرل منیجر کے عہدے پر تھے۔ تھے تو وہ دکن کے لیکن بنگالی ، ہندی ،انگریزی اور دکنی زبانوں پر بھی مہارت حاصل تھی۔ سانولے رنگ کے لمبے ،اسمارٹ افسر، جو پہلی ہی ملاقات میں اپنا اثر چھوڑ جاتے تھے۔جیسے ہی ان کی کیبن میں داخل ہوا تو جیٹھی جی پہلے ہی وہاں تشریف فرما تھے اور میرا بنایا ہوا ڈیزائن پدمنا بھن جی کے سامنے رکھا ہوا تھا۔جس پر جگہ جگہ پنسل سے گولے بنے ہوئے تھے۔حالات سمجھنے میں مجھے وقت نہیں لگا کہ اس ڈیزائن کی چیر پھاڑ کرانے اور میرے خلاف ماحول بنانے کی مہم شروع ہو چکی ہے۔زندگی کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں سے گذرتے ہوئے ایسی تکلیف دہ حالات سے کیسے نجات حاصل کرنی ہے وہ سیکھ چکا تھا۔اس لیے خود کو مطمئن کرتے ہوئے مخالفت سے مقابلہ کرنے کے لیے میں ذہنی طور پر تیار ہونے لگا تھا۔ مجھے دیکھتے ہوئے پدمنا بھن جی نے سوال داغا:

''it is your design''(یہ آپ کا ڈیزائن ہے؟)

''سر''میں نے نرمی سے کہا۔

''will it work smoothly?''(کیا یہ بنا کسی رکاوٹ کے کام کرے گا؟) پدمنا بھن جی نے سوال کیا۔

''why not sir''(کیوں نہیں سر) میں نے مستعدی سے جواب دیا۔

''Are you sure''(آپ کو یقین ہے؟)

''سر''میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

''بیٹھیے''انھوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

کچھ دیر تک ڈیزائن کو باریکی سے دیکھتے رہے۔ کچھ لمحوں کے بعد بولے:

"Are you aware this factory is working on its own style with some different production facilities?"

(کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ فیکٹری اپنے پرانے طریقوں میں کچھ الگ پرڈکشن سہولیت کے ساتھ کام کرتی ہے؟) پدمنا بھن نے میری طرف تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''زیادہ نہیں جانتا سر! اس فیکٹری میں میرا یہ دوسرا ہی دن ہے۔''میں نے اطمینان کے ساتھ قبول کیا۔

"ok it is better you should take a round of the production section of this factory"

(ٹھیک ہے۔ اچھا ہوگا، آپ کو اس فیکٹری کے پروڈکشن شعبوں کو دیکھ لینا چاہیے) پدمنا بھن جی نے مجھے مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے سر! میں اس فیکٹری کی سہولیات کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش

کروں گا''

کچھ پل گذرنے کے بعد میں نے کہا:

''اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

انھوں نے اشارے سے اجازت دی۔

''سر! ہم ایک جدید پروجیکٹ پر کام کرنے کے لیے یہاں مقرر ہوئے ہیں۔ جو کہ روسی تکنیک پر منحصر ہے۔ کیا ہمیں اپنی معلومات میں اضافہ نہیں کرنا چاہیے...؟ جدید معلومات کو اپنے کام کا حصہ نہیں بنانا چاہیے...؟ اپنی معلومات، سوچ اور ذہنیت کو اس جدید ٹکنالوجی کے ساتھ جوڑ کر نہیں چلنا چاہیے؟... تبھی ہم اپنے آپ کو نئے نظریات، جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ چلا پائیں گے... مجھے ایسا لگتا ہے اگر ہم پرانے اور آؤٹ ڈیٹیڈ سسٹم کے ساتھ نئی ٹکنالوجی کو اپنائیں گے، تو ہوسکتا ہے کہ کہیں ہم پچھڑ نہ جائیں۔ جاپان نے اس نظریہ کو جس طرح ترقی دی ہے، آج وہ اپنی لیاقت کی وجہ سے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ اس لیے ہمیں اپنی سوچ اور کام کرنے کے طریقہ کا تجزیہ کرنا چاہیے... ایسا میں سوچتا ہوں۔ اگر میری یہ باتیں غلط ہیں تو آپ جو بھی حکم دیں گے میں اس کو قبول کروں گا اور اسی کے مطابق کام کروں گا۔''

پدمنابھن جی خاموشی سے میری باتیں سن رہے تھے۔ ان کی چبھا دینے والی نظریں میرے چہرے پر ٹکی ہوئیں تھیں، شاید مجھے سمجھنے کی کوشش کررہے تھے۔ اچانک ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دکھائی دی جس میں میری بات سے متفق ہونے کی جھلک تھی۔

''ویری گڈ... مسٹر والمیکی! مجھے خوشی ہے یہی سوچ اور نظریات ہی تو چاہیے ہمیں... مسٹر جیٹھی! ان کی کرسی میرے سامنے والے کمرے میں لگا دو اور انھیں آزادانہ طور سے کام کرنے دو۔ ان کے کام میں آپ کسی طرح کی

مداخلت نہیں کریں گے۔اٹ از کلیر... یا آپ کو بھی کچھ کہنا ہے؟''
پدمنا بھن نے حکم دیا۔

''ٹھیک ہے سر! جیسے آپ کہیں۔''

جیٹھی جی نے بے حد مریل لہجے میں حامی بھری۔ لیکن ان کا چہرہ اتر گیا تھا بغیر کچھ بولے وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

پدمنا بھن جی کے حاکمانہ فیصلے سے جیٹھی جی کو گہرا صدمہ پہنچا۔انھیں اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی کچھ ہو جائے گا۔ پورے دفتر میں ان کے ہی فیصلے اور حکم کی تعمیل ہوتی رہی تھی، کوئی ان کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سب میں نے پہلی ہی ملاقات میں اچھی طرح جان لیا تھا، لیکن میرے معاملے میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے اور اندر ہی اندر بری طرح کڑھتے رہے۔ دراصل جیٹھی جی پہلے ہی دن کچھ ایسا کرنا چاہتے تھے کہ میں ان کی حکمرانی قبول کرلوں، مگر انھوں نے تھوڑی جلد بازی سے کام لیا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ میرے نام کی وجہ سے میرے بارے میں پہلے ہی رائے قائم کر چکے ہیں۔ انھیں لگا کہ میں بھی ریزرویشن کی وجہ سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ جیسا کہ اکثر و بیشتر سرکاری دفتروں میں دلت ذات سے آئے افسروں اور ملازمین کے لیے نظریہ بنا لیتے ہیں، وہی غلطی جیٹھی جی سے ہوئی۔ اس لیے میں نے دل ہی دل میں یہ طے کرلیا کہ میں جیٹھی جی کو ناراض نہیں کروں گا کیوں کہ وہ مجھ سے سینئر ہیں اور لمبے عرصہ تک ان کے ساتھ ہی کام کرنا ہے۔ اس لیے میں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ جو بھی ہوا، لیکن مجھے جیسے ہی موقع ملے گا میں اپنی بات ان کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

لیکن جیسے ہی میں اپنی سیٹ پر پہنچا آفس کا ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ تمام لوگ ایسے بیٹھے ہوئے تھے کہ ابھی ابھی کسی کی تدفین سے واپس آئے ہوں، ہر طرف خاموشی، نہ کوئی ہلچل مجھے ایسا لگا کہ کہیں میں کسی غلط جگہ پر تو نہیں آ گیا۔ کچھ دیر میں اپنی سیٹ پر اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ شاید جیٹھی جی کچھ کہیں گے، لیکن جیٹھی جی سگریٹ کے لمبے لمبے کش کچھ اس طرح کھینچ رہے تھے کہ آج ہی پیکٹ کی تمام سگریٹیں ختم کر دیں گے۔

کچھ دیر تک تو میں بھی اس ماحول کا حصہ بن کر چپ چاپ بیٹھا رہا،لیکن وہ خاموشی جیٹھی جی کے دھوئیں میں مل کر گھٹن پیدا کرنے لگی۔میرے لیے یہ ماحول نا قابل برداشت ہوگیا۔میں نے آفس کے لیبر کو آواز لگائی جو ریکارڈ روم میں سب سے پیچھے کھڑا تھا۔وہ بھی اس ماحول کا مزہ لے رہا تھا۔میرے آنے سے پہلے جو بھی اس آفس میں ہوا ہوگا وہ اسے دیکھ اور سن چکا تھا۔میرے پاس آکر لیبر نے کہا:''سر''

''دیکھو میری سیٹ ابھی اسی وقت پدمنا بھن صاحب کے سامنے والے آفس میں شفٹ کرنی ہے۔ساتھ ہی یہ ڈرافٹنگ مشین بھی جائے گی۔یہ کام اکیلے آپ سے نہیں ہوگا۔دو تین مزدوروں کی ضرورت اور پڑے گی۔دیکھو!کہاں سے لاؤ گے..؟اگر کسی سے کچھ کہنا ہوگا ہو تو بتا دینا،میں کہہ دوں گا،لیکن یہ کام ابھی ہونا ہے۔پدمنا بھن صاحب کا حکم ہے یہ دھیان رکھنا۔''

میں نے اپنی آواز کو تھوڑا بلند کر کے کہا تھا تا کہ پورا آفس ٹھیک سے سن لے۔میرے اس حکم سے جیٹھی جی کے چہرے پر مزید بے چینی ظاہر ہونے لگی۔انھوں نے پہلی سگریٹ ختم ہونے کے بعد دوسری سلگالی جیسے سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ اپنے اندر اٹھتے غصہ کو پی جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

آفس کے زیادہ تر لوگ برسوں سے جیٹھی جی کے سایہ میں اپنی اپنی نوکری کسی طرح چلا رہے تھے۔اپنے محدود علم کی وجہ سے مکمل طور پر جیٹھی جی پر منحصر تھے۔شاید یہی وجہ تھی کہ وہ سب ان کے آگے دبے رہتے تھے۔جیٹھی جی جو کہتے وہ سب آنکھیں بند کر کے اس پر چل پڑتے۔اس لیے سب اپنے سر کو جھکائے کام میں لگے رہنے کی مشغولیت کچھ زیادہ ہی دکھا رہے تھے۔اپنی سیٹوں پر ایسے چپکے ہوئے تھے کہ جیسے 'فیوی کول' سے چپکا کر انھیں بٹھا دیا گیا ہو۔میرے لیے یہ ماحول بہت زیادہ تکلیف دہ تھا۔ایک طرح سے جو ہوا اچھا ہی ہوا۔مجھے دوسرے ہی دن اس گھٹن سے چھٹکارا مل گیا۔لیکن افسوس بھی ہوا کہ اپنے ہی ساتھیوں کے درمیان اتنی جلدی میرے خلاف

ماحول پیدا ہو جائے گا یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا، میں تو سب کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کا حامی رہا ہوں، الگ تھلگ رہ کر کام کرنا میری عادت میں نہیں۔ ویسے بھی مجھے اپنے برخلاف حالات میں جوجھنے کی عادت سی ہو گئی ہے، جو اس نئے ماحول میں دم توڑ رہی تھی۔ اس کے لیے میں ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھا، لیکن اپنے سے اعلیٰ افسر کے حکم کی عدولی یا خلاف ورزی کرنا میرے اصولوں کے خلاف ہے۔ وہ میرے باس ہیں اور مجھے ان کے ہی سسٹم کے ساتھ جڑ کر کام کرنا ہے۔ پر کہیں اندر سے ایک آواز سنائی دے رہی تھی کہ جیٹھی جیسا آدمی آگے چل کر میرے لیے سر دردی پیدا کر سکتا ہے، اس لیے جو ہوا ٹھیک ہی ہوا کہ ان کی بنائی ہوئی دنیا کا حصہ بننے سے پہلے ہی اس سے الگ ہو گیا۔

دہرادون پہنچنے پر سب سے بڑی مشکل ہمارے سامنے مکان کی آئی۔ اندریش نگر میں ماما کا گھر تھا۔ میرا بڑا بھائی جسبیر انھیں کے گھر پر رہتا تھا۔ جتیسر جو جسبیر سے چھوٹا تھا وہ بھی اندریش نگر ہی میں اپنی بیوی بچوں کو ساتھ الگ رہتا تھا۔ دونوں گھروں میں سے کسی کے پاس اتنی جگہ نہیں تھی کہ ہم بھی وہاں رہ سکیں۔ ہماری گرہستی کا اتنا سامان ہو چکا تھا کہ ان کے ساتھ رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ساس سسر کلالوں والی گلی میں لکڑی کے پھٹوں سے بنے چھوٹے سے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ ساتھ ہی تھوڑی سی جگہ تھی جس میں صرف ایک چارپائی آسکتی تھی۔ ہمارے آجانے سے کسی طرح سونے کی لیے جگہ بنانی پڑی تھی۔ دقت تھی تو نہانے اور قضائے حاجت کی۔ باہر کھلے میں نہانا پڑتا تھا۔ چندا کا دل تھا کہ جب تک مکان نہیں مل جاتا ہم اماں اور ابا کے ساتھ ہی رہیں گے، پریشانی تو ضرور ہوگی لیکن کافی عرصہ سے وہ دونوں اکیلے رہ رہے تھے اگر ہم کچھ دن ساتھ رہیں گے تو انھیں بھی اچھا لگے گا۔ میں تو صرف رات میں سونے کے لیے ہی وہاں رہنا تھا۔ دن بھر تو آفس میں ہی گذارتا۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اگر تمھیں کوئی دقت نہیں ہے تو رہ لو۔

روزانہ ہی صبح کے کاموں کے لیے جلدی اٹھ کر ریلوے اسٹیشن چلا جاتا تھا۔ صبح

کے تمام کاموں سے فارغ ہو کر ہی واپس آتا۔ اس کے بعد ناشتہ کر کے آفس کے لیے نکل جاتا۔ کلالوں والی گلی سے اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا۔ بس ۱۰ ر سے ۱۵ ر منٹ کا ہی پیدل راستہ تھا، اسی بہانے صبح کی سیر ہو جاتی تھی۔

چندر پور سے روانگی کے وقت ہم نے سارا سامان ٹرین میں بک کروادیا تھا وہ ابھی دہرادون نہیں پہنچا تھا۔ میرے لیے یہ امتحان کے لمحات تھے۔ دفتر اور مکان کی مشکل دونوں کو ہی پورا کرنا تھا لیکن ہمارے دہرادون آجانے سے ساس اور سسر کے چہروں پر خوشی کی جھلک تھی جس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کلالوں والی گلی میں جتنے بھی گھر تھے شاید ہی کوئی بچا ہو جہاں اماں نے جا کر یہ نہیں کہا ہو:

''میری بیٹی اور داماد دہرادون آ گئے ہیں۔ داماد بم فیکٹری میں افسر ہے۔''

جو بھی ملتا سب سے ہی وہ کہتیں، کبھی کبھی مجھے عجیب سا لگتا لیکن خوشی ظاہر کرنے کا یہ ان کا طریقہ تھا جس کو دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آجاتی تھی۔ میں نے اماں سے ہنس کر کہا بھی:

''ایسا افسر جس کے پاس سر چھپانے کے لیے گھر تک نہیں ہے جو کرائے کے مکان کے لیے در در بھٹک رہا ہے۔ جسے کوئی بھی اپنا مکان کرائے پر دینے کو تیار نہیں۔''

اس وقت ابا حوصلہ دیتے: ''مل جائے گا مکان بھی، جی چھوٹا نہ کرو، سڑک پر تو نہیں بیٹھے ہو، جھوپڑی ہی سہی، ہے تو۔''

تب مجھے لگتا کہ ان لوگوں نے تنگ دستی کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہے اور وہ اسی میں خوش ہیں۔ اس سے زیادہ کی انھیں خواہش بھی نہیں یا اسے پالینے کے لیے کبھی کوشش بھی نہیں کی۔ کتنا صبر ہے ان لوگوں میں... ان کے اندر پختہ یقین کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ کیا انھیں کبھی نہیں لگا کہ وہ بھی اچھے مکان میں سہولیات کے ساتھ آرام سے رہیں۔ ایسے ہی ایک دن میں نے ان سے کہا بھی تھا:

''مکان مل جائے گا تو اس جھونپڑی کو چھوڑ کر ہم لوگ ساتھ رہیں گے۔''

اماں تو چاہتی تھیں کہ وہ ہمارے ساتھ رہیں لیکن ابا ایک دم کہا کرتے:

''نا بیٹا! ہم تو یہیں ٹھیک ہیں، اسی میں زندگی تھوڑی سی بچی ہے وہ بھی گذر جائے گی... آپ لوگ خوش رہو، ہاں آپ کی ماں جانا چاہیں تو انھیں لے جانا۔ میں تو اسی جھوپڑے میں باقی وقت بھی کاٹ لوں گا۔''

ایسے لمحوں میں میرے ذہن کے ریشے گھر گھرانے لگتے تھے کہ اپنے دل میں کس قدر اطمینان پالے بیٹھے ہیں۔ کسی بھی طرح کے بدلاؤ کی جیسے امید ہی ختم ہو چکی ہے۔ یہ پل مجھے گہری چوٹ دیتے تھے میں اندر ہی اندر ٹوٹنے لگتا تھا۔

سب سے پہلے ٹرین سے میرا اسکوٹر آیا۔ اس وقت میرے پاس لیمبی اسکوٹر تھا۔ جیسے ہی چندا کو پتہ چلا کہ اسکوٹر آ گیا وہ میرے آفس سے واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ کوئی اور تھا بھی نہیں جو اسٹیشن سے گھر تک اسکوٹر کو چلا کر لا سکے۔ لیکن ابا نے چندا سے ریلوے کی رسید لے لی۔

''دیکھتا ہوں، کوئی لڑکا مل جائے گا تو میں لے کر آتا ہوں۔''

اور بغیر دیر کیے وہ اسٹیشن کے لیے نکل گئے۔ چندا نے ان سے کہا بھی تھا:

''انھیں آ جانے دیجیے اسکوٹر میں پٹرول بھی نہیں ہے وہ بھی ڈلوانا پڑے گا، بنا پٹرول کے وہ چلے گا کیسے؟''

لیکن ابا نے اس کی ایک نہ سنی اور ایک گھنٹے بعد چندا نے دیکھا کہ وہ اسکوٹر کو پیدل ہی کھینچ کر لا رہے ہیں۔ اس پر چڑھے ہوئے خول تک کو انھوں نے نہیں اتارا تھا۔ اسٹیشن پر ریلوے پارسل میں منالال جی تھے، جن سے میرا تعارف ہو چکا تھا۔ اس لیے اسکوٹر ملنے میں کوئی دقت نہیں آئی، لیکن ان کے کہنے کے باوجود بھی ابا نے خول گھر آ کر ہی اتارا۔ وہ بغیر کسی دیری کے اسکوٹر کو گھر کے آنگن میں کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ جب میں گھر پہنچا تو اسکوٹر کو گھر کے آنگن میں کھڑا ہوا دیکھا۔ ابا نے اسے دھو پونچھ کر چمکا دیا اور اسی کے پاس بیٹھے رہے، انھیں اس بات کا خوف تھا کہ آس پڑوس کے شیطان بچے اسکوٹر کے ساتھ چھیڑ خانی نہ کریں۔ چندا نے بتایا:

''پتہ ہے خود اسٹیشن سے کھینچ کر لائے ہیں اسے!''

''کیوں؟ ارے میرے آنے کا انتظار کر لیتے!'' میں نے کہا:

''انتظار... ان کا تو بس نہیں چلا، ورنہ اسے سر پر رکھ کر لاتے تاکہ ٹائیر خراب نہ ہو جائیں۔'' چندا نے ہنستے ہوئے کہا۔

دراصل ان کی جو خوشی تھی اس کو کوئی سمجھ نہیں رہا تھا۔ جس انسان کی تمام زندگی تنگ حالی میں گذری ہو اس کے دروازہ پر جب پہلی بار اسکوٹر کھڑا ہو گا، اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس نے اسے محسوس کیا ہو۔ ان کے لیے اسکوٹر کسی امپالا سے کم نہیں تھا اس لیے وہ تھوڑی دیر کے بعد جھاڑ رہے تھے۔ یہ ان کی زندگی میں بہت بڑی خوشی تھی میں نے اسی لمحہ یہ محسوس کر لیا تھا کیوں کہ میں نے بھی تنگ دستی کی زندگی گذاری ہے جو آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے جو میرے لیے روشنی کا کام کرتی ہے اور مجھے آگے بڑھنے میں مدد دیتی ہے۔ اسی وقت ابا ایک پلاسٹک کا کنستر لے کر آئے۔

''چلو پٹرول لے کر آتے ہیں۔'' انھوں نے کہا۔

پٹرول پمپ زیادہ دور نہیں تھا۔ گاندھی روڈ پر بس اڈّے کے پاس تھا۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ کتنا لگے گا ورنہ میں پہلے ہی لے آتا!'' ابا نے کہا۔

''کوئی بات نہیں میں لے آؤں گا، آپ رہنے دو۔''

میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے اور ساتھ چلنے کی ضد کرنے لگے۔ جب ہم گھر واپس آئے تو چندا نے کہا:

''جانتے ہو، وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ان کے داماد کو یہ کنستر اٹھا کر لاتے ہوئے دیکھے، یہ ان کی عزت کا سوال ہے۔''

''کیوں... اپنا کام اپنے آپ کرنے میں کیسی شرم؟ یہ تو غلط بات ہے۔ یہ میرے بابا کی طرح ہیں۔ ان کا اسے اٹھا کر لانا میرے لیے بھی تو شرم کی بات ہے... آگے سے اس طرح کے تکلفات نہ کریں، انھیں کہہ دینا ورنہ مجھے خراب لگے گا۔'' میں نے چندا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

اسکوٹر کے آ جانے سے کرائے کے لیے مکان ڈھونڈھنے کی بھاگ دوڑ میں آسانی ہوگئی۔ ہر روز آفس سے آتے ہی کرن پور، ڈالن والا، کراسنگ، ادھوئی والا، ڈی ایل روڈ وغیرہ جگہوں پر مکان کی تلاش جاری تھی۔ تمام جگہوں پر مکان مالک جب پوچھ تاچھ کرتے تو سب سے پہلا سوال ذات کا ہی ہوتا۔ ایک مکان پسند بھی آیا مکان مالک سے کرائے کی بات بھی ہوگئی، اس وقت ہم ایک ساتھ چار لوگ تھے۔

مکان مالک نے اچانک پوچھا: ''آپ میں سے مکان کسے چاہیے؟''

انل بھاردواج نے میرے طرف اشارہ کیا:

''یہ اور ان کی بیوی، دو ہی افراد ہیں فیملی میں۔''

مکان مالک نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ کچھ جھجھکتے ہوئے سوال کیا:

''آپ کا سرنیم کیا ہے؟''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، انل ہی بولا:

''آپ کو سرنیم چاہیے یا کرایا؟''

''دیکھو جی، بعد میں جھنجھٹ نہیں چاہیے۔ ہم لوگ کماؤنی برہمن ہیں کسی ڈوم یا مسلمان کو اپنے یہاں کرائے پر نہیں رکھ سکتے۔'' اس نے فیصلہ سنا دیا تھا۔

میں نے انل بھاردواج کا ہاتھ پکڑا اور چلنے کا اشارہ کیا:

''چل انل مجھے ایسے تنگ ذہن اور بیمار لوگوں کے ساتھ نہیں رہنا، اچھا ہی ہوا انھوں نے ابھی ہی پوچھ لیا، بعد میں پوچھتے تو... شکریہ!''

میں انل کو زبردستی باہر کھینچ لایا۔ وہ لڑنے پر امادہ تھا۔ اس کے چہرے کی نسیں ابھر آئی تھیں، باہر آ کر میں نے اسے خاموش رہنے کے لیے کہا:

''انل ان سوالوں کو آپ لوگ آج سن رہے ہیں۔ لیکن بھائی... ہم تو پیدا ہوتے ہی اسے صرف سنتے ہی نہیں بلکہ ان کی زیادتیوں کو بھی برداشت کرتے آئے ہیں۔ کیوں کہ ان کو یہ سب گھٹی میں پلا کر بڑا کیا جاتا ہے،

یہ سب جنتی لوگ ہیں۔ بھلا انسانوں کی ان کے دل میں کیا عزت ہوگی،
اس لیے خاموش رہو۔ وقت بدلے گا، تمہارے جیسے لوگ بھی تو ہیں اس
ملک میں، جو ایک والمیکی کے لیے در در بھٹک رہے ہیں۔ مجھے ان کی
ضرورت ہرگز نہیں ہے، مجھے تم جیسے لوگوں کی ضرورت ہے جو میری بے عزتی
کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔'' میں نے گہرے افسوس کے ساتھ کہا۔

مہینہ بھر بھٹکنے کے بعد بھی مجھے کرایے کا مکان نہیں ملا۔ فیکٹری کی رہائشی کالونی میں نئے پروجیکٹ کے آنے سے مکانوں کی قلت تھی۔ نئی رہائشی کالونی کے بننے میں کافی وقت تھا۔ ابھی تو فیکٹری کے ڈھانچے پر ہی کام چل رہا تھا۔ رہائشی کالونی تو دور کی بات تھی۔ جب شہر میں مکان نہیں ملا تو دلتوں کی چھوٹی چھوٹی بستیوں کی طرف رخ کیا۔ وہاں بھی کوئی ڈھنگ کا مکان نہیں ملا۔ سب سے بڑی دقت بیت الخلا کی تھی، ویسے تو اور بھی پریشانیاں تھیں۔ کم سہولیات میں رہ لینے کی مجھے عادت تھی، لیکن پچھلے چند سالوں سے جس طرح کی صاف صفائی سے رہ رہا تھا ویسی نہیں مل رہی تھی ساتھ ہی آس پاس کا ماحول بھی پرسکون ہوتا کہ پڑھائی لکھائی کا کام ہو سکے۔

میرے ساس سسر جس جگہ تھے وہاں کے مکان مالک سے بھی میں کہہ چکا تھا:

'' آپ کے پاس ایک کمرہ خالی پڑا ہے کچھ وقت کے لیے ہمیں کرایے پر
دے دیجیے، ہمارا کام چل جائے گا۔''

لیکن اس نے صاف صاف انکار کر دیا۔ چندا بہت پریشان تھی۔ ماں باپ کے پاس آ کر رہنے کی اس کی خوشی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی تھی۔ چندر پور میں ہم سرکاری مکان میں رہتے تھے۔ جو بہت اچھی جگہ پر تھا، وہ مکان کافی بڑا بھی تھا۔ بہت اچھا وقت ہمارا وہاں گذرا۔

سارا گھریلو سامان ٹرین سے آ گیا تھا، جو بڑے بڑے بکسوں اور کارٹن میں بندھا ہوا تھا۔ اس کے خراب ہونے کا بھی ڈر تھا، ساس سسر نے ان میں سے کچھ پیکٹ کو مکان مالک کی ٹین کے سایہ میں رکھوا دیا...اور کچھ چندا کی بڑی بہن کے

گھر اندر لیش نگر میں رکھے ہوئے تھے۔ وہاں سے بھی ہٹانا ضروری تھا، ان کے کمرے پوری طرح بھر گئے تھے۔ وہاں بھی کتنے دن تک سامان رکھ سکتے تھے۔ ان حالات سے جوجھتے ہوئے مکان کی تلاش جاری تھی۔ میرے دوست بھی میرے لیے مکان کی تلاش میں لگے تھے۔ ذات پر کھل کر تو کوئی کچھ نہیں کہتا تھا لیکن میرے دوستوں کو بھی اس بات احساس ہونے لگا تھا کہ ذات کی وجہ سے مجھے کرایہ پر مکان نہیں مل پا رہا ہے۔ جہاں بھی گئے وہاں سب سے پہلا سوال ذات کا ہی ہوتا۔ مکان مالک صاف صاف لفظوں میں کہتے:

''نا جی... کسی چوہڑے چمار کو ہم گھر نہیں دیں گے۔''

یہ جواب سن کر الٹے پیر واپس ہونا پڑتا تھا۔ تنگ آ کر میرے دوستوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ:

''یار تیرے ماتھے پر لکھا ہے کہ تو ایس۔ سی ہے، مت بتا، تجھے دیکھ کر کوئی کہے گا تو کون ہے؟''

لیکن ان کی یہ دلیل میں قطعی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ میں جھوٹ بول کر گھر نہیں لوں گا چاہے جو بھی حالات ہوں۔ ترقی یافتہ کہے جانے والے پڑھے لکھے لوگوں کے اس شہر دہرادون کی یہ حالت ہے تو چھوٹے شہروں میں تو دلتوں کو مکان ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے جیسے پڑھے لکھے انسان کو اگر یہ شہر قبول کرنے کو تیار نہیں تو شرمندگی مجھے نہیں بلکہ اس شہر کو ہونی چاہیے۔

ان تمام حالات میں بھی میں نے اپنا حوصلہ نہیں کھویا۔ ہاں! چندا بہت ناامید ہوگئی تھی۔ اس نے کبھی ایسے حالات نہیں دیکھے تھے اور نہ ہی حالات نے اس قدر مشکل شکل اختیار کی تھی، ہاں چھوٹے موٹے واقعات کا سامنا ضرور ہوا تھا لیکن ایسی شکل میں نہیں۔ ایک دن تنگ آ کر وہ بھی بول ہی پڑی:

''کہیں دوسری جگہ تبادلہ کرالو آخر کب تک اس طرح بھٹکتے رہیں گے۔''

میں نے اسے سمجھانے کی بارہا کوشش کی:

''اتنی جلدی ہار مان گئی ہو، ابھی تو ہمیں بہت سے ایسے حالات سے گذرنا ہے جہاں ہمارا پیدا ہونا ہی ہمارے لیے لعنت کہا جائے گا۔لیکن مجھے کوئی افسوس نہیں ہے کہ میری پیدائش اس ذات میں ہوئی، میں اس کو ایک چیلنج کی طور پر لیتا ہوں...اور لیتا رہوں گا۔میں ناامید نہیں ہوں۔ ذرا ان دوستوں کو بھی تو دیکھو جو میرے ساتھ اس مہم میں شامل ہیں۔کیا وہ میری ذات کے ہیں، وہ سب تو اونچی کہی جانے والی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔اس وقت وہ سب میرے قریب ہوتے ہیں۔ میری پریشانیوں میں شریک ہوکر مجھے حوصلہ دیتے ہیں۔میں ان کے یقین کو توڑ کر یہاں سے نہیں جاؤں گا، چاہے جو بھی ہو۔اب مجھے اس شہر میں ہی رہنا ہے اور انھیں سب کے درمیان!''

اس وقت چنداا ور زیادہ ڈر گئی تھی لیکن کچھ کہہ نہیں پائی۔

ایک دو دفعہ ایسا موقع بھی آیا کی غیر دلت دوستوں نے مکان مالک کے ساتھ سختی سے بات بھی کی اور اپنا آپا ہی کھو بیٹھے۔اس وقت میں نے ہی ان کو روکا تھا۔ایسا ہی ایک واقعہ دہرادون کے ادھوئی والا میں ہوا۔اس وقت میرے ساتھ وجے بہادر اور انل بھاردواج تھے، جو مکان دکھانے کے لیے لے گئے تھے۔وجے مکان مالک کو بتا چکا تھا کہ یہ میرے بے حد قریبی دوست ہیں جو مہاراشٹر سے تبادلہ ہوکر یہاں آئے ہیں۔صرف وہ اور ان کی بیوی ہیں۔یہاں آرڈیننس فیکٹری میں افسر ہیں۔جیسے ہی سرکاری مکان ملے گا آپ کا مکان خالی کر دیں گے۔وجے نے کرایے کی بات بھی طے کر دی۔بس چندا کو مکان دکھانا تھا اور ایک مہینے کا ایڈوانس کرایہ دینا تھا۔وجے نے اپنی ہی جیب سے پورے مہینے کا ایڈوانس کرایا اس شرط پر مکان مالک کو دیا کہ اگر بھابھی جی کو مکان پسند آ گیا تو کل ہی مکان شفٹ کر لیں گے۔اگر پسند نہیں آیا تو یہ ایڈوانس آپ واپس کر دیں گے۔ جب ہم لوگ مکان دیکھنے پہنچے اس وقت مکان مالک گھر پر ہی موجود تھے۔چندا کو گھر پسند آیا۔پہلی ہی منزل پر جس میں دو کمرے

ایک باورچی خانہ ہے اور باتھ روم سب کچھ بہتر تھا۔ سامنے کھلی چھت اور کپڑا سکھانے کے دو تار بھی بندھے ہوئے تھے۔ میں نے وجے سے پوچھا:

''کرایے کی بات ہوگئی ہے؟''

''ہاں میں نے ایڈوانس بھی دے دیا ہے، اس شرط پر کہ اگر بھابھی جی کو مکان پسند نہیں آیا تو ایڈوانس واپس لے لیں گے۔'' وجے نے کہا۔

وجے نے چندا سے بات کر کے مکان مالک کو آواز لگائی۔ وہ باہر نکل کر اوپر چھت پر ہی آ گئے۔ وجے نے کہا:

''بھائی صاحب! کل سامان لے کر آ جائیں گے بھابھی جی کو مکان پسند آ گیا ہے۔''

انل نے حامی بھری کہ مکان ٹھیک ہے۔ کہ اچانک مکان مالک نے سوال کیا:

''آپ لوگ مراٹھی ہیں۔''

میں نے کہا: ''نہیں، مہاراشٹر میں میری پوسٹنگ تھی۔ ابھی ابھی تبادلہ ہوا ہے۔ ہم لوگ یہیں اتر پردیش کے ہی رہنے والے ہیں، میری بیوی یہیں دہرادون سے ہی ہیں۔''

اسی دوران مالک مکان کی بیوی بھی اوپر آ گئی۔

''کس جاتی سے ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

وجے ابھی تک خاموش تھا، اس سوال پر وہ آگے آ گیا اور جلدی سے کہا:

''بھائی صاحب! جب میں نے آپ کو ایڈوانس دیا تھا تب تو آپ نے نہیں پوچھا تھا، اب اچانک یہ سوال؟''

''نہیں وجے بھائی آپ ناراض نہ ہوں، لیکن ہمیں بھی سماج میں رہنا ہے۔ آس پڑوس کے لوگ بھی تو جاننا چاہیں گے کہ مکان کس کو دیا ہے تب ہم کیا جواب دیں گے؟ ہم تو جات پات نہیں مانتے لیکن ہماری اس کالونی میں کوئی بھی ایس۔ سی اور مسلمان کو اپنا گھر کرایے پر نہیں دیتا

ہے۔آپ تو سب جانتے ہی ہیں وجے بھائی۔''

اس نے ساری باتیں ایک سانس میں کہہ دیں لیکن وجے ہتھے سے اکھڑ چکا تھا:

''آپ ان کو دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ یہ کس جات میں پیدا ہوئے ہیں؟نہیں بتا سکتے،ان کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں شاید یہ خود بھی اپنے بارے اتنا نہیں جانتے۔یہ میرا بچپن کا ساتھی ہے۔جبل پور میں ہم ایک ساتھ ہاسٹل میں رہے ہیں،ایک ہی تھالی میں کھانا کھایا ہے،ایک بستر پر سوئے ہیں،ایک دوسرے کے کپڑے پہنے ہیں۔ان کے گھر کے ہر ایک فرد سے میرے تعلقات ہیں،لیکن مجھے کبھی بھی اس بات کی ضرورت نہیں پڑی کہ ہم ایک دوسرے کی جاتی پوچھیں!اس کی ضرورت نہ مجھے محسوس ہوئی اور نہ میری بیوی کو،نہ میرے بچوں کو کیوں کہ میری بیوی کے یہ جیٹھ جی ہیں وہ ان کے پیر چھوتی ہے،یہ میرے بچوں کے تایا ہیں۔اپنوں سے بڑھ کر ہیں اور آپ ان کی جات پوچھ رہے ہیں۔ہم نے آپ کی جاتی نہیں پوچھی واپس کیجیے ایڈوانس،ایسے گھٹیا لوگوں کے مکان میں اپنے بھائی اور بھابھی کو رہنے کے لیے نہیں کہوں گا۔آپ جیسے تھرڈ ریٹ انسان سے میری پہچان ہے...مجھے خود پر شرم آرہی ہے...''

مالک مکان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنے کی کوشش کی تو وجے نے اسے روک دیا۔

''ایک بھی لفظ منہ سے نکالا تو میں بھول جاؤں گا کہ آپ سے میری جان پہچان ہے،پنجاب کے لمبر دار کا بیٹا ہوں...تیرے جیسے گھٹیا آدمی سے تو میرے باپو اپنے ڈنگروں کو چارا بھی نہیں ڈالنے دیتے،تو ہے کون؟...جو جات پوچھتا ہے....''

بات بڑھتی دیکھ میں نے وجے کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی،میں وجے کے غصہ کو اچھی طرح جانتا تھا۔مکان مالک اور مالکن دونوں کے چہروں پر خوف

دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی تک انل بھاردواج خاموش تھا اس نے بھی مکان مالک سے سوال کیا:

''تمہاری کیا جات ہے؟ اپنی بھی تو بتا دو، ہو سکتا ہے ہم آپ کی جات کو نیچا مانتے ہوں اور آپ کو ساتھ رہنا پسند نہ کریں!''

مکان مالک مار کھائے ہوئے فوجی کی طرح کھڑا تھا۔ اسے یہ امید نہیں ہو گی کہ ماحول اس طرح تبدیل ہو جائے گا۔ میں نے انل کو بھی اشارہ کیا:

''چلو چلتے ہیں... جناب ایڈوانس واپس کیجیے... اور ہاں جہاں پیسوں کو رکھا ہو گا وہاں گنگا جل ضرور چھڑک لینا، کہیں آپ کے ذات والوں کو خبر ہو گئی تو آپ کو آپ کی ہی ذات سے نہ نکال دیں...''

اس واقعہ کا چندا پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ انل بھی غمزدہ ہو کر اپنے گھر لوٹ گیا۔ لیکن وجے ہمارے ساتھ ہی چلا آیا۔ گھر پہنچ کر جب اماّ (میری ساس) نے پوچھا:

''کیا رہا، مل گیا مکان؟''

اس کا جواب وجے نے دیا:

''مل جائے گا اما جی! آپ کیوں فکر کرتی ہو، بھابھی جی آپ چائے بناؤ میں گرم گرم سموسے لے کر آتا ہوں.. اماں جلیبی کھاؤ گی... آتے وقت میں نے دیکھا ہے باہر سڑک پر جو دکان ہے وہاں بن رہی ہیں۔''

''وجے، تم بیٹھ کر اماں سے بات کرو میں لے کر آتا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے میں باہر نکل گیا۔ میں جانتا تھا چندا بہت مایوس ہے پر کچھ بھی کہہ نہیں پا رہی ہے، اس کے چہرے پر غم اور نا امیدی کے اثرات صاف صاف دکھائی دے رہے تھے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہی چندا نے وجے کو جانے دیا۔ وجئے کو بھی اس واقعہ سے کافی دھکا پہنچا تھا۔ جب میں اسے باہر چھوڑنے آیا تو وہ بولا:

''اگر آج تم نے مجھے نہ روکا ہوتا تو سچ کہتا ہوں اسے اٹھا کر پٹک دینے

میں دیر نہیں کرتا۔‘‘

’’نہیں وجے یہ ٹھیک نہیں ہے۔ مار پیٹ سے کسی بھی مشکل کا حل نہیں نکلتا۔ یہ تو ہزاروں سال پرانا مسئلہ ہے، اتنی جلدی لوگ کیسے چھوڑ دیں گے۔ اسی میں راستہ نکلے گا، تو زیادہ مت سوچ... اتنی جلدی ہار مان لینے سے کام نہیں چلے گا۔‘‘ میں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

وجے کو تو میں سمجھانے کی کوشش میں لگا تھا مگر میں خود بھی پریشان تھا۔ اندر اندر ہی مایوسی بھر رہی تھی جس سے میں لگاتار لڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک بار پھر میرے والمیکی نام کو لے کر گھر میں تکرار پیدا ہونے کے حالات بن گئے تھے۔ دبی آواز میں چندا کی بڑی بہن اور سرجن سنگھ اس کی طرف اشارہ کر چکے تھے۔ لیکن میں کسی بھی طرح جھوٹ کے سہارے زندگی گذارنے کا قائل نہیں، یہ میری پہچان کی لڑائی تھی ساتھ ہی مساوات نہ ہونے کے خلاف جس لڑائی میں شامل تھا اسے درمیان میں ہی چھوڑ دینا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں نے یہ طے کیا کہ اس بات پر کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں کروں گا، چاہے کسی چھوٹی موٹی دلت بستی میں جھوپڑی بنا کر ہی کیوں نہ رہنا پڑے، کیوں کہ میری مالی حالت کہیں زمین خرید کر مکان بنا لینے کی نہیں تھی۔

کرن پور میں بھولا رام کھرے کی فیملی کافی عرصہ سے رہ رہی تھی۔ چندا کی بڑی بہن سورن لتا ان کی بیوی رامیشوری کو اندریش نگر سے ہی جانتی تھی۔ ایک دن چندا کو لے کر رامیشوری سے ملنے کرن پور گئی۔ رامیشوری کی لڑکی منجو بینک میں نوکری کرتی تھی۔ جب ان سے کرایے کے مکان کی بات کی تو منجو نے کہا:

’’اسی گلی میں ڈاکٹر سندھ وانی کا مکان ہے، ان کے یہاں دو کمرے خالی ہیں۔ اگر کسی کو ابھی تک نہیں دیے ہوں گے تو میں بات کرتی ہوں۔‘‘

ڈاکٹر سندھ وانی ڈی۔ بی۔ ایس۔ کالج میں کیمسٹری پڑھاتے تھے۔ بی۔ ایس۔ سی میں منجو ان کی طالبہ رہ چکی تھی۔ ایک ہی گلی میں رہتے تھے اس لیے ملنا جلنا لگا رہتا تھا۔ منجو نے کہا:

''آپ لوگ بیٹھو میں ابھی پتہ کر کے آتی ہوں۔''

مکان خالی تھا۔ وہ بھی کسی کرایے دار کی ہی تلاش میں تھے۔ منجو نے ڈاکٹر سندھوانی سے بات کی۔

''سر میرے بھائی بھابھی کا یہاں آرڈیننس فیکٹری میں تبادلہ ہو گیا ہے، انھیں مکان چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، انھیں دکھا دو، دو کمرے اور باورچی خانہ ہے بیت الخلا اور غسل خانہ ایک ہی ہے جو سب کو شیئر کرنا پڑے گا۔''

ڈاکٹر سندھوانی نے منجو کو کمرے دکھا دیے۔ اس نے کہا:

''سر! اگر آپ کہیں تو میں انھیں گھر دکھا دوں بھابھی جی ہمارے یہاں بیٹھی ہیں۔''

''ہاں دکھا دو'' ڈاکٹر سندھوانی نے حامی بھری۔

''کرایا بھی بتا دیتے تو ٹھیک رہتا۔''

منجو نے ان کے دل کی بات جاننے کی کوشش کی۔

''کوئی بات نہیں ...تمہارے بھائی بھابھی ہیں تو کرایہ زیادہ تھوڑی ہی مانگیں گے۔ جو دل میں آئے دے دینا۔'' سندھوانی جی نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے سر! میں ابھی لے کر آتی ہوں...'' اور منجو الٹے پاؤں لوٹ آئی۔

چندا کو کمرے چھوٹے لگے تھے لیکن مکان کی پریشانی جس طرح خوفناک شکل اختیار کر رہی تھی۔ اس نے 'ہاں' کر دی۔ کرایہ بھی طے ہو گیا۔ چندا نے ڈاکٹر سندھوانی سے کہا:

''پروفیسر صاحب! مجھے تو پسند آ گیا ہے لیکن یہ شام کو آفس سے آئیں گے میں انھیں ساتھ لے کر آؤں گی۔ وہ مکان بھی دیکھ لیں گے اور آپ کو کرایہ بھی دے دیں گے۔''

کمرے چھوٹے ضرور تھے مگر یہ مکان کرن پور مارکیٹ میں تھا۔ اچھا بڑا آنگن تھا۔ مکان مالک کے علاوہ ایک کمرہ میں او پی آنند کی چھوٹی سی فیملی بھی رہتی تھی۔ کل ملا کر گھریلو ماحول تھا۔ ساتھ ہی چندا کے لیے تمام سہولیات موجود تھیں۔ گھر گرہستی کا سارا سامان رات دس بجے تک مل جاتا تھا، یعنی میرے لیے ڈیوٹی کے بعد بازار سے سامان لانے کی جھنجھٹ ختم ہوگئی تھی۔

اس طرح اچانک مکان کی پریشانی بھی ختم ہوگئی۔ ڈاکٹر سندھوانی نے بھی زیادہ سوال نہیں کیے، شاید منجو کو وہ بچپن سے جانتے تھے۔ اگلے ہی روز ہم نے اپنا سامان شفٹ کرلیا۔ کرن پور سے میرا آفس زیادہ دور نہیں تھا۔ اس لیے جگہ کم ہوتے ہوئے بھی تمام سہولیات حسب خواہش مل گئی تھیں۔ ڈاکٹر سندھوانی کے دو بیٹے اور ایک پیاری سی بیٹی پریا تھی۔ ڈاکٹر سندھوانی صبح چھ بجے سے ہی ٹیوشن پڑھانے میں مشغول رہتے تھے، دس بجے کالج جاتے دو ڈھائی بجے کالج سے واپس آتے اور پھر ٹیوشن کا سلسلہ شروع ہو جاتا جو رات کے نو دس بجے تک چلتا۔ زیادہ تر بچے بی۔ ایس۔ سی اور ایم۔ ایس۔ سی کیمسٹری کے ہی تھے۔ گھر کا ماحول پرسکون اور پڑھنے لکھنے کا تھا۔ بچے بھی خاموش عادت کے تھے۔ کل ملا کر اچانک ایک اچھی جگہ مل گئی تھی، جہاں میرے پڑھنے لکھنے کا سلسلہ بھی جلدی شروع ہوگیا۔

مکان ڈھونڈھنے میں جو دقتیں اور ذلت جھیلنی پڑ رہی تھی اس سے اچانک ہی نجات مل جائے گی اس کا تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔ بہت جلد چندا بھی ڈاکٹر سندھوانی کی فیملی کے ساتھ گھل مل گئی۔ کرن پور سے کلالوں والی گلی بھی زیادہ دور نہیں تھی اس لیے امّاں ابا کے لیے آنا جانا آسان تھا۔

نئے پروجیکٹ کے انتظامی ہاؤس اور فیکٹری کی ورک شاپ کا کام تیزی سے شروع ہو چکا تھا۔ اسی کے ساتھ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، ہاسٹل اور رہائشی کالونی وغیرہ کی بھی عمارتیں بننی شروع ہو گئیں تھیں۔ ہاسٹل رائے پور بس اڈّے کے پاس بن رہا تھا۔ کافی بڑی عمارت بننے کا منصوبہ تھا۔ ہاسٹل کی عمارت دو منزل بن رہی تھی جس میں

تقریباً ۲۰۰ رطالب علموں کے رہنے کا انتظام تھا۔آرڈیننس فیکٹری اسپتال کی چار دیواری سے ملا ہوا پولیس تھانہ بھی تھا،اسی کے ساتھ ہاسٹل کی عمارت کا تعمیری کام شروع ہوا۔ اسی کے ٹھیک پیچھے ہری بھری شال کے پیڑوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑی تھی جو دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ہاسٹل کی عمارت کی بنیاد کھود کر نکالی گئی مٹی اسی پہاڑی کے بالکل نیچے ڈالی گئی تھی۔پھینکی ہوئی مٹی کا ڈھیر بھی چھوٹی پہاڑی جیسا دکھائی دے رہا تھا جہاں مٹی ڈالی جارہی تھی ٹھیک اسی کے پاس مزدوروں نے اپنے رہنے کے لیے عارضی جھوپڑیاں کھڑی کرلیں تھیں۔ یہ مزدور زیادہ تر چھتیس گڑھ (مدھیہ پردیش) سے آئے تھے۔اس طرح تقریباً ۱۶۔۱۷رجھوپڑیاں دیکھتے ہی دیکھتے کھڑی ہوگئی تھیں۔

۲۵ر دسمبر ۱۹۸۵ء کی رات دہرادون اور مسوری میں تیز طوفان کے ساتھ تیز بارش بھی ہوئی۔دہرادون میں کافی تعداد میں اولے پڑے اور مسوری میں برف باری ہوئی جس نے زندگی کو تہس نہس کردیا۔یہ رات جھوپڑیوں میں سورہے مزدوروں کے لیے موت بن کر آئی تھی،جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔نہ ہی ٹھیکیدار نے سوچا ہوگا اور نہ ہی تعمیر سے جڑے انجینئر نے۔ویسے یہ بہت تکلیف دہ ہے کہ بڑی بڑی ڈگریاں لے کر نوکری میں آئے یہ انجینئر بھی مزدوروں کی حفاظت کو لے کر اس قدر لاپرواہ کیوں ہوجاتے ہیں؟اور سارا قصور قدرتی آفات کے ساتھ جوڑ کر خود بچ جاتے ہیں۔ اس روز بھی یہی ہوا، پہاڑی کی ڈھلان سے آنے والا بارش کا پانی جمع کی ہوئی مٹی سے ٹکرایا جس کو کچھ دیر تو یہ مٹی روکنے میں کامیاب رہی،لیکن جب پانی کی مقدار زیادہ ہوگئی تو اس نے ایک باندھ کی شکل اختیار کرلی تھی جس کو روکنے میں یہ کچی مٹی کمزور پڑ گئی اور مٹی کے ساتھ پانی سیدھے جھوپڑیوں پر چڑھ گیا،جس میں دن بھر کے تھکے ہارے مزدور گہری نیند سو رہے تھے۔یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ وہ سب نیند سے بھی نہیں جاگ پائے اور ہزاروں ٹن مٹی اور پانی ان کے اوپر چڑھ گیا۔

برسات کا پانی پہلے بھی ڈھلانوں سے بہہ کر ندی نالوں میں چلا جاتا رہا ہوگا۔ لیکن مٹی ڈالتے وقت کسی بھی انجینئر کے ذہن میں یہ نہیں آیا ہوگا کہ پانی بہہ کر کہاں

جائے گا۔ یہ حادثہ رات کے دو ڈھائی بجے کا ہے۔ رات بھر وہ مزدور مٹی میں دبے پڑے رہے۔ وقت پر کوئی دیکھ لیتا تو انھیں کسی طرح مدد مل جاتی تو شاید کچھ لوگ بچ جاتے۔ ۱۶ر جھوپڑیاں تھیں جو زمین دوز ہو گئیں۔ کنارے کی ایک جھوپڑی جو تھوڑی اونچائی پر تھی وہ بچ گئی تھی۔ جس میں دو مزدور سوئے ہوئے تھے۔ وہ صبح پانچ بجے کے آس پاس جب جاگے تو ان کی نظر وہاں پر پڑی جہاں جھوپڑیاں تھیں، جواب غائب تھیں۔ چاروں طرف کیچڑ ہی کیچڑ دکھائی دے رہی تھی۔ اس وقت اندھیرا ابھی تھا، اس لیے ان لوگوں کو صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جب دھندلکا کچھ کم ہوا تب ان کی سمجھ میں آیا اور وہ اپنے ساتھیوں کو نکالنے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ ایک جگہ سے انھیں کچھ گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی تو وہ اس طرف بھاگے۔ ان کے ایک ساتھی کا سر مٹی سے باہر دکھائی دیا۔ انھوں نے اسے بڑی مشکل سے باہر نکالا۔ وہ زندہ تو تھا لیکن اٹھ کر کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا اسے کافی چوٹ آئی تھی صرف اس کا سر اور چہرہ ہی ٹھیک تھا۔

پاس ہی میں پولیس تھانہ تھا۔ وہ دوڑ کر تھانے گیا اور سپاہیوں کو اس حادثہ کی خبر دی۔ سپاہیوں نے غنودگی کی حالت میں ان کی بات سنی تو ضرور لیکن ان کے لیے یہ صرف ایک حادثہ تھا۔ کوئی مرے یا جیے انھیں کوئی خاص مطلب نہیں تھا۔ انھوں نے کہا:

''تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو، جاؤ اور اپنے ساتھیوں کو مٹی سے باہر نکالو، ہم آتے ہیں ابھی...''

ان کا یہ منفی رویہ دیکھ کر وہ دونوں مزدور واپس آکر اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈھنے میں لگ گئے۔ دھندلکا دھیرے دھیرے چھٹنے لگا۔ رائے پور کے راستے پر کچھ لوگ آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ چہل پہل بڑھنے لگی۔ چائے کی دکانوں میں بھی ہلچل شروع ہو گئی تھی۔ مزدوروں کی چیخ پکار سے آنے جانے والوں کا دھیان ان کی طرف گیا تو لوگ مدد کے لیے دوڑے۔

لوگوں کی مدد سے مٹی میں دبے مزدوروں کو باہر نکالا گیا۔ گیارہ مزدور مر چکے تھے، باقی بری طرح زخمی تھے۔ آس پاس کے لوگوں نے ہی زخمیوں کو اسپتال بھیجنے کا

انتظام کیا۔اس کام میں پولیس کی بے حسی اور بے عملی صاف دکھائی دے رہی تھی۔جو مر چکے تھے انھیں ان ہی کے کپڑوں میں لپیٹ کر سڑک پر لٹا دیا گیا جیسے سڑک پر آوارہ جانوروں کو پھینک دیا جاتا ہے۔یہ ایک بڑا حادثہ تھا،جس کو اسی طرح لینا چاہیے تھا۔اس وقت وہاں نہ کوئی کمپنی کا ذمہ دار آدمی تھا اور نہ ہی ٹھیکے دار۔پولیس کا رویہ جس قدر منفی تھا اس سے کہیں زیادہ ٹھیکے داروں،رائے پور گاؤں کے پردھان اور آرڈیننس فیکٹری کے مزدوروں کی تنظیم کے رہنماؤں کا تھا۔ان غریب مزدوروں کی فکر کرنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔راہ چلتے لوگ دیکھتے افسوس جتاتے اور اپنے کام پر چلے جاتے۔گیارہ مزدوروں کی لاشیں سڑک پر پڑی رہیں پر کسی کے اندر کسی طرح کا کوئی احساس نہیں جاگا۔صبح کا وقت تھا لوگ دیکھتے اور اپنی اپنی ڈیوٹی پر چلے جاتے۔

اس روز ہمیشہ کی طرح آفس کے لیے اپنے مقرر وقت پر ہی نکلا تھا۔جیسے ہی لاڈپور کی چڑھائی سے میرا اسکوٹر آگے بڑھا،لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے میں بھی ٹھہر گیا۔جب میں نے پوچھا کہ کیا ہوا،تو پتہ چلا کہ ہاسٹل بنانے والے گیارہ مزدور مٹی میں دب کر مر گئے ہیں۔میں نے اپنا اسکوٹر اسی طرف موڑ لیا۔وہاں کا منظر دل دہلا دینے والا تھا۔میں نے پولیس چوکی میں جا کر پوچھ تاچھ کی لیکن بے حسی کے عالم میں بیٹھے دونوں سپاہیوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔وہ آرام سے بیڑی پیتے رہے میں نے جب ان سے کہا:

''پولیس چوکی کے پاس گیارہ لاشیں پڑی ہیں اور آپ لوگ اتنے آرام سے بیٹھ کر بیڑی پی رہے ہیں،کچھ کرتے کیوں نہیں؟''

''انسپکٹر صاحب آئیں گے تو پنچ نامہ ہوگا اسی کے بعد کوئی کاروائی ہو پائے گی...اس سے زیادہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟یہ جو بھی ہوا ہے،بلائے ناگہانی ہے۔جس پر کسی کا زور نہیں۔'' سپاہی نے کھیسے نپورتے ہوئے کہا۔

''ٹھیکے دار اور کمپنی کے دوسرے لوگ کہاں ہیں؟کم سے کم ان کا تو پتہ کر

سکتے ہیں۔مزدوروں کی ذمہ داری ان کی بنتی ہے یا نہیں؟''میں نے ان سے سوال کیا۔

''دیکھیے جناب! آپ کون ہیں ہمیں نہیں معلوم لیکن صاف صاف سن لیجیے، ہم ایک سسٹم کے تحت کام کرتے ہیں، جب تک اوپر سے آڈر نہیں آئے گا تب تک ہم اپنی جگہ سے ہلیں گے بھی نہیں...آپ جا سکتے ہیں۔''

انھوں نے پوری خباثت کے ساتھ کہا۔اس وقت مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن ان سے الجھنا ٹھیک نہیں لگا۔میں نے ان سے نرمی کہا:

''بھلے لوگو! لاشیں دھوپ میں پڑی ہیں، تھوڑی دیر میں ان سے بدبو آنے لگے گی، کم سے کم انھیں سایے میں تو کر دو، ان پر کوئی کپڑا ڈلوانے کا ہی انتظام کرا دو، اتنا تو انسانیت کے ناتے بھی کر سکتے ہو ابھی وہاں بھیڑ جمع ہے، کچھ لوگ مدد کے لیے آگے آ ہی جائیں گے۔''

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اٹھ کر اپنے ڈنڈے ہلاتے ہوئے ان لاشوں کی طرف چل دئے۔پولیس کو آتا دیکھ کر لوگ وہاں سے کھسکنے لگے اور ساتھ ہی لوگوں میں کانا پھوسی ہونے لگی۔وہاں کھڑے لوگوں میں آرڈیننس فیکٹری میں کام کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔پولیس والوں کو وہاں دیکھ کر میں اپنے افس آ گیا۔

فیکٹری میں آ کر میں نے مزدور تنظیم کے نیتاؤں سے مل کر بات کرنے کی کوشش کی۔سب ہی سے میں نے کہا کہ وہاں گیارہ مزدوروں کی لاشیں پڑیں ہیں پانچ بری طرح زخمی ہو کر اسپتال میں ہیں اور آپ لوگ اس قدر مطمئن بیٹھے ہیں کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔کم سے کم ان مزدوروں کے لیے کچھ تو کرو۔

اس وقت فیکٹری میں دو بڑی تنظیمیں کام کر رہی تھیں۔ایمپلائیز یونین اور دوسری انٹک، ایک کمیونسٹ خیالات سے متاثر تھے تو دوسرے کانگریس کے حامی۔ان دونوں کا ایک ہی جواب تھا:

''وہ ہمارے آدمی نہیں تھے اور نہ ہی ہمارے تنظیم کے تھے۔ہم ان کے

لیے کچھ نہیں کر سکتے۔'' اس جملے نے میرے بچے کچے یقین کو بھی چور چور کر دیا۔

ان دنوں ایمپلائز یونین کے مکھرجی اور نوٹیال تیز نیتاؤں میں گنے جاتے تھے۔ پوری فیکٹری میں ان کا اچھا خاصا دبدبہ تھا۔ ان کے منہ سے اس طرح کے جواب کی امید میں نے نہیں کی تھی، ان کے اس رویہ کو دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ اس کے بعد وہاں سے میں رائے پور گاؤں کے پردھان سے ملنے گیا۔ بہت ڈھونڈھنے کے بعد بھی پردھان جی نہیں ملے۔ میں دوپہر ڈھائی بجے تک بھٹکتا رہا۔ لیکن ایسا ایک بھی آدمی مجھے نہیں ملا جو ان مزدوروں کے لیے ذرا سا بھی افسوس دکھا کر کچھ کرے۔ ٹھیکے دار کو ڈھونڈھا تو وہ بھی غائب۔ کنسٹرکشن کمپنی کے منیجر اور انجینئر کو تلاش کیا۔ سب کے سب کہیں باہر چلے گئے تھے وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ کل ملا ہر جگہ سے نا امیدی ہی ملی۔ آخر تھک ہار کر میں نے پولیس کے افسروں سے بات کی اور ان لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوایا، تاکہ وہ سڑک پر کھلے میں پڑی پڑی سڑنے نہ لگیں۔ ان کے گھر کے بارے میں کسی کو کوئی معلومات نہیں تھی، اس لیے کسی کو کوئی خبر بھی نہیں دی جا سکتی تھی۔ اگلے روز ٹھیکے دار کا ایک بیان اخباروں میں چھپا کہ وہ ہمارے مزدور نہیں تھے۔ کیسے یہاں آئے ہم نہیں جانتے۔ بارش اور ہوا سے بچنے کے لیے ان جھوپڑوں میں آ کر کہیں سے چھپ گئے تھے۔ اخباروں میں چھپی ان سطروں کا مطلب صاف تھا کہ ٹھیکے دار اور کنسٹرکشن کمپنی کوئی بھی ان کی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں ہیں۔ یہ حادثہ میرے یقین کو توڑنے کے لیے کافی تھا۔ تنظیم سے لاتعلق مزدور کی زندگی کتنی غیر محفوظ ہے۔ ان کی فکر کرنے والا کون ہے؟ کیا وہ اسی طرح لعنت بھری زندگی گذارنے کے لیے ہیں۔ سارے سماج کو جیسے لقوا مار گیا ہو تنظیم سے لاتعلق مزدوروں کی زندگی کتے بلیوں سے بھی گئی گذری ہے۔ یہ سوچ سوچ کر میرے دماغ کی نسیں پھٹی جا رہی تھیں۔

اس حادثہ نے مجھے اندر تک جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کئی راتوں تک میں ٹھیک سے سو بھی نہیں پایا۔ آفس کے کام میں بھی دل نہیں لگا۔ بار بار ان مزدوروں کی لاشیں میری

آنکھوں کے سامنے آجاتی تھیں، جن کو میں بھول ہی نہیں پا رہا تھا۔ میرے لیے یہ صرف قدرتی آفت نہیں تھی۔

میں نے اپنی سطح پر مختلف لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کی تھی تا کہ ان مزدوروں کو انصاف مل سکے لیکن کسی کے پاس اس موضوع پر سوچنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ جہاں بھی جاتا نا امیدی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ ایک وکیل سے بھی بات کی تھی مگر اس نے بھی صاف انکار کر دیا کہ میں اس کیس میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا بہتر ہوگا آپ بھی اسے بھول جائیں۔ کنسٹرکشن کمپنی سے ٹکرانا اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔

اسی کشمکش میں اس حادثہ پر میں نے ''موت کا تانڈو'' عنوان سے ایک نظم لکھی تھی۔

شبد[1] ہو جائیں جب گونگے
اور بھاشا[2] بھی ہو جائے اپاہج
سمجھ لو
کہیں کسی مزدور کا
لہو بہا ہے

دھوپ سے نہا کر
جب چاندنی
کرنے لگے
اٹھکھیلیاں
دھوئیں کے بادلوں سے
سمجھ لو
اندھیروں نے اجالوں کو ٹھگا ہے

[1] لفظ [2] زبان

درد کے رشتے
جب نم ہونے لگیں
اور گیت رچنے لگیں گی
سناٹوں کی ہوائیں
سمجھ لو
آدمی کا لہو
کہیں سستے میں بکا ہے

دھرتی[1] کی گود میں
اوڑھ کر چادر آکاش[2] کی
سو گئے مزدور سبھی
تھک ہار کر
بجتا رہا
بے رحم موسم کا نگاڑا[3]
رات بھر
برفیلی ہواؤں کی لے تال پر
مون[4] کھڑا پربت[5]
کھڑا دیکھ رہا تھا چپ چاپ
موت کا تانڈو
جو مٹی کا سیلاب بن
ٹوٹ پڑا گہری نیند میں سوئے مزدوروں پر

[1] زمین [2] آسمان [3] نقارہ [4] خاموش [5] پہاڑ

گھٹ گھٹ کر
جسم ٹھنڈے پڑ گئے
سرد رات کے سناٹوں میں

چیتھڑوں میں لپٹی لاشیں
خاموشی سے چیخ رہی تھیں
ڈھونڈھ رہی تھیں
ان آنکھوں کو
جن کے اشاروں پر
کرتے تھے نرمان اوادھ گتی[1] سے
نت نئی سمبھاوناؤں[2] کا

پوچھ رہی تھی
پربت مالاؤں سے
ادھ بنی دیواروں سے
اسنکھیہ[3] سوال

شبد ہوئے بوجھل
اور بھاشا بھی ہوگئی اپاہج
ہاتھوں میں
پیروں نے پناہ دی ہو جیسے
زنجیریں بھاری

[1] بغیر کسی روک کے تعمیر کرنا [2] امکان [3] لاتعداد سوال

پرشنوں[1] کے چکرویو[2] میں پھنسے
پوچھ رہے تھے سبھی
کل مرے وہ
اب کس کی ہے
باری.........؟
اب کس کی ہے
باری.........؟
(۷ جنوری ۱۹۸۶)

نظم لکھ کر بھی میرا ذہن مطمئن نہیں ہوا۔ بار بار لگتا تھا جیسے سارے شہر کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ ایک عجیب سا ماحول بنا ہوا تھا، کہیں کوئی ہلچل نہیں۔ کسی زمانے میں اس شہر کو ریٹائرڈ لوگوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ جو سرکاری ملازمت پوری کر کے یہاں گھر بنا کر آرام کی زندگی گذارنے آتے تھے۔ مجھے لگنے لگا تھا کہ یہ شہر جو اپنی قدرتی مناظر کے لیے مشہور ہے اتنا بدصورت اور مکروہ ہوگا جو مزدوروں کی لاشیں دیکھ کر بھی نہیں پگھلا۔

۲۶/جنوری ۱۹۸۶ء یوم جمہوریہ کی ایک شام قبل یعنی ۲۵/جنوری ۱۹۸۶ء کو آرڈیننس فیکٹری دہرادون کے علاقہ میں ایک بڑے پیمانہ پر مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ فیکٹری کی انتظامیہ بلڈنگ کے سامنے کافی بڑا میدان تھا۔ جس میں یہ مشاعرہ ہوا۔ مختلف شاعروں کو یہاں مدعو کیا گیا۔ مجھے بھی اس مشاعرہ میں اپنی نظم پڑھنے کا موقع ملا۔ اس وقت فیکٹری میں بہت کم ہی لوگ جانتے تھے کہ میں بھی ایک شاعر ہوں۔ کیوں کہ اس فیکٹری میں مجھے آئے ہوئے صرف چھ مہینے ہی ہوئے تھے۔ مدن شرما جی سے میری پہلے سے جان پہچان تھی۔ انھیں اچھی طرح سے معلوم تھا کہ میں بھی شاعری کرتا ہوں۔ انھیں کے اصرار پر منتظمین نے مجھے شاعروں کی فہرست میں شامل

[1] سوالات [2] بھنور

کیا تھا۔

مشاعرہ چوں کہ ڈیوٹی کے وقت میں ہی رکھا گیا تھا، اس لیے فیکٹری کے تمام مزدور، اسٹاف اور افسر سامعین کی شکل میں وہاں موجود تھے۔ جب میرا نمبر آیا تو میں نے وہی نظم سنائی جو مزدوروں کی لاشوں کو دیکھ کر لکھی تھی۔ جس کو سن مزدور اور کام کرنے والوں میں عجیب سی سگبگاہٹ ہونے لگی اور ان سب نے نظم کے خاتمے پر تالیاں بجا کر میرا حوصلہ بڑھایا۔ میرے لیے یہ کسی کامیابی سے کم نہیں تھا، کیوں کہ میرا سروکار صرف مجھ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ وہاں موجود ہزاروں لوگوں کے ساتھ منسلک ہو گیا تھا۔ جس تکلیف سے ان دنوں میں اکیلا جوجھ رہا تھا۔ وہاں مجھے ہزاروں لوگ کھڑے نظر آئے۔ حقیقتاً اس تجربہ نے میرے اعتماد کو اور زیادہ پختہ کر دیا تھا۔ یہ تجربہ مجھے تنظیم کے نیتاؤں سے ہٹ کر ایک ردّعمل کی شکل میں ملا، لیکن افسروں میں بھی ایک طرح سے خاموشی تھی۔

مشاعرے کے اختتام پر مینجنگ ڈائریکٹر رام مورتی جی نے مجھے میرے قریب آ کر مبارک باد دی۔ انھیں نظم پسند آئی تھی۔ میرے افسر پدمنا بھن جی نے میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا تھا:

''والمیکی! آپ نے کبھی ذکر بھی نہیں کیا کہ آپ شاعر ہو، سچ مچ خوشی ہو رہی ہے کہ آپ میرے ساتھ کام کرتے ہو۔ میرے لیے یہ فخر کی بات ہے۔ آپ کی یہ نظم انسانیت کی حمایت میں ہے۔ سچ مچ آج میرے دل میں تمہارے لیے اور زیادہ عزت پیدا ہو گئی ہے۔ مبارک ہو...''

یہ کہتے ہوئے انھوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اس مشاعرے سے فیکٹری کے اندر میری ایک پہچان قائم ہو گئی تھی۔ اب میں یہاں اجنبی نہیں رہا اور نہ ہی ایک ایس۔ سی جو اپنے نام کے ساتھ 'والمیکی' لکھتا ہے۔ اس نظم نے مجھے ایک پہچان دی، میرے لقب کو لے کر جو تنگ نظری تھی ختم ہو رہی تھی۔ لوگوں کا رویہّ میرے ساتھ بدل رہا تھا۔ ان کی سوچ میں تبدیلی کا رجحان نظر آ رہا تھا۔ اس وقت اس احساس نے مجھے

ہمّت دی اور میرا یقین ایک بار پھر سے مضبوط ہوا کہ ابھی کچھ ختم نہیں ہوا اُمید ابھی باقی ہے۔

فیکٹری میں ایک اور افسر پی۔سی۔ٹھاکر تھے۔لمبے اونچے رعب ودبدبے والے افسر تھے۔فیکٹری میں جس وقت دورے پر نکلتے اس وقت ان کے ساتھ تین چار چمچے جی حضوری کرنے کے لیے ضرور ہوتے۔مشاعرے کے دوتین دن بعد اچانک فیکٹری کے راستے میں مل گئے۔ساتھ میں ان کے دو چمچے بھی تھے۔مجھے دیکھتے ہوئے بولے:

''سنو! اس روز مشاعرے میں تم نے ہی مزدوروں پر نظم سنائی تھی؟''

بھاری بھرکم آواز میں سوال کیا۔

''جی میں نے ہی سنائی تھی!'' میں نے نرمی سے جواب دیا۔

''ایک افسر ہوکر وہ بھی ڈیفنس کا ایسی نظمیں لکھتے ہو؟ اگر مزدور بھڑک جاتے تو؟''

انھوں نے اپنی بھاری بھرکم آواز اور رتبے کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے مجھے ڈرانے کی کوشش کی۔لمحہ بھر کو تو میں بھی سکپکا سا گیا تھا کیوں کہ یہ سوال ایک اعلیٰ افسر نے فیکٹری کے اندر اٹھایا تھا۔معاملہ ادب اور تہذیب کا تھا،لیکن اگلے ہی لمحہ میرے اندر بیٹھے دلت ادیب نے ہنکار بھری، ڈرنا مت یہ تو سب کاغذی شیر ہیں اور میں محتاط ہوگیا۔میں نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا:

''سر! آپ فکر نہ کریں، یہاں جتنے بھی مزدور ہیں وہ سب آپ لوگوں سے اتنے زیادہ دہشت زدہ ہیں کہ کہیں کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔آپ اطمینان رکھیں، جولوگ لاشیں دیکھ کر بھی خاموش رہے وہ میری نظم سن کر کیا بھڑکیں گے۔''

میری یہ بات سن کر وہ آپے سے باہر ہوگئے زور سے دہاڑے:

''بہت بولتے ہو اپنی زبان قابو میں رکھو، ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔''

''ٹھیک ہے سر! آگے سے میری بھی یہی کوشش رہے گی کہ میں بھی زندہ

لاش بن جاؤں...."

کہتے ہوئے میں آگے بڑھ گیا۔ لیکن وہ مجھے بہت دور تک گھورتا رہا۔ میری پیٹھ پر اس کی تیز نظریں خنجر کی نوک کی طرح چبھ رہی تھیں، لیکن مجھے اس وقت اس سے کسی بھی طرح کا ڈر نہیں لگا۔

یہ گفتگو فیکٹری میں چرچا کا موضوع بنی رہی۔ اس کے ہی چمچو نے مزے لے لے کر لوگوں تک یہ بات پہنچائی تھی۔ لوگ روک روک کر اس واقعہ پر مجھ سے بات کرتے۔ کئی لوگوں نے سمجھانے کی بھی کوشش کی، پی۔ سی۔ ٹھاکر سے پنگا مت لینا، بہت سخت افسر ہے کہی نہ کہی خنس ضرور نکالے گا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا، ہاں جب کسی کام کے سلسلے میں میٹنگ میں آمنا سامنا ہوتا تو ان کی کھا جانے والی نظریں مجھے گھورتی رہتی تھیں لیکن کہتے کچھ نہیں تھے۔ عام لوگوں نے مجھے اس دلیری کے لیے ساتھ ہی دیا۔

شروع سے ہی میری زندگی کا اہم وقت دلت مزدوروں کے درمیان ہی گذرا ہے۔ ان کی خوشی و غم اور جدوجہد کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس لیے ان کے سروکاروں سے میرا گہرا رشتہ بھی رہا اور ان کے ساتھ خود کو جڑا ہوا بھی محسوس کرتا ہوں۔ نوکری میں گروپ اے کا افسر بننے کے بعد بھی میں نے اپنی رہائش انھیں لوگوں کے بیچ رکھی۔ جب کہ مجھے لگاتار رہائشی کالونی میں گھر دینے کی پیش کش ہوتی رہی ہے لیکن میں وہاں نہیں گیا۔ کئی دوست اس کو میری کمزوری کہہ کر طرح طرح کے الزامات بھی لگاتے ہیں لیکن میں نے کسی بھی بات کی پرواہ کیے بغیر اپنا راستہ نہیں چھوڑا۔

مزدوروں کے درمیان ذات ایک اہم چیز تھی جو اپنا اثر رکھتی تھی۔ ایسا ہی ایک واقعہ آرڈیننس فیکٹری میں ہوا، دو مزدوروں میں کام کرتے کرتے کسی بات کو لے کر ہاتھا پائی ہوگئی اس وقت تو دوسرے مزدوروں نے ان دونوں کو الگ کر دیا۔ سمجھا بجھا کر کسی طرح معاملہ کو رفع دفع کیا گیا، لیکن کچھ ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے دونوں کو بھڑکا کر ایک دوسرے کے خلاف رپورٹ درج کروائی تھی۔ اس وقت فیکٹری کے ایم۔ ڈی رام

مورتی جی تھے۔انھوں نے ایک دوسرے افسر رامیش ڈھنگرا کو ابتدائی تفتیش کر کے رپورٹ پیش کرنے کو کہا تاکہ حقیقت کا پتہ چل سکے اور آگے کی کاروائی کی جاسکے۔ ڈھینگرا نے دونوں کو الگ الگ بلا کر تحقیق کی ،لیکن جب رپورٹ تیار کی تو اس میں ایک دلت تھا جسے خاص طور سے ایس۔سی کہہ کر اس کے رویہّ پر سوالیہ نشان لگائے گئے تھے۔ اسے لڑاکو ثابت کیا گیا اور سچائی کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔یہ ایسی ذہنیت کو ظاہر کرتا ہے جو دلتوں کے لیے سماج میں رائج ہے اور ہر ایک دلت کو اس سے جوجھنا پڑتا ہے،ایک پڑھا لکھا افسر بھی اس سے آزاد نہیں رہ سکتا، یہ ایک کڑوی سچائی ہے۔

مینیجنگ ڈائریکٹر رام مورتی نے دونوں کو تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر مستقبل میں کسی سے بھی جھگڑا ہوا تو ان کے خلاف سخت قدم اٹھایا جائے گا۔کچھ دن کے بعد ڈھینگرا جی نے مجھ سے کہا:

''والمیکی جی! آپ کو پڑھنے لکھنے میں دلچسپی ہے یہ جان کر خوشی ہوئی،کوئی اچھی کتاب بتایئے جو مجھے پڑھنی چاہیے۔''

میں نے اس وقت انھیں یش پال جی کا (ناول) ''جھوٹا سچ'' پڑھنے کی صلاح دی۔جس کو پڑھ کر وہ بے حد غمگین لگ رہے تھے۔تقسیم ہند کے اس سانحہ کو انھوں نے شدّت سے محسوس کیا تھا اور پنجابی زندگی کے اس تکلیف دہ حادثے سے بہت ٹھیس پہنچی تھی۔دو چار ملاقاتوں کے بعد ہمارے درمیان گفتگو ہونے لگی۔ہم لمبی لمبی بحثیں کرنے لگے۔جب بھی موقع ملتا بحث کرتے۔اسی دوران میں نے انھیں مغربی ادب پڑھنے کا بھی مشورہ دیا۔دلتوں کے بارے میں ان کی سوچ اور ذہنیت میں تبدیلی آنے لگی تھی۔ انھوں نے اس بات کو بھی قبول کیا کہ وہ گھریلو رسم و رواج کی وجہ سے دلتوں کے لیے متعصب تھے۔بعد میں وہ سرکاری ملازمت چھوڑ کر ولایت چلے گئے۔لیکن جب بھی ہندوستان آتے تو وقت نکال کر مجھ سے بغیر ملے نہیں جاتے تھے۔

جنوری ۱۹۸۷ء کو میں نے ایک مختصر ڈرامہ ''دو چہرے'' کے نام سے لکھا۔جو مزدوروں اور مزدور تنظیم کے آپسی تعلقات اور اندرونی کشمکش پر مبنی تھا۔مزدوروں کی

مشکلات کو لے کر مجھے ہمیشہ اعلیٰ افسران کے غصہ کا نشانہ بھی بننا پڑتا تھا، اسی طرح مزدور کے نیتا بھی مجھ سے ناخوش تھے۔ دونوں کا رویہ منفی تھا، کیوں کہ سیاسی معاملوں میں بھی جہاں افسر کسی مزدور کی ذات دیکھنے میں مشغول رہتے وہیں تنظیم کے نیتا بھی اس معاملے میں اپنی کم ظرفی چھپا نہیں پاتے تھے۔

'دو چہرے' کی تخلیقی عمل میں یہ تمام چیزیں تھیں۔ ڈرامہ لکھنے کے بعد میں نے اس کا پہلا حصہ مزدوروں کے سامنے پڑھا، جس کو سن کر وہ سب خاموش ہو گئے تھے۔ انھیں اس ڈرامہ کے پلاٹ میں اپنی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ان دنوں آرڈیننس فیکٹری میں ایک نامکمل تھیٹر گروپ موجود تھا۔ جہاں وقت وقت پر کچھ خاص موقعوں پر ڈرامے اور ثقافتی پروگرام ہوا کرتے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کا یہ مشورہ تھا کہ اس ڈرامے کے ایک حصہ کو آرڈیننس فیکٹری کے تھیٹر گروپ کے افراد کے ساتھ کیا جائے اور ان کو یہ مناسب لگے تو اس کو اسٹیج کرنے کا بھی منصوبہ تیار کیا جائے۔

دوسرے حصہ کو جلدی ہی کیا گیا۔ تھیٹر گروپ کے افراد کو یہ اسکرپٹ بہت پسند آئی وہ اس کو اسٹیج کرنے کو بھی تیار ہو گئے۔ لیکن ایک دو لوگوں نے دبی آواز میں مخالفت بھی کی، ان کا کہنا تھا کہ یہاں کی تنظیم اس کو دیکھ کر ناراض بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے وہ اس میں شامل ہونے سے کترا رہے تھے۔ زیادہ تر افراد اس رائے پر متفق تھے اس لئے ڈرامے کی مشق شروع کرنے کا منصوبہ بنایا جانے لگا۔ اس سے پہلے ہدایت کار، اداکار کا انتخاب کرنا ضروری تھا تا کہ مشق صحیح ڈھنگ سے شروع کی جا سکے۔

دس پندرہ دن کی لگاتار مشق سے ڈرامہ نکھرنے لگا تھا۔ ڈرامے کے ایک حصّہ میں کارخانے کے مزدور تھے تو دوسری طرف گاؤں کے آس پاس کے کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور جن کی اپنی اپنی مشکلات تھیں۔ کرداروں کا انتخاب بھی اسی طرح کیا گیا تھا۔ تقریباً ایک مہینے کی مشق کے بعد ڈرامہ اسٹیج کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ تمام ساتھیوں کا یہ مشورہ تھا کہ ڈرامہ کے پہلی بار اسٹیج ہونے پر اس کے اخراجات کے سلسلہ میں منیجر سے بات کی جائے تا کہ کچھ مالی مدد حاصل ہو سکے۔ تھیٹر کے دو

عہدے داروں کے ساتھ میں خود بھی ایم۔ڈی سے ملنے گیا تھا جب انھیں بتایا گیا کہ ڈرامہ کا پلاٹ مزدوروں کی جدوجہد پر مبنی ہے تو انھوں نے سارا خرچ خوشی خوشی دینے کی حامی بھری۔ جب ہم نے ان سے کہا کہ اس ڈرامہ کا سب سے پہلے دہرادون کے ٹاؤن ہال میں اسٹیج ہونا طے ہوا ہے اس وقت آپ کو مہمان خصوصی کے طور پر ضرور آنا ہے تو وہ تیار ہو گئے لیکن ان کی یہ درخواست تھی کہ اس ڈرامے کو فیکٹری کی رہائشی کالونی میں بھی ایک بار پیش کیا جائے تا کہ یہاں کے لوگ بھی آسکیں جس کو تمام لوگوں نے مان لیا تھا۔

۳/مارچ ۱۹۸۷ء کو دہرادون کے ٹاؤن ہال میں اس ڈرامے کو پہلی بار اسٹیج کیا گیا۔ٹاؤن ہال ناظرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔اس کی پیش کش کے وقت آرڈیننس فیکٹری کے مینجنگ ڈائریکٹر،افسر،اسٹاف اور مزدور موجود تھے۔دہرادون کے سبھی اداکار ڈرامے کو دیکھنے آئے تھے۔ڈرامے کی پیش کش پر جوش تھی۔ڈرامہ کامیاب رہا۔ڈرامے کے بعد مینجنگ ڈائریکٹر رام مورتی نے آرڈیننس فیکٹری کے اندر اس کو اسٹیج کرنے کی بات پھر سے دہرائی جس کو سب نے قبول کیا اور ساتھ ہی ہم نے اسی دن تاریخ کا اعلان کر دیا۔ایم۔ڈی نے اس ڈرامے پر ہونے والے تمام اخراجات کو کمیٹی سے دلوانے کا بھروسا بھی دیا جس کو سب نے قبول کیا۔

لیکن جیسے جیسے تاریخ قریب آرہی تھی۔مزدوروں کی تنظیم کی طرف سے اسے رکوانے کی کوششیں بھی شروع ہو گئیں تھیں۔مزدور نیتاؤں سے بات چیت بھی ہوئی۔ انھیں ڈرامے کی تھیم سمجھانے کی بھی کوشش کی گئی۔لیکن وہ ضد پر اڑے رہے۔ان کا ماننا تھا کہ یہ ڈرامہ مزدور کی تنظیم کے خلاف ہے۔جبکہ ہمارا یہ کہنا تھا کہ یہ صرف دھوکے باز اور ایسے نیتاؤں کے خلاف ہے جو مزدوروں کی کسی بھی تحریک کو کمزور کرتی ہے۔ لیکن تنظیم کے نیتا کوئی بھی دلیل سننے کو تیار نہیں تھے۔ہمارے اداکار بھی اس کو پیش کرنے کی ضد پر اڑ گئے۔آخری وقت میں نیتاؤں کے دباؤ میں آکر ار کمیٹی نے مالی تعاون دینے سے صاف انکار کر دیا۔مینجنگ ڈائریکٹر سے ملاقات کرنے کے بعد بھی

کوئی راستہ نہیں نکل پایا۔ اداکاروں کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے تاریخ کو آگے بڑھایا گیا، لیکن نیتاؤں نے اداکاروں کو جوان کے تنظیم کے افراد تھے انہیں توڑنا شوروع کر دیا۔ جیسے جیسے ڈرامے کی تاریخ قریب آ رہی تھی مشکلات بڑھنے لگیں۔ ڈرامے کو اسٹیج ہونے سے دو دن پہلے تین چار اداکاروں نے مشق میں آنا بند کر دیا۔ نئے اداکاروں کو لے کر تیاری کرنا آسان نہیں تھا اس لیے ڈرامہ کو اسٹیج کرنے کا خیال چھوڑنا پڑا۔

اسی دوران دہرادون کی ''ابھینو ناٹیہ سنستھا'' نے مجھ سے اس ڈرامے کی اسکرپٹ مانگی۔ انھوں نے بہت ہی کم وقت میں ڈرامے کو تیار کیا، جس کو 'راجا رام موہن اکیڈمی' میں اسٹیج کیا گیا۔ یہ پیش کش بھی کامیاب رہی۔ ڈرامہ کی چرچا پھر سے شروع ہو گئی اور اخباروں میں چھائی رہی۔ اسی دوران فرید آباد کے ایک انسٹی ٹیوٹ نے بھی اس ڈرامے کو کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس انسٹی ٹیوٹ نے مختلف جگہوں پر اس کو کئی بار اسٹیج کیا تھا۔

دہرادون آنے کے بعد اس ڈرامے سے میری ڈرامے کی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں۔ اسی دوران 'وتاین' دہرادون نے راشٹریہ ناٹیہ اسکول نئی دلّی سے تربیت یافتہ سعید خان کی ہدایت کاری میں ایک ڈرامے کی ورک شاپ کو منعقد کیا جس میں میں بھی شامل تھا اور 'وتاین' کا متحرک رکن بن گیا۔ اس ورک شاپ میں مشق کے دوران ہی برجستہ طور پر ایک اسکرپٹ بھی تیار کرنی تھی۔ جس کے لیے اودھیش کمار مصنف کے طور پر ورک شاپ میں موجود تھے۔ ورک شاپ تقریباً تین مہینے تک چلی۔ انھیں دنوں راجستھان کا مشہور حادثہ 'روپ کنورستی کانڈ' کو ڈرامے کی بنیاد بنا کر ''کوئلہ بھئی نہ راکھ'' کے نام سے ایک ڈرامہ تحریر کیا۔ اس میں میں نے دو طرح کے کردار کیے تھے۔ ایک کردار تھا نیتا کا اور دوسرا ایک استاد کا۔ اس ڈرامے میں تقریباً تیس اداکار تھے۔ یہ ڈرامہ ۲۵ بار پیش کیا گیا تھا۔

اتر پردیش حکومت کی جانب سے بنارس میں ایک ناٹک کے ایک جلسے 'ناگری

پرچارنی سبھا گار' میں منعقد ہوا تھا۔ جس میں 'کوئلہ بھئی نہ راکھ' کی پیش کش کو پسند کیا گیا۔ بنارس کے اخباروں میں میری اداکاری کی تعریف ہوئی تھی۔ 'وتاین' کی اگلی پیش کش میں مجھے اہم کردار دیا گیا۔ جس میں میں نے ۶۵ ۔ ۷۰ سال کے ایک بزرگ کی گھریلو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا۔ جس کے ہدایت کار ''دادا'' نام سے مشہور اشوک چکرورتی تھے۔

لیکن دہرادون میں میری سرگرمیاں زیادہ لمبی نہیں چل پائی۔ میرے ساس سسر عمر کے اس پڑاؤ میں آچکے تھے جہاں ان کی خدمت کرنا میرے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے ان کو اپنے ساتھ رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ چھوڑنے کو بالکل تیار نہیں ہوئے۔ آخر میں یہی فیصلہ لیا کہ میں اپنی سرگرمیوں کو کم کر کے انھیں زیادہ سے زیادہ وقت دوں۔ صبح آفس جانے سے پہلے ان کے لیے چائے ناشتہ اور دوپہر کا کھانا لے کر جاتا۔ وہ نیو روڈ کلالوں والی گلی میں رہتے تھے۔ اور ہم دونوں کرن پور میں۔ تقریباً دو کیلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ شام کو دفتر سے واپس آتے ہی ان کے لیے رات کا کھانا لے کر جاتا، کچھ دیر ان کے پاس ٹھہرتا، گھر واپس پہنچتے پہنچتے آٹھ ساڑھے آٹھ بج جاتے تھے۔ دہرادون میں ڈراموں کی مشق کا وقت متعین تھا۔ شام پانچ بجے سے نو بجے کے درمیان یعنی میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی سب لوگ اپنے اپنے گھر جانے کی تیاری میں ہوا کرتے۔ اگر یہ ایک دو دن کی بات ہوتی تو بھی چل جاتا لیکن یہ تو روز کا کام تھا۔ ایک معمول بنانا پڑتا ہے تب جا کر تھیٹر کا نظم وضبط بنتا ہے اس لیے یہ طے ہوا کہ خود کو تھیٹر سے دور رکھا جائے۔ اس طرح تھیٹر کی سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔ یہ وہی دور تھا جب میری کہانیاں رسالہ ''ہنس'' میں شائع ہونی شروع ہوئیں تھیں۔

چھٹیوں کے دن میں اور چند ادلت بستیوں میں گذارنا پسند کرتے۔ کبھی اندریش نگر تو کبھی پیھریا پیر، جھیلی باغ تو کبھی ڈی ایل روڈ، چندر نگر وغیرہ میں ہم لوگ اکثر جایا کرتے تھے۔ اندرا کالونی میں ہریش والمیکی کے ساتھ مل کر ہم نے بستی بستی ڈاکٹر امبیڈکر کے خیالات کو عام کرنا شروع کیا تھا جس میں ہمیں کافی حد تک کامیابی بھی

ہلی۔ نوجوان طبقہ ہمارے ساتھ جڑنے لگا۔ ۶/دسمبر کو (بابا صاحب کی یوم وفات پر) اسکوٹر ریلی کامیاب ہوئی تھی۔ یہ ریلی ایک بستی سے دوسری بستی جاتی، صبح ۶/بجے سے شروع کر کے ۹/بجے تک ختم ہوتی۔ ہر ایک بستی میں ایک عام اجتماع کیا جاتا جس میں بابا صاحب کے بارے میں لوگوں کو بتایا جاتا ساتھ میں ان کے اپنے حقوق اور ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کرایا جاتا۔ رات میں ٹاؤن ہال دہرادون میں ایک اجلاس ہوتا۔ جس میں عالموں کے نظریے اور خیالات پیش کیے جاتے۔ یہ سلسلہ سالوں تک چلا جس نے دلتوں میں بے داری پیدا کی تھی۔ اس کام میں ہمارے ساتھ مختلف کالج کے طالب علم اور او۔ این۔ جی۔ سی کے آنند کمار شامل تھے۔

کافی وقت سے میں اپنے شعری مجموعے کی اشاعت کی کوشش میں لگا ہوا تھا لیکن جہاں بھی گیا نا امیدی ہی ہاتھ آئی۔ ان نظموں کے موضوع کو لے کر ہی پبلیکیشن شک وشبہات میں مبتلا تھے۔ دہرادون کے دوستوں کا اصرار تھا کہ یہی صحیح وقت ہے کم سے کم ایک مجموعہ تو آنا چاہیے لیکن جب کہیں کوئی بات نہیں بنی تو یہ طے کیا کہ اب اپنے خرچ پر ہی شائع کروانا چاہیے۔ میرے ایک دوست وجے گوڑ نے اس کی شروعات کی اور ''یگ وانی پریس'' سے بات کی۔ اس وقت 'یگ وانی پریس' کو سنجے کوٹھیال چلا رہے تھے۔ یہ بہت پرانی پریس تھی۔ یگ وانی نام سے ایک رسالہ بھی وہاں سے جاری ہوتا تھا۔ وجے گوڑ نے ان سے بات کی تو اس بات پر راضی ہو گئے کہ جو بھی خرچ آئے گا بس وہی دے دینا، اس کے علاوہ ہم ایک بھی پیسہ نہیں لیں گے۔ مسودہ ان کے حوالے کر دیا، باقی تمام ذمہ داریاں وجے گوڑ نے اپنے اوپر لے لیں۔ کتاب کا فرنٹ پیج رتی ناتھ یوگیشور نے ڈیزائن کیا تھا۔ اس مجموعے میں صرف ۱۹/نظمیں رکھی گئیں۔ اور کتاب کا نام ''صدیوں کا سنتاپ'' رکھا، میں ہر روز جا کر کتاب پر ہونے والے کام کو دیکھ لیتا تھا۔ کام کافی سنجیدگی سے ہو رہا تھا۔ یہ واقعہ فروری ۱۹۸۹ء کا ہے۔ مدن شرما جی سے شعری مجموعے کی اشاعت کے سلسلے کی میں گفتگو ہوئی تو وہ کہنے لگے:

''کتاب اشاعت میں دینے سے پہلے اپنے مینجنگ ڈائریکٹر سے

اجازت لی ہے؟''

میں نے کہا: ''نہیں''

ان کا کہنا تھا کہ اجازت لینا ضروری ہے ورنہ حکومت کسی بھی وقت آپ کے خلاف سرکاری کاروائی کرسکتی ہے۔ میں نے تمام اصولوں کو جاننے کی کوشش کی۔ ان میں صاف صاف لکھا تھا کہ ادب۔فن اور سائنس سے متعلق اشاعت کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن مدن شرما جی کا کہنا تھا کہ اجازت لے لو بعد میں کوئی بات ہوگئی تو دقت آسکتی ہے کیوں کہ ان دنوں آرڈیننس فیکٹری میں ادیبوں، فنکاروں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ایسے لوگوں کے لیے افسروں کا رویہ منفی تھا زیادہ تر افسر ایسے لوگوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ حالات بالکل مختلف تھے۔ مدن شرما جی کی بات مان کر میں نے کتاب کی اشاعت کی منظوری کے لیے درخواست بھی دے دی۔ مہینے بھر تک اس درخواست کا کوئی جواب نہیں ملا۔ تو میں شعبۂ اشاعت کے انچارج جے۔ این سنگھ سے کہا:

''مسٹر سنگھ! میں نے کتاب کی اشاعت کے لئے منظوری مانگی تھی جس کا مجھے ابھی تک کوئی جواب نہیں ملا ہے کیا یہ مان لیا جائے کہ اجازت ہے کیوں کہ میری درخواست کو ٹھیک ایک مہینہ ہوگیا ہے۔''

جے۔ این سنگھ میری بات سن کر ہڑبڑا گئے اور کہنے لگے:

''میں دیکھتا ہوں آپ کی درخواست کہاں ہے میں آپ کو بتاتا ہوں۔''

میں واپس آگیا۔ تقریباً ادھے گھنٹے کے بعد سنگھ نے مجھے فون کیا:

''آپ نے اپنی درخوست کے ساتھ نظموں کی کاپی نہیں بھیجی اس لیے ابھی تک کوئی کاروائی نہیں ہوئی ہے۔ آپ نظموں کی کاپی بھیج دیں تو ہم اس کو آگے بڑھادیں گے۔'' سنگھ نے حاکمانہ انداز میں بات کی۔

''یہ بات کہنے میں آپ کو ایک مہینہ لگ گیا۔ وہ بھی میرے یاد دلانے پر! مسٹر سنگھ میری درخواست کو آگے بڑھایئے نظموں کا مسودہ

میں نہیں دوں گا۔'' میں نے زور دے کر کہا:

''لیکن نظموں کی کاپی دیکھے بغیر یہ کیسے معلوم ہوگا کہ آپ کیا چھپوا رہے ہیں...''

''اگر میں نے نظموں کو مسودہ آپ کو دے بھی دیا تو آپ کس کو دکھائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں! ہم دیکھیں گے۔'' اس نے اینٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ؟'' میں نے سوال کیا۔

''کیوں، اتنا تعجب کیوں؟ کیا ہم ان نظموں کو دیکھ کر ان کا تعین نہیں کر سکتے؟'' سنگھ نے تیکھا سوال کیا۔

''مسٹر سنگھ! بہتر ہوگا کہ اس موضوع پر ہم مزید بحث نہ کریں جو بھی آپ کو لکھ کر دینا ہے وہ دے دیجیے۔ مجھے میری درخواست کا جواب چاہیے۔ آپ مہینے بھر سے چپ بیٹھے ہیں... کیا مجھے اعلیٰ افسروں سے اس بارے میں بات کرنی چاہیے؟'' میں نے بھی ویسا ہی تیکھا پن دکھایا، میں جانتا تھا کہ یہ ایسے نہیں مانے گا۔

''ٹھیک ہے جیسا آپ کو ٹھیک لگے۔ اگر آپ نظموں کی کاپی نہیں دیں گے تو میں اس درخواست کو آگے نہیں بڑھا پاؤں گا... معاف کریے گا، اجازت دینا یا نہ دینا ہمارے ہاتھ میں ہے۔'' سنگھ نے اپنے عہدے کا بھرپور رعب دکھانے کی کوشش کی۔

''اچھا آپ کے ہاتھ میں ہے، مجھے خبر نہیں تھی مسٹر سنگھ کہ آپ ہی اس فیکٹری کے مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں... اچھا ہوا آپ نے بتا دیا، ورنہ میں ابھی تک ایس۔ این گپتا جی کو ہی مینیجنگ ڈائرکٹر سمجھ رہا تھا... اب میری بھی سن لو، یہ نظمیں تو چھپیں گی ہی، آپ اجازت دیں یا نہ دیں۔ ہندوستان کا اصول اور سی۔سی۔ آر کا قانون میں اچھی طرح جانتا ہوں... ٹھیک ہے، ملتے ہیں جلدی ہی۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے سیدھے جوائنٹ مینیجنگ ڈائرکٹر (انتظامیہ) رتن پرکاش جی سے ملاقات کی اور اپنی پریشانی انھیں بتائی اور ساتھ یہ بھی کہ ایک مہینہ ہو گیا ہے میری درخواست کو، جو ابھی تک مسٹر جے۔این۔سنگھ کی میز سے آگے نہیں سرکا ہے۔ کیا یہ مان لیا جائے کہ فیکٹری منتظمین کو میری کتاب کی اشاعت سے کوئی دقت نہیں ہے یعنی میں اس کام کو کرنے کے لیے آزاد ہوں۔ رتن پرکاش جی نے میری بات کو سنجیدگی سے لیا:

''میں پتا کر کے بتاتا ہوں کیا معاملہ ہے۔''

انھوں نے فون کر کے سنگھ کو اپنے آفس میں بلایا۔ مجھے وہاں دیکھ کر وہ سمجھ چکا تھا کہ معاملہ پیچیدہ ہو چکا ہے۔ رتن پرکاش جی نے اس کو دیکھتے ہی سوال داغ دیا:

''کیوں مسٹر سنگھ! ان کو منظوری کیوں نہیں دے رہے ہو؟''

''سر میں نے منع تھوڑی ہی کیا ہے لیکن انھوں نے درخواست کے ساتھ نظمیں، جو شائع ہوں گی انھیں مجھے نہیں دیا ہے۔ جب میں نے مانگی تو یہ انکار کر رہے ہیں۔'' سنگھ نے صفائی دی۔

''سر! یہ بھی پوچھ لیجیے کہ انھوں نے مجھ سے کب مانگی؟'' میں نے کہا۔

اس سے پہلے کی رتن پرکاش جی پوچھتے، سنگھ اچھل پڑا۔

''سر! آج ہی ان سے کہا ہے۔''

''یعنی یہ جناب مہینے بھر خاموش بیٹھے رہے اور جب میں نے پوچھا تب یہ مسوّدہ مانگ رہے ہیں۔ مہینے بھر کا وقت ان کو کم پڑ گیا۔''

میں نے ان کو ہی الٹا کٹ گھرے میں کھڑا کر دیا۔ رتن پرکاش بات کو آگے بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا:

''دے دو مسوّدہ اس میں کیا دقّت ہے؟''

''کوئی دقّت نہیں سر! پر یہ ان نظموں کا کریں گے کیا؟ ہم عصر نظموں کے بارے میں یہ کتنا جانتے ہیں۔ یہ ہی تو میں جاننا چاہوں گا۔ نظم کے مطلب

کو لفظ بہ لفظ جب یہ پڑھیں گے تو مطلب کچھ کا کچھ نکالیں گے اور پھر میں نے اپنی درخواست میں صاف صاف لکھا ہے کہ یہ ایک ادبی کتاب ہے پھر ان کو کیا دقت ہے، یہ تو بتائیں؟'' میں نے زور دے کر کہا۔

کچھ دیر رتن پرکاش جی سوچتے رہے، پھر بولے:

''مسٹر سنگھ دے دو اجازت، والمیکی جی ایک ذمہ دار انسان ہیں۔ ان کی کتاب چھپے گی تو فیکٹری کا بھی تو نام ہوگا۔ یہ کیوں نہیں سوچتے؟ جاؤ منظوری خط بنا کر لاؤ۔ میرے دستخط لے کر انھیں دے دو، جلدی لے کر آؤ۔ تب تک یہ یہیں بیٹھے ہیں۔''

سنگھ بے دلی سے گیا۔ دراصل اس کی عادت تھی لوگوں کو چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے پریشان کرنا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر میں نے ان کو مسودہ دے دیا تو میری نظموں کو پڑھ کر مسٹر سنگھ جو فیڈ بیک اعلیٰ افسروں کو دیں گے اس کے بعد تو ''صدیوں کا سنتاپ'' کبھی چھپ ہی نہیں پائے گی کیوں کہ ان نظموں میں دلتوں کی آواز تھی۔ اس وقت تو ادبی رسالوں کے ایڈیٹر بھی ان نظموں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، وہ بے چارہ تو ایک سرکاری نوکر تھا۔ ادبی تحریک کی اس کو کیا پڑی تھی، وہ بھی ان نظموں کو پڑھ کر میرے بارے میں کچھ غلط رائے ہی بتاتا، جو میرے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتی۔

لیکن ایسی ذہنیت کے لوگ جو سرکاری عہدوں پر بیٹھے ہیں وہ چیزوں کو توڑنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ ایک بار مجموعہ چھپ گیا تو وہ اسے کبھی بھی پڑھ نہیں پائیں گے کیوں کہ پڑھنے لکھنے سے ایسے لوگ بہت دور ہوتے ہیں۔ یہ میں اتنے سالوں کے تجربہ سے سمجھ چکا تھا۔ جے۔ این سنگھ کا رویہ ویسے بھی دلتوں کے ساتھ مشکوک تھا۔ اس کو تمام لوگ اچھی طرح جانتے تھے، لیکن ان کا داؤں مجھ پر نہیں چلا۔

سنگھ کے جانے کے بعد رتن پرکاش جی نے مجھ سے پوچھا:

''مسودہ دینے میں اتنی آنا کانی کیوں ہے؟''

میں نے بنا کسی الٹ پھیر کے صاف صاف کہا:

''سر! سنگھ جیسے لوگ نظم کے اسلوب بیان کو کتنا سمجھ سکتے ہیں۔ نظم کو سیدھے سیدھے نہیں سمجھا جا سکتا۔''

''اگر اس نے ایک بار بھی آپ کو آ کر الٹا سیدھا ان نظموں کے بارے کہہ دیا ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ آپ بھی اس کی بات مان لیتے۔ اگر ان نظموں سے کوئی بھی بات سامنے آتی ہے یا ان پر کوئی الزام لگاتا ہے، ذمہ داری تو میری ہی ہے نہ مجھے بھی تو نوکری کرنی ہے کیا میں ایسا کام کروں گا جو میری نوکری کو ہی خطرے میں ڈال دے۔ نہیں سر! میں اپنی اور اپنی فیملی کی ذمہ داری سمجھتا ہوں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جو میرے راستے کا روڑا بن کر کھڑا ہو جائے۔''

اتنی جدوجہد کرنے کے بعد مجھے اجازت مل گئی۔ جب میں نے یہ سب مدن شرما جی کو بتایا تو وہ بہت دیر تک سوچتے رہے اور بولے:

''اس ڈپارٹمنٹ کو ادب جیسی چیزیں بیکار لگتی ہیں۔ یہ مصنفوں کی کبھی بھی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔''

انھوں نے یہ سب بہت ہی مغموم دل سے کہا تھا۔ اس کے بعد میری جو بھی کتاب چھپی میں نے کبھی بھی اجازت نہیں مانگی وہ پہلی اور آخری اجازت تھی۔ اس کے بعد میری بہت سی کتابیں چھپی لیکن میرے ڈپارٹمنٹ کے آفسروں کو کوئی خبر نہیں تھی۔ یہاں تک کہ میری ایک کہانی ''خانہ بدوش'' این۔ سی۔ آر۔ ٹی کی کتاب میں شامل کی گئی اور اس پر سیاسی پارٹی کے ایک گراہ نے ہنگامہ کر دیا کہ اس کہانی کو نصاب سے ہٹاؤ۔ تب بھی میرے ڈپارٹمنٹ کو کوئی خبر نہیں لگی جبکہ مہینہ بھر تک ٹی۔ وی چینلو پر بحث و تکرار ہوتی رہی۔ اس وقت تک میرے ڈپارٹمنٹ کو کوئی خبر نہیں لگی تھی۔ میں اس وقت کافی پریشان تھا کہ اگر ڈپارٹمنٹ کو اس کی خبر مل گئی تو معلوم نہیں ڈپارٹمنٹ کیا کاروائی کرے گا۔ ہو سکتا ہے میرے خلاف کوئی قانونی قدم اٹھائے لیکن انھیں پتہ ہی

نہیں چل پایا۔ایسا تھا میرا شعبہ جہاں میں نے چالیس سال نوکری کی اور محفوظ باہر آ گیا، بنا کسی داغ دھبّے کے۔

''صدیوں کا سنتاپ''شعری مجموعہ نے دلت شاعری میں اپنا ایک مقام بنالیا۔ قارئیں ہی نہیں نقادوں نے اس مجموعے کی نظموں میں دلت آواز کو محسوس کیا۔اس مجموعے کی نظموں کا ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا اور ہندی دلت شاعری کی پہچان قائم کرنے میں اس مجموعے کا اہم رول رہا ہے جس کو قارئین اور نقادوں نے سنجیدگی سے لیا۔

سنجے ان دنوں بی۔ایس۔سی میں اسی کالج میں تھا جس میں ڈاکٹر سندھوانی تھے۔ چندا نے ڈاکٹر سندھوانی سے بات کر کے سنجے کی ٹیوشن ان سے ہی لگوادی وہ صبح کی شفٹ میں آتا۔ٹیوشن کے بعد سیدھا کالج جاتا۔ایک روز وہ ٹیوشن کے لیے آیا لیکن بیچ میں سے اٹھ کر باہر آ گیا چندا نے اس سے پوچھا:

''کیا ہوا؟''

''چاچی جی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی ہے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔'' اس نے کہا۔

''چلو اندر چل کر آرام کرلو، کوئی دوالی ہے؟ کب سے ہے یہ درد'' چندا نے جاننے کی کوشش کی۔

''تھوڑا تھوڑا تو کئی دن سے تھا لیکن اس وقت بہت زیادہ محسوس ہو رہا ہے۔'' سنجے نے بتایا۔

''درد کی ٹیبلٹ دیتی ہوں۔'' چندا نے اس سے کہا۔

''نہیں تھوڑی دیر لیٹتا ہوں ...شاید اس سے آرام مل جائے...نہیں تو پھر کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔'' کہتے ہوئے وہ اندر جا کر لیٹ گیا۔

''صبح کچھ کھایا تھا یا ایسے ہی خالی پیٹ آ گئے ہو، کچھ بنادوں۔'' چندا نے کہا۔

''نہیں چاچی جی کچھ بھی کھانے کا دل نہیں ہے۔'' اس نے ٹالتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، تھوڑا آرام کرلو۔''

یہ کہتے ہوئے چندا اپنے روزمرّہ کے کاموں میں مشغول ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد ننھے اٹھ کر جانے لگا تو چندا نے پوچھا:

''کیا ہوا؟ کچھ آرام ہے؟''

''گھر جا رہا ہوں... راستے میں کسی ڈاکٹر سے دوا لیتا ہوا جاؤں گا، کالج جانے کا دل نہیں ہے۔'' کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

چندا نے اسے روکنے کی کوشش کی بھی کی۔

''ننھے سنو! یہی کرن پور میں کسی ڈاکٹر سے دوا لکھوا لیتے ہیں گھر بعد میں چلے جانا' یہی رک جاؤ۔''

''چاچی جی بس میں چلتا ہوں۔'' وہ چلا گیا۔

شام کو آفس سے واپس آیا تو چندا نے ننھے کی طبیعت کے بارے میں بتایا۔ میں نے سوچا تھا کہ جا کر ایک بار اسے دیکھ آؤں گا، لیکن امّا ابا کے پاس دیر ہوگئی تو اس روز میں ننھے کو دیکھنے جا نہیں پایا۔ اگلے دن آفس کی چھٹّی تھی ۳۱ / مارچ کو اسٹاک چیکنگ ڈے ہونے سے تمام انسٹی ٹیوٹ بند رہتے ہیں۔ ننھے کے گھر جانے کا منصوبہ بنایا، گھر سے نکلنے میں ذرا دیر ہوگئی تھی۔ تبھی دروازے کی گھنٹی بجی، دیکھا تو وملا بھابھی گھبرائی ہوئی سامنے کھڑی ہیں۔ میں نے پوچھا:

''کیا ہوا؟ ننھے کی طبیعت کیسی ہے؟''

''سمجھ میں نہیں آرہا ہے کیا کرو؟'' اس نے کہا۔

''کہاں ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''گھر چھوڑ کر آئی ہوں ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑے گا۔ تم چلو چل کر دیکھ لو کیا کرنا ہے میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا ہے۔'' وملا بھابھی نے کہا۔

''میں تو خود ہی آنے کے لیے تیار ہو رہا تھا چلو چلتے ہیں۔'' میں نے آنگن سے اسکوٹر نکالا۔

''دیدی فکر مت کرو، یہ تو ساتھ جا ہی رہے ہیں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیں گے۔'' چندا نے ان کی ہمت بندھائی کیوں کہ وہ بہت زیادہ پریشان تھیں۔

میں نے اسکوٹر تو نکال لیا لیکن شہر میں کئی دن سے پٹرول نہیں مل رہا تھا اور اسکوٹر میں پٹرول کم تھا۔ ڈر اس بات کا تھا کہ کہیں راستے میں بند نہ ہو جائے۔ جب میں اندریش نگر پہنچا تو دیکھا کہ سنجے درد سے بری طرح تڑپ رہا ہے میں نے پوچھا:

''اسکوٹر پر بیٹھ جاؤ گے یا تھری ویلر لے کر آؤں۔'' سنجے نے ہمت جتائی اور اسکوٹر پر بیٹھ گیا۔

راستے میں اس نے مجھے بتایا:

''آج صبح ہی میں ڈاکٹر منوج گپتا کے کلینک گیا تھا۔ ڈاکٹر گپتا نے چیک اپ کیا ان کا کہنا ہے کہ ایک گھنٹے کے اندر تمہارا آپریشن ہونا چاہیے ورنہ اپینڈکس کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔''

''کیا...؟ اپینڈکس؟'' اچانک میرے منہ سے نکلا۔

''تم نے اپنی ماں سے بتایا یہ سب؟''

''نہیں'' اس نے کہا۔

''کیوں نہیں بتایا؟ تم جانتے ہو اگر اس میں دیر ہو گئی تو جان کا بھی خطرہ ہوتا ہے، پورے جسم میں زہر پھیلنے کا ڈر رہتا ہے۔''

کہتے ہوئے میں اسکوٹر کی رفتار تیز کر دی میں خود بھی ڈر گیا تھا۔ سنجے کی نادانی پر مجھے بہت غصہ آیا۔ جیسے ہی ہم لوگ گپتا کلینک پہنچے قسمت سے ڈاکٹر منوج گپتا کہی جانے کے لیے باہر نکل رہے تھے، سنجے کو دیکھتے ہی چلاّئے:

''مسٹر! تم کہاں غائب ہو گئے تھے، تمہیں پتہ ہے اس وقت تم کس خطرے میں ہو...؟''

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر گپتا کچھ اور کہتے میں نے ان سے نرمی سے کہا:

''ڈاکٹر آپ جتنی جلدی ہو سکے اس کا آپریشن کیجیے...اب دیر نہ کریں۔''

''آپ اس کے کون ہیں؟'' ڈاکٹر گپتا مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''میں اس کا چاچا ہوں، اس کے پاپا گھر پر نہیں تھے شاید اس لیے یہاں کوئی فیصلہ نہیں لے پایا... پلیز! اب آپ دیر مت کیجیے۔'' میں نے ڈاکٹر کے غصّے کو کم کرنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر مڑ کر اپنے کیبن میں چلا گیا اور ہمیں آنے کا اشارہ کیا۔ سنجے کو آپریشن تھیٹر میں لے جانے سے پہلے ڈاکٹر نے ایک پیپر پر میرے دستخط لیتے ہوئے کہا تھا:

''مریض کی ماں کو بھی بلا لیتے تو ٹھیک ہوتا۔''

''آپ آپریشن شروع کیجیے میں کوشش کرتا ہوں انھیں بلانے کی۔''

میں نے کہہ تو دیا مگر ان دنوں فون جیسی سہولیات موجود نہیں تھیں۔ میں نے باہر آنے سے پہلے ڈاکٹر سے پوچھا:

''آپریشن میں کتنا وقت لگے جائے گا؟''

''پندرہ بیس منٹ میں مریض باہر آجائے گا۔ تب تک آپ باہر بیٹھیے ہم آپ کو بلا لیں گے۔'' ڈاکٹر نے مجھے یقین دلایا۔

میں باہر آ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نرس باہر آئی اور آواز لگائی:

''سنجے خیروال کے ساتھ کون ہے۔''

''کہیے! میں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ جلدی سے یہ دوائیں اور انجکشن اور کچھ ضروری سامان کیمسٹ کے یہاں سے لے کر آجائیں، جلدی آیئے گا آپریشن کے وقت ان کی ضرورت پڑے گی۔'' نرس نے ہدایت دی۔

نرس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر میں نے اسکوٹر نکالا اور دوا لینے کے لیے چل پڑا، ابھی تک اسکوٹر نے ساتھ دیا تھا لیکن کبھی بھی بند ہو سکتا تھا۔ منوج گپتا کی کلینک سے گلشن لال کیمسٹ زیادہ دور نہیں تھا لیکن دوائیاں جلدی چاہیے تھی اس لیے اسکوٹر لے کر نکلا تھا۔ دوائیاں اور انجکشن کا بل دیکھ کر میں چکرا گیا۔ کیوں کہ اتنے پیسے

میرے پاس نہیں تھے اور گھر جانے لائق اسکوٹر میں پٹرول نہیں تھا اور ایسا کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا جس سے میں چندا کو خبر کر سکوں۔ آخر میں نے کشن لال اینڈ کمپنی کے مالک سے بات کی:

''میرے پاس اس وقت اتنے پیسے نہیں ہیں، جو ہیں وہ جمع کر دیتا ہوں باقی شام تک دے جاؤں گا اگر آپ کو میرے اوپر یقین نہ ہو تو میرا اسکوٹر کھڑا ہے۔ یہ اس کی چابی ہے آپ رکھ لیں پیسے دینے آؤں گا تو اسکوٹر لے جاؤں گا۔''

مالک نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

''ڈاکٹر کی پرچی یہاں چھوڑ دیجیے۔ کوئی بات نہیں ہے آپ یہ سب دوائیں جلدی لے جائیں اسکوٹر چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کلینک کی طرف چل دیا۔ دوائیاں اور انجکشن نرس کو وقت پر دے دئے۔ دراصل جب میں وملا بھابھی کے ساتھ گھر سے نکلا تھا تو مجھے اس بات کی خبر نہیں تھی کہ سنجے کو آپریشن کی ضرورت پڑے گی۔ میری جیب میں اتنے پیسے تھے جس سے ڈاکٹر کی فیس اور کچھ دوائیاں لی جا سکیں۔

کلینک کے باہر بیٹھے بیٹھے مجھے تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا تھا اور ابھی تک سنجے کی کوئی خبر مجھے نہیں ملی پتہ نہیں کیوں میرے دل میں بے چینی سی ہو رہی تھی۔ اچانک میرے دل میں کئی طرح کے شکوک وشبہات پیدا ہو رہے تھے۔ گھر میں کسی کو بھی پتہ نہیں ہے کہ سنجے کا آپریشن ہو رہا ہے اور اس کا فیصلہ لیتے وقت میں نے کسی سے بھی نہیں پوچھا تھا، اگر کچھ غلط ہو گیا تو کیا ہوگا...دل میں طرح طرح کے سوالات اٹھنے لگے۔ میں نے آپریشن تھیٹر کے پاس جا کر معلومات کی:

''آپریشن چل رہا ہے آپ بیٹھیے۔ ڈاکٹر آپ کو بلائیں گے۔'' وہاں موجود نرس نے کہا۔

مجھے وہ وقت پہاڑ کی طرح لگ رہا تھا جو کاٹے نہیں کٹ رہا تھا ایک ایک لمحہ

تکلیف بھرا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد نرس آئی۔

''سنجے خیروال کے ساتھ کون ہے؟ ڈاکٹر بلا رہے ہیں۔''

میں دوڑ کر آپریشن تھیٹر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا چار پانچ منٹ بعد ڈاکٹر باہر آئے، ان کے ہاتھ میں ایک جار تھا۔

''دیکھئے یہ حصہ کاٹ کر نکالا ہے۔''

ڈاکٹر نے آنت کا وہ حصہ مجھے دکھایا۔ میں نے اس پر اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے پوچھا:

''سنجے کیسا ہے کتنی دیر میں باہر آ جائے گا میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔''

میرے سوالوں کی جھڑی دیکھ کر ڈاکٹر بولا:

''ریلیکس، وہ ٹھیک ہے،، بس پانچ منٹ میں باہر آ جائے گا، تب تک آپ اس کے لیے کمبل وغیرہ کا انتظام کر لیں۔ ہوش آنے پر مریض کو ٹھنڈ لگتی ہے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر پھر سے اندر چلا گیا۔

مجھے تھوڑی راحت محسوس ہوئی اور میں باہر آ کر بیٹھ گیا۔ مارچ کے مہینے میں دہرادون کا موسم سرد ہی ہوتا ہے لیکن مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ کچھ دیر میں سنجے کا ایک دوست جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتا تھا ڈھونڈتے ہوئے وہاں تک پہنچ گیا۔ میں اسے پہلے سے جانتا تھا سنجے کے ساتھ وہ ہمارے گھر بھی ایک دو بار آ چکا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میری ساری فکر غائب ہو گئیں۔ اس وقت 'ڈوبتے کو تنکے کے سہارا' جیسا محاورہ بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔ میں نے آواز لگائی ''نرنجن'' وہ دوڑ کر میرے پاس آیا۔

''چاچا جی سنجے کہاں ہے؟ میں اس کے گھر گیا تھا۔ آنٹی جی نے بتایا اس کی طبیعت خراب ہے اور آپ کے ساتھ آیا ہے کہاں ہے وہ؟''

''فکر مت کرو اس کا آپریشن ہوا ہے اپنڈیکس کا۔ بس ابھی آپریشن تھیٹر سے باہر آنے والا ہے۔ تم ایک کام کرو۔ کرن پور ہمارے گھر جاؤ وہاں جا کر سنجے کی چاچی جی سے کہنا ہم لوگ منوج گپتا کے کلینک میں

ہیں اور سنجے کا آپریشن ہوا ہے وہاں سے ایک کمبل جلدی سے لے کر
آ جاؤ، دیر مت کرنا اور یہ بھی کہنا کہ وہ خود بھی یہاں آ جائیں۔ گھر میں
جتنے بھی پیسے ہوں ساتھ لے کر آئے یہاں ضرورت پڑے گی... ہاں،
اور تم آئے کیسے ہو؟''میں نے اس سے پوچھا۔

''جی سائیکل ہے میرے پاس۔''اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے جلدی آنا۔''میں نے اس کو ہدایت کی۔

وہ بنا دیر کیے چلا گیا کرن پور وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا، وہ جلدی ہی واپس آ گیا تب تک سنجے بھی آپریشن تھیٹر سے باہر آ چکا تھا لیکن اس کو اڑھانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ نرس نے اسپتال سے صرف ایک چادر دی تھی۔ وہ ٹھنڈ سے کانپ رہا تھا لیکن ہوش میں آ چکا تھا اسے ہوش میں دیکھتے ہی میری رہی سہی فکر بھی غائب ہو گئی۔ نرنجن نے کمبل ڈالا لیکن وہ ابھی بھی بات کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔ میں نے نرنجن سے کہا:

''ایک کام اور کر دو، سنجے کی ماں کو بھی جلدی سے لے کر آ جاؤ اگر وہ
تمہارے سائیکل پر نہ بیٹھ پائیں تو ان سے کہنا کہ تھری ویلر میں
آ جائیں، میرے اسکوٹر میں پٹرول نہیں ہے ورنہ اسکوٹر سے لے
آتے انھیں۔''

''نہیں چاچا جی آپ پریشان نہ ہوں میں انھیں لے کر آتا ہوں۔''

نرنجن نے پھر سے پھرتی دکھائی۔ نرنجن کے جاتے ہی چندا بھی وہاں آ چکی تھی جتنے بھی پیسے تھے وہ لے کر آ گئی۔ چندا کو دیکھ کر ہی نہ جانے مجھے کیوں تقویت ملی، میں نے کہا:

''تم سنجے کے پاس ٹھہرو میں کشن لال کے پیسے دے کر آتا ہوں ساری
دوائیاں ادھار لے کر آیا تھا۔''

پیسے دینے کے لیے میں پیدل ہی نکل پڑا میرے واپس آنے سے پہلے ہی

وملا بھابھی وہاں پہنچ چکی تھیں ۔انھیں دیکھ کر اب میں پوری طرح پرسکون ہوگیا۔اب سنجے ہوش میں آ چکا تھا۔جب وملا بھابھی کو پتہ چلا کہ آنت کاٹ کر نکال دی گئی ہے تو وہ کافی پریشان ہوگئیں۔میں نے انھیں سمجھایا کہ اگر آپریشن میں تھوڑی دیر بھی ہو جاتی تو سنجے کے لیے مشکل کی گھڑی ہوتی ۔میرلیے وہ لمحے بہت تکلیف سے بھرے ہوئے تھے جس وقت سنجے کا آپریشن ہورہا تھا۔اگر کچھ غلط ہو جاتا تو زندگی بھر کے لیے میرے فیصلے کی وجہ سے مجھ پر دھبّہ تو لگ جاتا، نہ ماں کی رضامندی اور نہ باپ کی اور آپریشن کا فیصلہ اپنے اوپر لے لیا اور ایک بات کہ میرے جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں سنجے کے لیے دوائی لا سکتا یہ تو دکاندار کی انسانیت تھی کہ اس نے ہزاروں روپئے کی دوا ادھار دے دی ورنہ میں پیسے مانگنے کہاں جاتا۔حقیقت میں میرے لیے وہ وقت کسی تکلیف سے کم نہیں تھا۔زندگی میں پہلی بار خود کو اتنا اکیلا محسوس کیا کہ بتا نہیں سکتا۔ وقت پر سرجن نے آ کر جو حوصلہ مجھے دیا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

سنجے کے پاپا جیسیر رات کے دس بجے گھر پہنچے تو گھر میں تالا دیکھ کر آس پڑوس میں پتہ کیا کہ سنجے اور ان کی ماں کہاں ہیں؟ پڑوسیوں نے بتایا کہ سنجے کی طبیعت خراب ہے اور کسی اسپتال میں ایڈمٹ ہے لیکن کوئی بھی پڑوسی اسپتال کا نام نہیں بتا پایا۔کسی کو اسپتال کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔وہ سب سے پہلے 'دون' اسپتال گئے، جب وہاں کچھ پتہ نہیں چلا تو منوج گپتا کے اسپتال گئے لیکن وہاں سب کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔انھیں اندازہ بھی نہیں تھا کی سنجے کی طبیعت اچانک اس قدر خراب ہو جائے گی ۔وہ دن میری زندگی کا ایسا دن تھا جس کو میں کبھی بھول نہیں پاؤں گا۔ سنجے جلدی ٹھیک ہو کر گھر واپس آ گیا۔سب خوش تھے سب سے زیادہ خوشی مجھے تھی۔ کیونکہ سنجے کے ساتھ ساتھ ان دو ڈھائی گھنٹوں کی تکلیف کو میں نے بھی سہا تھا۔

جولائی ۱۹۹۱ء میں راجیند ریادو، گری راج اور پریم ودکسی ذاتی کام سے رشی کیش آئے تھے۔دہرادون کے تخلیق کاروں کو جب یہ خبر ملی تو انھیں دہرادون لے آئے۔ ان کے رہنے کا انتظام یمنا کالونی کے مہمان خانے میں کیا گیا۔ان دنوں حماد فاروقی

یمنا کالونی میں ہی رہتے تھے۔اس رات بہت سے تخلیق کاران سے ملاقات کرنے آئے تھے۔اس وقت تک 'ہنس' افسانوی ادب میں اپنا مقام بنا چکا تھا۔راجیند ریادو، گری راج کشور اور پریم ود سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔گری راج کشور جی میرے نام سے واقف تھے۔ان کے ناول ''پری شششٹ'' کے چھپنے پر میری ان سے کافی لمبی اور تیکھی خط و کتابت ہوئی تھی۔

یہ وہ وقت تھا جب ہندی رسالوں میں مراٹھی سے ترجمہ ہو کر دلت تحریریں تو خوب چھپ رہی تھیں لیکن ہندی مصنّفوں کی تحریریں نہیں چھپتی تھیں۔اس روز راجیند ر یادو سے میری کافی تیکھی نوک جھونک ہوئی۔وہ میری کہانیاں ہی نہیں بلکہ وہ میری نظمیں بھی واپس کر چکے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ ہندی میں مراٹھی جیسی تخلیقات نہیں ہو رہی ہیں۔میں نے ان کو ٹوکا تھا کہ یہ موازنہ بے ایمانی ہے۔ایک زبان کی تحریروں کا دوسری زبانوں کی تحریروں سے وصف کی بنیاد پر موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔کیا ہندی ادب کا موازنہ روسی، فرنچ یا انگریزی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے؟ تمام زبانوں کا اپنا اپنا معیار ہے۔ہندی کا اپنا مزاج اور ماحول ہے۔مراٹھی کی کمزور تحریروں کے ترجمہ کو بھی آپ دلت تحریروں کے نام سے خوب چھاپ رہیں ہیں، لیکن ہندی دلت تحریروں کو ٹھیک سے پڑھے بغیر ہی واپس کر دیتے ہیں۔شاید اس لیے کہ ہندی تحریریں آپ لوگوں کے دروازے پر کھڑی دستک دے رہی ہے۔زیادہ تر ایڈیٹر یہی کہتے ہیں کہ مہاراشٹر جیسے حالات ہمارے یہاں نہیں ہیں لیکن میں نے راجیند ریادو جی سے کہا تھا کہ تمام ملک میں حالات ایک جیسے ہی ہیں یہ تعصب ہی ہے جو ایڈیٹر کے فیصلے کو متاثر کرتا ہے۔اس لیے دلت تحریروں کو لے کر ہندی میڈیا بھی سنجیدہ نہیں ہے۔ان کی سوچ اور ذہنیت پر ذاتی تعصب حاوی ہے۔یہ بحث کافی لمبی ہوئی بعد میں راجیند ریادو جی نے اس کو نشانہ بناتے ہوئے اداریہ بھی لکھا تھا۔اسی دوران میں نے ان کو ''بیل کی کھال'' کہانی بھیجی تھی جس کا انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

اچانک مجھے کسی گھریلو کام سے دلّی جانا پڑا۔کام ختم کر کے میں نے سوچا کہ

'ہنس' کے دفتر جا کر اپنی کہانی کے بارے میں پتہ کر لیتا ہوں اگر وہ نہیں چھاپ رہے ہیں تو کہیں اور دے دیں گے۔ اس وقت وہاں راجیند ر یادو جی کے پاس کافی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن مجھے اس بات پر حیرانی ہوئی کہ دہرادون کی چھوٹی سی ملاقات سے کئی مہینے کے بعد بھی راجیند ر یادو جی نے مجھے پہچان لیا۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کہا:

''اوم پرکاش! آؤ کیسے ہو؟''

انھیں میرا نام یاد تھا۔ یہ میرے لیے ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ میں وہاں کافی دیر تک رہا۔ اسی دوران دلّی کے بہت سے ادباء کی آمد ورفت تھی۔ کافی لوگوں سے تعارف ہوا۔ میں اپنی کہانی کے بارے میں پوچھنے کی ہمّت ہی نہیں جٹا پایا۔ جب میں اٹھ کر چلنے لگا راجیند ر یادو جی نے کہا:

''اوم پرکاش! اپنی کچھ نظمیں بھیج دینا۔''

دہرادون آکر نظمیں بھیجنا بھول گیا۔ اچانک ۱۹۹۱ء کے وسط میں یاد آیا کہ راجیند ر یادو جی نے ہنس کے لئے کچھ نظمیں مانگی تھیں۔ میں نے بے دلی سے پانچ چھ نظمیں اگلے ہی روز بھیج دیں یہ سوچ کر کہ شاید چھپ جائیں۔ کہانی کے سلسلے میں ان کے طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ ایک ہفتے بعد راجیند ر یادو جی کا ایک خط آیا کہ:

''اوم پرکاش! نظمیں ہنس میں شائع ہونگی، اور نہ بھیجیں تھوڑا انتظار ضرور کریں۔''

یہ خط مختصر تھا لیکن میرے لیے یہ معنیٰ خیز ثابت ہوا۔ اس وقت تک میری دلت نظمیں کسی بھی اخبار یا رسالے میں نہیں چھپی تھیں جبکہ دلت رسالوں میں لگاتار چھپ رہی تھیں۔ 'ہنس' کے جولائی ۱۹۹۲ء کے نمبر میں یہ نظمیں ایک ساتھ شائع ہوئیں۔ ۲۶ر جولائی ۱۹۹۲ء کے 'نو بھارت ٹائمس' کے 'رویوار یہ' میں بھی ایک نظم ''شاید آپ جانتے ہو'' شائع ہوئی۔ ان نظموں کی اشاعت کے ساتھ ایک اور واقعہ پیش آیا جس نے میری ادبی زندگی میں اہم رول ادا کیا۔ 'ہنس' ہر سال ۳۱ر جولائی کو پریم چند کی

یوم پیدائش اور ہنس کی سالگرہ پر ایک سمینار کا انعقاد کراتا تھا۔ اس سال ''پریم چند: وشِشٹ سندر بھ دلت ومرش'' عنوان پر ایک سمینار کا انعقاد کیا۔ جس میں مجھے بھی ایک مقرر کے طور پر بلایا گیا تھا۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا موقع تھا کیونکہ 'ہنس' کی سالانہ تقریب کی گونج ہندی ادب کی دنیا میں ہر سال سنائی دیتی تھی۔ اس سمینار کی صدارت راجیند ر یادو جی نے کی تھی اور افتتاحی تقریر ڈاکٹر مینیجر پانڈے نے کی۔ ڈاکٹر مینیجر پانڈے جی نے اپنی گفتگو کا اختتام ''نو بھارت ٹائمس'' میں چھپی میری نظم سے کیا تھا، لیکن انھوں نے شاعر کے نام کا ذکر نہیں کیا، راجیند ر یادو جی نے ان کو ٹوکا ''اس نظم کے شاعر کا نام بھی تو بتاؤ'' مینیجر پانڈے جی نے بتایا:

''یہ اوم پرکاش والمیکی کی نظم ہے جو حال ہی میں 'نو بھارت ٹائمس' میں شائع ہوئی ہے۔''

راجیند ر یادو جی نے کہا تھا ''اوم پرکاش والمیکی آج یہاں موجود ہیں، ہم ان کا بیان بھی سنیں گے۔''

جب مجھے بولنے کے لیے مدعو کیا گیا تو میں نے اپنی بات کی شروعات اپنی نظم ''ٹھاکر کا کنواں'' سے کی اور ڈاکٹر امبیڈکر کی وہ مثال دی جس میں انھوں نے کہا تھا جس تہذیب کو آپ مہان کہتے نہیں تھکتے اس نے چودہ کروڑ دلت اور سات کروڑ آدی واسی پیدا کیے ہیں پھر بھی یہ عظیم ہے۔ اس نشست میں میں نے دلت ادب کو ہی نشانہ بنایا تھا۔ پریم چند پر زیادہ بات نہیں کی تھی۔ دلت ادب دلت فکر کو دلت کی پہچان بنا کر پیش کیا تھا۔ جس کو بعد میں دوردرشن نے اپنی خبروں میں خاص طور سے نشر کیا تھا۔

دسمبر ۱۹۹۲ء میں 'ہنس' میں میری کہانی ''بیل کی کھال'' شائع ہوئی۔ اس کہانی کے چھپتے ہی قارئین نے مثبت ردعمل ظاہر کیا تھا اور مجھے ایک افسانہ نگار کی شکل میں پہچان ملی۔ اس کے بعد ''ہنس' میں میری اہم کہانیاں چھپی 'سلام'، 'اندھڑ'، 'بھئے 'پرموشن' ، 'کوڑا گھر'، 'چڑی مار'، 'رامیسری'، 'اتھ کتھا'، 'پیٹر مشرا' وغیرہ وغیرہ لیکن ''ہنس'' نے میری کچھ اچھی نظمیں واپس بھی کیں جیسے 'اما'، 'شویاترا'، 'رہائی'، وغیرہ جو

دوسرے رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔ 'شو یاترا' نہ صرف مقبول ہوئی تھی بلکہ اختلافات کا نشانہ بھی بنی۔ ''ہنس'' کے ذریعہ سے قارئین کا جو پیار مجھے ملا اس نے ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھایا۔ یہ میرے لیے ادبی زندگی کا اہم سنگ میل ثابت ہوا، جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

۲۶ / جنوری ۱۹۹۴ء کو کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر ''اسمتا ادھیّن کیندر'' کی بنیاد رکھی۔ جس کا مقصد لوگوں میں مطالعہ کے رجحان کو فروغ دینا تھا۔ ڈاکٹر امبیڈکر، گوتم بدھ اور جیوتی با پھولے کے خیالات سے عام لوگوں کو متعارف کرانا تھا۔ پہلے مرحلے میں ایک لائبریری کی شروعات ہوئی، دوسرے میں پڑھی جانے والی کتابوں پر گفتگو اور تیسرے مرحلے میں عالموں سے اظہار رائے کرایا۔ افتتاح کے وقت تقریباً تین سو لوگوں کو ایک ساتھ جمع کرنے میں ہمیں کامیابی ملی تھی۔ یہ پروگرام دو گھنٹے سے زیادہ چلا تھا۔ ''اسمتا ادھیّن کیندر'' کے پروگرام مسلسل ہوتے رہے۔ شہر کے الگ الگ جگہوں میں ہم نے یہ پروگرام رکھے تا کہ عام آدمی کو اس میں آنے میں کوئی مشکل درپیش نہ آئے۔ کتابوں کو پڑھنے میں بھی لوگ دلچسپی لے رہے تھے۔ شہر کے علاوہ گاؤں کے علاقوں میں بھی کئی پروگرام کروائے گئے تھے۔ موہن داس نیمش رائے، شیو راج سنگھ بے چین، ڈاکٹر این سنگھ، کنول بھارتی، ملکھان سنگھ وغیرہ کے لکچرز ہوئے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام آدمی دلت ادب اور ڈاکٹر امبیڈکر کے خیالات سے واقف ہوا۔ دہرادون میں ادبی سرگرمیوں کا یہ نیا تجربہ تھا۔ جیسے جیسے سرگرمیاں بڑھتی گئیں ویسے ویسے کئی طرح کی مخالف آوازیں بھی اٹھنے لگی تھیں۔ انھیں ہماری یہ سرگرمیاں ناگوار گذر رہی تھیں۔ دہرادون کے مختلف ادیب دوستوں نے ان اجلاس میں حصہ داری دکھائی تھی۔

ان پروگرام کی گونج فیکٹری تک پہنچ چکی تھی۔ ان دنوں آپٹو الیکٹرانک فیکٹری کے منیجنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر کے۔ پی سنگھ تھے۔ وہ غازی آباد کے رہنے والے تھے۔ اکھڑ مزاج اور گالیاں بھی دیتے۔ بولتے وقت جو بھی منہ میں آتا کہہ جاتے۔

سامنے والا اس لیے خاموش رہتا کہ ایم۔ڈی ہیں نہ جانے کس بات پر ناراض ہو جائیں لیکن جب وہ بولنا شروع کرتے تو اپنی ہی رو میں بغیر کسی رکاوٹ کے بولتے چلے جاتے تھے۔کبھی کبھی تو ان کی زبان حد پار کرکے فحاشیت تک پہنچ جاتی اور اس کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔

'اسمتا ادھین کیندر' کی سرگرمیاں انھیں بھی ناگوار گذر رہی تھیں۔جب انھیں معلوم ہوا کہ ان سرگرمیوں کے پیچھے اوم پرکاش والمیکی ہے تو انھوں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے مجھے سزا دینے کی دل میں ٹھان لی اور ایک دن (۱۷رجولائی ۱۹۹۴ء) کو انھوں نے مجھے اپنے آفس میں بلایا۔جیسے ہی میں آفس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا وہ مجھے دیکھتے ہی چلاّنے لگے میں اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔میں تو یہ سوچ کر اطمینان سے وہاں گیا تھا کہ شاید کوئی سرکاری کام ہوگا جس کے لیے انھوں نے مجھے بلایا ہے۔کچھ دیر تک تو میں خاموشی سے ان کا چلاّنا سنتا رہا۔

''تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو...ایک اچھی نوکری مل گئی ہے تو ہضم نہیں ہو رہی...اگر یہی سب کرنا ہے تو جاؤ باہر اور کرو بھنگی چماروں کی نیتا گری اور کچھ تو تم لوگوں کے بس میں ہے نہیں بس جاتی کے نام پر دوسروں کو گالیاں ہی بکو...''

''سر مجھے سمجھ نہیں آرہا ہے کہ آپ یہ سب کیوں کہہ رہے ہیں؟ میں وقت پر آفس آتا ہوں۔اپنا کام ٹھیک سے کرتا ہوں۔میرے کام کو لے کر کوئی شکایت ہے تو کہیے...باقی آپ یہ سب...''

میں نے ابھی کچھ شروع ہی کیا تھا کہ وہ اور زیادہ بھڑک گئے۔

''اچھا! ہماری بات آپ کو سمجھ نہیں آرہی...سمجھ تب آئے گی جب آپ کا تبادلہ دور دراز کردیا جائے گا یا آپ کے خلاف حکومت کی طرف سے کاروائی کی جائے گی...تب تو ہماری بات ٹھیک سے سمجھ پائیے گا....'' وہ تو تڑاک پر اتر آئے۔

’’ٹھیک ہے سر! اگر آپ کو میرے خلاف کوئی کاروائی کرنی ہے تو ضرور کریں، لیکن کم سے کم ایک اعلیٰ افسر ہونے کے ناطے آپ سے اس طرح کی زبان کی امید نہیں رکھتا ہوں.... پلیز آپ ٹھیک سے پیش آئیں۔ اگر مجھ سے ایسا کوئی کام ہوا ہے جس سے فیکٹری کا نظم وضبط متاثر ہوا ہو یا میرے کام کی وجہ سے فیکٹری کو کوئی نقصان ہوا ہے تو جو سزا آپ دیں گے وہ مجھے قبول ہوگی، لیکن مجھے بے عزت کرنے سے پہلے آپ ٹھیک سے سوچ لیجیے کہ آپ کس طرح کی زبان کا استعمال کر رہے ہیں جو مجھے ذلیل کر رہی ہے... اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ مجھے ٹھیک سے بتائیں کہ آپ میرے کس کام سے اتنا زیادہ ناراض ہیں، تا کہ مجھے بھی تو سمجھ آئے کہ مجھ سے غلطی کہاں ہوئی ہے اور رہا بھنگی چماروں کی نیتا گیری کا سوال فیکٹری کے اندر آپ ایسا کوئی واقعہ بتائے جہاں میں نے نیتا گری کی ہو اور فیکٹری کے نظم وضبط کو بھنگ کیا ہو۔ ثابت کر دیجیے میں دوبارہ آکر آپ کو موقع نہیں دوں گا۔ آپ کے لگائے الزاموں کے بدلے میں سزا بھگتنے لے لئے تیار ہوں... لیکن خیال رکھیے گا... کہ آپ کی سرگرمیوں پر بھی لوگوں کی نظر ہے۔ اگر مجھے پریشان کرنے کا آپ نے ارادہ کر ہی لیا ہے تو محفوظ آپ کے مشیر بھی نہیں ہیں۔ آج تک اس کالونی میں جو نہیں ہوا وہ آپ کی ملازمت کے وقت میں ہو رہا ہے۔ جس طرح آپ فرقہ پرست عناصر کو پناہ دے رہے ہیں وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ یہ بھولیے گا نہیں، مجھے آپ کے فیصلے کا انتظار رہے گا... شکریہ‘‘

کہہ کر میں باہر نکل آیا لیکن تناؤ سے میرا سر بھنا گیا۔ نوکری میں پہلی بار کسی اعلیٰ افسر نے مجھ پر الزام لگائے تھے وہ بھی بے بنیاد، ان سرگرمیوں کو لے کر جو ادبی اور فکری تھیں۔

اس روز آفس سے آنے کے بعد بھی میں پرسکون نہیں تھا۔ کئی طرح کے سوالات

میرے دل ودماغ میں اٹھ رہے تھے۔ سارا دن فکر میں گذر گیا کہ نہ جانے کے۔ پی۔ سنگھ کیا کرے گا کہیں میرا تبادلہ جنوبی ہندوستان کی کسی فیکٹری میں نہ کرادے، اسی پریشانی میں دن گذر گیا۔ گھریلو وجوہات کی بنا پر میں دہرادون کے باہر تبادلہ کرانے کی حالت میں نہیں تھا۔ کے۔ پی۔ سنگھ کی باتوں نے اچانک میری فکر کو بڑھا دیا تھا۔ لیکن ایک ہفتے کے بعد بھی کے پی سنگھ کی طرف سے کوئی کاروائی نہیں ہوئی۔ اچانک ایک روز پروڈکشن شاپ میں انھوں نے مجھے دیکھا اور اپنے پاس بلا کر کہا:

''تمھارا اسمتا ادھین کیندر کیسا چل رہا ہے؟'' میں حیران رہ گیا۔

''سر! آپ کو خبر ہے؟''

''تو کیا سمجھتے ہو ہم کچھ نہیں جانتے کسی نے آکر آپ کے بارے میں الٹا سیدھا بتایا تھا بس یہی تھا اس روز تم سے کہہ دیا، لیکن جب بعد میں پتہ چلا کہ خبر کچھ الگ تھی۔ ادب کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ معلومات نہیں ہے۔ ہاں! لوگوں کو سمجھدار بنانے کی اس تحریک میں اگر میری ضرورت پڑے تو کہنا۔''

میں حیرانی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دل میں یہی شک وشبہ تھا کہ کہیں یہ بیوروکریسی کا کوئی داؤ تو نہیں؟ مجھے خاموش دیکھ کر بولے:

''اب یہ مردہ چہرہ لے کر کب تک کھڑے رہو گے... بھول جاؤ... جو بھی کہا تھا۔ میری جات بُدّھی میں جو گھسا وہ اگل دیا۔ دل میں کچھ نہیں ہے... چاہو تو کبھی دیکھ لینا ثابت کردیں گے... یہی کہا تھا تم نے؟''

''لیکن سر! میری تو نیند ہی اڑا دی تھی آپ نے۔ میں تو اس وقت سے لے کر ابھی تک انتظار میں ہوں کہ کب آپ کے آفس سے خفیہ خط ملے اور میں اس کا جواب دوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اتنے ڈرپوک تو تم ہو نہیں، جس طرح سے تم نے میرے لگائے الزام کا جواب دیا تھا اس سے تو لگا تھا تم اندر سے ایک دم مضبوط ہو، جو چھوٹے

موٹے حملوں سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔'' کے۔پی۔سنگھ نے مسکرا کر کہا۔

''ساری سر، اگر میری کسی بات کا آپ کو برا لگا ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔'' میں نے بھی اسی جذبے کے ساتھ کہا۔

''نہیں غلطی میری تھی مجھے تحقیق کرنی چاہیے تھی اب اس بات کو یہی ختم کرو... آگے ہمارے بیچ یہ بات نہیں آنی چاہیے ...اور ہاں فیکٹری کی سالانہ تقریب پر ایک مزاحیہ مشاعرہ کروانا ہے اس کی ذمہ داری آپ کی رہے گی سوچ کر رکھو، کس کو بلانا ہے اور خرچ کتنا ہوگا، او کے۔''

جاتے جاتے ایک کام میرے سر پر ڈال گئے۔کافی عرصہ تک کے۔پی۔سنگھ کے عمل کا انتظار کرتا رہا، لیکن جب یہ سب ٹھیک ہوگیا تو مطمئن ہوگیا تھا۔

دسمبر ۱۹۹۳ء کے پہلے ہفتے میں مشہور صحافی راج کشور کی کا ایک خط ملا۔وہ ان دنوں 'نو بھارت ٹائمس' نئی دلّی میں تھے۔میں ذاتی طور پر ان کو نہیں جانتا تھا۔جب وہ 'رویوار' کولکاتہ میں تھے تب سے ان کے لکھے رپورتاژ پڑھتا تھا۔کفلٹہ کانڈ پر ان کا رپورتاژ کافی مشہور ہوا۔''رویوار'' سے ہی وہ ''نو بھارت ٹائمس'' میں آئے تھے۔ان کا خط دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔انھوں نے لکھا تھا 'وانی پرکاشن' نئی دلّی سے ''آج کے پرشن'' کتابوں کی ایک سیریز شروع کی گئی ہے، جس میں ابھی تک 'ایودھیا اور اس کے آگے'، 'بھارتی مسلمان'، 'متھک اور یتھارتھ'، 'ہندو ہونے کا ارتھ'، 'وناش کو نمنتر ن: بھارت کی نئی ارتھ نیتی'، 'کشمیر کا بھوشیہ' آچکی ہیں اور اگلی کتاب ہوگی 'ہریجن سے دلت' اس کے لیے آپ کی زندگی پر ایک تحریر چاہیے وہ بھی تحقیق شدہ۔میں اس کے لیے ذہنی طور پر بالکل بھی تیار نہیں تھا کیوں کہ اس سے پہلے بھی میں نے خودنوشت سوانح حیات لکھنے کی کوشش کی تھی لیکن بات کچھ بنی نہیں اور لکھے ہوئے تمام صفحات پھاڑ دیے تھے۔اب اچانک پھر سے وہی شروع کرنا پڑے گا۔میرے لیے یہ معاملہ کشمکش بھرا تھا۔اس لیے میں ایک دم سے حامی بھرنے کی حالت میں نہیں تھا۔میں نے راج کشور جی کے خط کا جواب دیتے ہوئے کہا:

''اپنے بارے میں لکھنا میرے لیے بے حد تکلیف دہ ہے، پتہ نہیں لکھ بھی سکوں گا یا نہیں، پھر بھی طے شدہ وقت بتائیے کب تک مواد بھیجنا ہے اور کتنے صفحات میں چاہیے، بتائیے۔''

ان کا جواب جلد ہی آ گیا، ان دنوں آج کی طرح موبائل یا فون جیسی سہولت نہیں تھی اس لیے خط و کتابت سے ہی بات ہو پاتی تھی یا پھر تار سے جلدی پیغام بھیجا جاتا تھا۔

''۱۵/جنوری ۱۹۹۴ء تک میٹر مل جانا چاہیے اور ہاتھ کے لکھے پندرہ بیس صفحات سے زیادہ نہ ہو۔ اگر کسی وجہ سے آپ نہیں لکھ پاتے ہیں تو اپنے کسی دوست سے کہیے وہ اپنے بارے میں لکھ کر بھیج دے لیکن طے شدہ وقت کے اندر اندر۔''

میں کافی پس و پیش میں تھا کچھ سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ ۱۵/جنوری جیسے جیسے نزدیک آ رہی تھی میری بے چینی بڑھنے لگی۔ لکھنے کے لیے جس موڈ کی ضرورت تھی وہ بن ہی نہیں پا رہا تھا شاید اپنے بارے میں لکھنا میرے لیے آسان نہیں تھا۔ اچانک راج کشور جی کا ایک اور خط آیا۔

''اگر آپ ۲۰/جنوری تک نہیں بھیج سکتے تو چھوڑ دیجیے، پھر اسے ہم کتاب میں شامل نہیں کر پائیں گے۔''

اس خط نے انجانے میں جیسے میرے سامنے ایک بہت بڑا چیلنج رکھ دیا۔ اچانک جیسے میرے اندر جوش اور طاقت کے ذرائع پھوٹ پڑے۔ اس رات میں نے ایک بیٹھک میں ۲۵-۲۰ صفحات لکھ ڈالے۔ ایسا میرے ساتھ پہلی بار ہوا کہ ایک بیٹھک میں میں نے اتنا لکھا ہو۔ اس رات لکھے ہوئے کو میں نے دوبارہ نہیں پڑھا شاید دوبارہ پڑھنے کا حوصلہ ہی نہیں تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں ایک دہکتی ہوئی ندی میں تیر رہا ہوں جس سے باہر آنے کا میرے پاس کوئی کنارہ نہیں ہے۔

صبح اٹھتے ہی میں روزمرّہ کے کام میں لگ گیا۔ جو کچھ رات میں لکھا تھا اسے

دیکھنے کی بھی میں نے کوشش نہیں کی۔ وہ کاغذ مجھے بے حد ڈراؤنے لگ رہے تھے۔
آفس جانے کی جلدی میں میں نے ہڑبڑی میں اٹھا کر بیگ میں رکھ لیے۔ آفس پہنچتے
ہی سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہ کہ ان لکھے ہوئے صفحات کو لفافے میں
ٹھوسا اور لفافے پر پتہ لکھتے ہوئے بھی میرا دل تذبذب میں تھا کی ان صفحات
میں آڑی ترچھی لائنوں میں جو بھی لکھا ہے یہ راج کشور جی کو کیسے لگیں گے۔ پہلا مسودہ
ہے اس لیے غلطیاں بھی ہونگیں جن کو ٹھیک کرنے کا میرے پاس اس وقت حوصلہ
نہیں بچا تھا سب کچھ بہت تکلیف دہ تھا۔ بغیر دیری کیے میں نے اس لفافے کو پیٹی کے
حوالے کر دیا۔ پیٹی میں لفافہ ڈالنے کے بعد جیسے سب ایک دم ٹھیک ہو گیا تھا جیسے کچھ
ہوا ہی نہیں اور اپنے آفس کے کام میں مشغول ہو گیا۔ پانچ چھ دن کے بعد راج کشور
جی کا خط آیا جس میں انھوں نے پوچھا تھا:

''کیا یہ سب سچ ہے؟ جو نام اس میں آئے ہیں اگر وہ زندہ ہیں تو کیا آپ
انھیں بدلنا چاہیں گے؟''

میں نے ان کو لکھ دیا:

''جو کچھ بھی میں نے لکھا ہے وہ سب سچ ہے اور نام بھی سچ ہیں، انھیں
بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

انھوں نے یہ بھی لکھا:

''اسے ہم چھاپ رہے ہیں کہیں دوسری جگہ چھپنے کے لیے اس کو نہ بھیجیں۔''

کتاب بہت جلدی شائع ہو کر آ گئی۔ جس میں سب سے پہلی تحریر میری ہی
'ایک دلت کی آتم کتھا'' کتاب کے پہلے گیارہ صفحات میں چھپی تھی۔ یہ میری زندگی
کے گہرے کرب کی تصویر کو اجاگر کرتا ہے۔ کتاب کے شائع ہوتے ہی قارئین کے
خطوط کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دور دراز بیٹھے قارئین کو یہ سب جھنجھوڑ رہا تھا۔ پڑھنے
والوں کی اتنی قربت پہلی بار محسوس ہوئی تھی۔ کئی قارئین نے لکھا تھا اس کو مکمل کیجیے یہ
آپ کی کہانی نہیں ہم سب کی ہے، ہندی میں یہ پہلی بار پڑھنے کو ملی ہے ... پڑھنے

والوں کے اس اصرار کو میں نے سنجیدگی سے لیا۔ مگر پھر سے اس تکلیف کو جھیلنے کے لیے میری ہمّت جواب دے رہی تھی۔ خطوط کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ زیادہ تر خطوط میں وہی اصرار تھا اسے مکمل کریں۔ جب بھی کوئی اس طرح کا خط آتا میں اندر ہی اندر گہری چبھن میں مبتلا ہو جاتا اسی پس و پیش میں کئی مہینے گذر گئے۔ اچانک ''راج کمل پرکاشن'' کے ڈائریکٹر اشوک مہشوری جی کا خط ملا:

''والمیکی جی آپ کی خودنوشت کا کچھ حصّہ پڑھنے کو ملا۔ اسے کتابی شکل میں کب تک مکمل کرلیں گے؟ ہم چھاپنے کے متمنی ہیں۔''

میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ راج کمل پرکاشن سے اس طرح مجھے خط بھی ملے گا۔ یہ خط میرے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا کیوں کہ بہت کوششوں کے بعد کسی اچھے پریس نے میری کتاب چھاپنے میں دلچسپی دکھائی تھی۔ میں نے انھیں لکھ دیا:

''تھوڑا انتظار کریں میں جلد ہی آپ کو مسوّدہ بھیج رہا ہوں۔''

اس طرح مجھے ایک بار پھر زندگی کے ان تکلیف دہ لمحات سے گذرنا پڑے گا جنھیں جھیل کر میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ سچ مچ ''جھوٹن'' لکھنا میرے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ ''جھوٹن'' کے ایک ایک لفظ نے میرے زخموں کو اور زیادہ تازہ کر دیا تھا، جنھیں میں بھولنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔

۱۹۹۰ء کی دہائی گہری اتھل پتھل کا دور تھا۔ بابری مسجد کو زمین دوز کرنے کا حادثہ، فرقاوارانہ دہشت گردی، ذات پات کے فساد، مذہبی دنگے، منڈل کمیشن، پچھڑے طبقوں کی مورچہ بندی، ذاتی گروہ بندیاں، ریزرویشن کی مخالفت، خودکشی کے واقعات، اتراکھنڈ تحریک وغیرہ سیاسی ہی نہیں بلکہ سماجی زندگی پر بھی اثر انداز ہو رہی تھیں۔ منڈل کمیشن نے اتراکھنڈ کو زیادہ ہی متاثر کیا تھا۔ منڈل کمیشن کی مخالفت بڑے پیمانے پر ہوئی۔ جس کی آنچ تمام پہاڑی علاقے کو اپنی چپیٹ میں لے چکی تھی۔ جس سے دلتوں کے خلاف ماحول پیدا ہونے لگا تھا۔ منڈل کمیشن کو جس طبقے کا فائدہ ملنا تھا وہ چپی سادھے بیٹھے تھے اور قہر دلتوں پر گر رہا تھا۔ ریزرویشن مخالف

تحریک الگ صوبے کی مانگ میں تبدیل ہوگئی، جس میں علاقائی سیاسی پارٹی کے ساتھ قومی سیاسی پارٹیاں بھی شامل ہوگئی تھیں۔ دلتوں کو ڈرایا دھمکایا جانے لگا۔ مجھے مسلسل دھمکیاں مل رہی تھیں۔ کبھی فون سے تو کبھی خطوط کے ذریعہ، یہ خطوط بند لفافے میں اکثر آفس کے پتے پر ہی آتے تھے۔ میں نے وہ سارے خطوط افسر اور مینیجنگ ڈائریکٹر آر۔ کے۔ شرما جی کو دکھائے انھوں نے یقین دلایا کہ وہ اس کی جانکاری پولیس افسر کو دیں گے تاکہ وہ اس پر کاروائی کریں لیکن ماحول ایسا بنا ہوا تھا کہ کوئی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ پھر بھی میں نے رائے پور پولیس تھانے میں ایف۔ آئی۔ آر درج کرادی تھی۔ جب میرے گھر والوں کو ان سب کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ سب بہت فکرمند ہوگئے۔

دلت تنظیم کے کارکناں کی یہی رائے تھی کہ کچھ وقت کے لیے اپنی سرگرمیاں بند کردوں تاکہ کوئی غیر متوقع حادثہ نہ ہوجائے لیکن میں نے سبھی سے ایک بات کہی تھی اسٹیٹ تحریک سے میری کوئی مخالفت نہیں ہے۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ دلتوں کو ملنے والے آئینی ریزرویشن پر محرکین کا اسٹینڈ کیا ہے؟

کچھ کمیونسٹ ساتھی میرے پاس آئے تھے ان کا اصرار تھا کہ اس تحریک میں آپ ہمارے ساتھ آئیں۔ میں نے ان سے بھی یہی کہا تھا کہ یہ تحریک ریزرویشن کی مخالفت سے شروع ہوئی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی بھی کیا ریزرویشن کی مخالف ہے؟ آپ اپنی پارٹی کی رائے ظاہر کریں۔ ایک میٹنگ میں مجھے بلایا گیا تھا اس یقین کے ساتھ کہ وہاں صرف الگ اسٹیٹ کی مانگ پر ہی بحث ہوگی۔ ریزرویشن کی مخالفت پر کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں اس میٹنگ میں گیا بھی اپنے دوست وجئے شرما کے بلانے پر میں اس میں شامل ہوا لیکن جیسے ہی میٹنگ شروع ہوئی ہر ایک ریزرویشن کی مخالفت کے موضوع کو ہی اٹھا رہا تھا۔ میں نے وجئے شرما سے کہا:

''کامریڈ، میں جارہا ہوں، آپ کے سب کارکنان اگر ریزرویشن کے مخالف ہیں تو میں اس میں شامل نہیں ہوسکتا۔''

اور میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ کچھ کارکناں نے مجھے روکنے کی کوشش بھی کی لیکن میں نے صاف طور پر کہہ دیا تھا:

''اسٹیٹ الگ بنائیں یہ آپ کا جمہوری حق ہے، جہاں تک اس کی ترقی کا معاملہ ہے میں آپ کے ساتھ ہوں، لیکن اگر دلتوں کے حقوق کو آپ چھیننے کی کوشش کریں گے تو میں آپ کے ساتھ نہیں ہوں۔''

اس واقعہ کے بعد میرا ایک خط 'ہنس' میں چھپا تھا جس میں میں نے کمیونسٹ پارٹی کے دوہرے طرز عمل پر اپنے خیالات ظاہر کیے تھے۔ اس خط کو پڑھ کر اودھیش کمار مجھ سے بہت خفا ہوئے اور ایسا کوئی بھی موقع اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے جہاں وہ میرے خلاف غلط باتیں نہ کرتے ہوں۔ اس کام میں ہر جیت بھی میرے خلاف ہو گیا تھا بلکہ اودھیش سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس نے تنظیم ''اسمتا اڈھین کیندر'' کے خلاف مورچا کھول دیا تھا جس کو ہم دہرادون میں چلا رہے تھے۔

چکرانہ روڈ پر ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہے ''ٹپ ٹاپ'' جس کو گپتا جی چلاتے تھے۔ یہ شہر کے پڑھنے لکھنے والے تنظیم کے کارکناں کا اڈّا تھا۔ اکثر لوگ وہاں دن بھر بیٹھے رہتے تھے لمبی لمبی بحثیں ہوا کرتی، ملنا جلنا تو ہوتا ہی تھا۔ میں اکثر سنیچر کو وہاں تین سے پانچ کے درمیان جاتا۔ ہر جیت کو یہ معلوم تھا اس لیے اس نے سنیچر کے دن وہاں ایک پوسٹر لگا دیا:

''بھنگی ما تنظیم میں آپ کا استقبال ہے۔''

جب میں ''ٹپ ٹاپ'' میں پہنچا تو اندر سے بہت زور زور سے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں، یہ آوازیں باہر سڑک تک سنائی دے رہی تھیں لیکن سب مجھے دیکھتے ہی اچانک خاموش ہو گئے۔ جب میری نظر پوسٹر پر پڑی تو میں نے اس کو غور سے دیکھا اس وقت ہر جیت وہاں بیٹھا ہوا تھا ایسا دکھانے کی کوشش کر رہا تھا کی جیسے اس پوسٹر سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی میں نے ہر جیت کے بنائے

ہوئے پوسٹر دیکھے تھے۔ ہرجیت کے ہاتھ سے کھینچی لکیروں سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے ہرجیت کی تعریف کی:

''مان گئے گرو، کیا دور کی کوڑی پھینکی ہے تمہاری قابلیت دیکھ کر تو کوئی بھی قائل ہو جائے گا۔''

ہرجیت نے صفائی دینے کی کوشش کی:

''نہیں یہ میرے دماغ کی پیداوار نہیں ہے۔''

ماحول گرمانے لگا۔ میں نے بھی طے کر لیا کہ ہرجیت کو اس کی اوقات بتانی ہے۔ اچانک ہرجیت اٹھ کر جانے لگا، میں نے اس کو روک کر کہا:

''پوسٹر بنانے والے نے نیچے اپنا نام نہیں لکھا ہے چلو کوئی بات نہیں میں لکھ دیتا ہوں اسے پڑھ کر ہی جانا۔''

ہرجیت ٹھٹھک گیا۔ جتنے بھی لوگ وہاں موجود تھے غیر متوقع واقعہ سے بے خبر تھے۔ ان کی تھوڑی دیر پہلے کی ہنسی غائب ہو چکی تھی میں نے پین نکالا اور پوسٹر کے نیچے لکھا:

''سردار ہوں... پر لوگ مجھے ترخاڑ کہتے ہیں پھر بھی میں ان کے تلوے چاٹتا ہوں۔''

یہ لکھتے ہی ہرجیت بھپر اٹھا، میں بھی اس کے لیے تیار تھا میں نے کہا:

''غلط پات میں کھڑے ہو اس لیے جھوٹ کو مثالی مان لیا ہے تم نے۔''

اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی:

''بس اس کے آگے کچھ مت کہنا... ورنہ میں وہ سب کر سکتا ہوں جو ایک ادیب کو نہیں کرنا چاہیے، اگر تم مجھے روکو گے تو میں کر سکتا ہوں۔''

اچانک ہرجیت نے اس پوسٹر کو پھاڑ کر باہر نالی میں پھینک دیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھا گپتا مند مند مسکرا رہا تھا۔

جبل پور

نومبر ۱۹۹۸ء میں میرے تبادلے کا آڈر توپ گاڑی فیکٹری (جی۔ سی۔ ایف) جبل پور کے لیے آیا۔ ان دنوں میں گھریلو پریشانیوں میں الجھا ہوا تھا۔ ساس سسر کی طبیعت خراب تو چل ہی رہی تھی اور چندا کا علاج بھی چل رہا تھا وہ استھما میں مبتلا تھی یعنی میں کل ملا کر اس وقت تبادلے کی حالت میں نہیں تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہ تبادلہ رک جائے۔ اس تبادلے سے مجھے ترقّی ملنی تھی میں اس کو بھی چھوڑنے کے لیے تیار تھا لیکن آرڈیننس فیکٹری بورڈ کے چیئرمین کا سخت آڈر تھا کہ جن کے تبادلے ہوئے ہیں انھیں جلدی نئی جگہ جا کر نیا عہدہ سنبھالنا ہے۔

جب میرے تبادلے کی خبر میرے ساس سسر کو ہوئی تو وہ بھی بہت پریشان ہوئے، میں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی ہمارے ساتھ جبل پور چلو، جو بھی خوشی وغم ساتھ ساتھ رہیں گے، ہماری بھی فکر دور ہو جائے گی کہ آپ لوگ یہاں اکیلے ہیں لیکن سسر نے یہ گوارا نہیں کیا وہ بار بار کہتے:

''اپنی ماں کو لے جاؤ میں یہی رہوں گا۔''

جبکہ جبل پور میں اتنے سال رہنے کے بعد بھی ان کے پاس کوئی جائیداد نہیں تھی پھر بھی عجیب طرح کا موہ پالے بیٹھے تھے۔ دہرادون چھوڑنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ انھیں سمجھانے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔ وہ دن میرے لیے گہری ناامیدی کے دن ثابت ہو رہے تھے میں ذہنی پریشانیوں سے گذر رہا تھا۔ آخر میں کافی جدوجہد اور غور وفکر کے بعد مجھے جبل پور جانے کا فیصلہ لینا پڑا۔ یہ طے ہوا کہ ابھی میں جا کر جوائن کر لیتا ہوں رہنے کی سہولیت ہو جانے پر گھر گرہستی کا سامان بعد میں لے جائیں گے۔ چندا کچھ دن اور اپنے امّا ابا کے پاس رہے گی۔ اس دوران اگر ان لوگوں کا دل بدل جائے تو انھیں بھی لے کر جبل پور آجائے گی۔

میں ۳۰ ر نومبر ۱۹۹۸ء کو جی۔ ایس۔ ایف جبل پور میں میں اپنے نئے عہدے پر آ گیا۔ اس فیکٹری میں ایک بار پہلے بھی میری پوسٹنگ ہو چکی تھی لیکن صرف ہفتہ بھر ہی رہ پایا تھا۔ ٹریننگ کے امتحان میں منتخب ہو کر امبرناتھ (ممبئ) آ گیا تھا۔ جولائی

۱۹۷۰ء کی بات ہے میں نے جوائن تو کرلیا لیکن ایک ہفتہ سے زیادہ ہو چکا تھا مگر مجھے کوئی شعبہ نہیں دیا گیا تھا۔اس وقت وہاں مینجنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر پی۔ کے۔ مشرا جی تھے اور جوائنٹ مینیجنگ ڈائرکٹر این۔ کے۔ واشنئے جی تھے۔جب ان سے تعارف ہوا تو انھوں نے بھی میرے نام پر کئی سوال اٹھائے تھے اور میری صلاحیت و تجربہ کو طاق پر رکھ کر واشنئے جی نے ایک ایسا محکمہ دیا جس کے بارے میں میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

شاید سب میرے والمیکی نام کی دین تھی۔میری تکنیکی تعلیم کو اس نام کی وجہ سے ایک بار پھر پیچھے دھکیل دیا گیا۔ایک ایسا محکمہ جو پوری کالونی کی صاف صفائی کے ساتھ ساتھ سیوج وغیرہ کے کام کو دیکھنا تھا۔اس محکمہ میں سو سے زیادہ صفائی کرنے والے مزدور تھے۔کالونی میں ایک بازار بھی تھا جس میں دکانداروں سے دکانوں کا کرایہ وصول کرنے کا کام ہوتا تھا جو بے حد مشکل کام تھا۔ایسے بہت سے دکاندار تھے جنھوں نے کئی سالوں سے کرایہ ادا نہیں کیا تھا اور بازار میں غنڈہ گردی الگ، جس سے جوجھنا ایک مصیبت تھی۔کبھی کبھی تو ایک دوسرے کا سر پھوڑنے کی نوبت تک آجاتی تھی۔

اس فیکٹری میں میرے پرانے دوست راجیش واجپئی بھی تھے۔جو ممبئی کے ہاسٹل میں میرے ساتھ تھے۔اس نے مذاق میں کہا تھا:

> ''کیوں پیارے! اس عہدے کو سنبھالنے کا کیا ردّعمل ہے؟ کچھ مت کہنا۔ تم چاہے کتنے بڑے ادیب عالم بن جاؤ۔ ہمارے بنائے ہوئے نظام گھما پھرا کر تمھیں یہی احساس کراتے رہیں گے کہ تمہاری اصلی جگہ کیا ہے۔ میری مانو چپ چاپ کچھ کہے بغیر اپنے آفس میں بیٹھو اور سرکاری کام کے ساتھ ساتھ اس محکمہ کے کام کرنے والے مزدوروں کو زندگی گذارنے کا سلیقہ سکھاؤ یہ مان کر کہ چاہے کسی بھی ذہنیت کے تحت تمھیں وہاں بھیجا گیا ہے لیکن صحیح بھیجا گیا ہے یہ ثابت کردو۔''

میرے دوست راجیش واجپئی نے مذاق مذاق میں بات تو بہت پتے کی کہہ گیا

تھا لیکن اس وقت میں جس ذہنی کرب سے گذر رہا تھا، وہاں میں کچھ زیادہ سوچنے کی حالت میں نہیں تھا کہ یہ سب جو ہو رہا ہے وہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ اگر مجھے یہی سب کرنا ہے تو اتنی پڑھائی لکھائی کی ضرورت کیا تھی... اسی الجھن میں الجھ کر میں راجیش واجپئی کی بات کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ میں نے کہا:

''راجیش! پتہ نہیں کیوں بار بار مجھے یہ احساس کرایا جاتا ہے کہ میری پیدائش کس گھر میں ہوئی ہے، کیا کبھی مجھے اس لعنت سے چھٹکارا ملے گا؟''

میرے اندر سلگ رہے انگاروں کی آنچ راجیش واجپئی کو چھو گئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا:

''یار! یہ سرکاری نوکری ہے اتنا سیریس کیوں لے رہے ہو۔ کام شروع کرو تمہاری قابلیت خود بولے گی اور دیکھنا فیکٹری انتظامیہ زیادہ دن تک تمہیں وہاں نہیں رکھے گا، کوئی نا کوئی بڑا اور ذمہ داری کا کام تمہیں سپرد کیا جائے گا۔ یہ ایک بہت بڑی فیکٹری ہے یہاں بہت اہم چیزیں بنائی جاتی ہیں وہ ایک اچھے اور قابل افسر کو کسی ایسے کام میں نہیں رکھ سکتے جہاں اس کے تجربہ اور اس کے علم کا صحیح استعمال نہ ہو رہا ہو۔''

کہتے ہوئے راجیش واجپئی نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ راجیش واجپئی نے مجھے مطمئن کرنے کے لئے کہا:

''میں خود مینجنگ ڈائرکٹر کے اس فیصلے سے ناخوش ہوں کہ تمہیں ایسا کام دیا گیا۔ جبکہ تمہیں تو کسی ریسرچ یا ترقّی کے کاموں میں جوڑنا چاہیے تھا جہاں تمہارے تجربے کا فائدہ فیکٹری کو ملتا۔''

''یہ کام مینجنگ ڈائرکٹر کا نہیں ہے یہ تو جوائنٹ مینیجنگ ڈائرکٹر کا ہے جس کو میرے نام کے بارے میں اچھے سے معلوم ہے کیوں کہ وہ میرے ہی علاقے سے ہیں، اس لیے اس نے مجھے جان بوجھ کر اس کام میں لگایا

ہے۔افسر بن گئے ہوتو سنبھالوان صفائی مزدوروں کو۔''میں نے اپنے ذہن میں اٹھنے والے شکوک کو ظاہر کیا۔

''ارے یہ سالا بڑا کمینہ ہے ...لیکن میری یہ رائے ہے کہ تم اس بارے میں سوچنا بند کرو ...شاید اسی میں کچھ بہتر چھپا ہوا ہے۔تم تو یار سماجی کارکن ہو، یہ مان کر چلو کہ انجانے میں تمہیں خدمت خلق کرنے کا موقع دیا گیا ہے وہ بھی سرکاری کام کے وقت... یہ ایک موقع ہے لوگوں کے پاس جا کر کام کرنے کا اور مجھے یقین ہے کہ یہ تم کر پاؤ گے ...انھیں جینا سکھا دو، پھر دیکھنا اس میں تبدیلی دکھائی دے گی...کیا تمہاری زندگی کا یہ مقصد نہیں تھا... یا تم نے بھی اپنا راستہ بدل لیا ہے۔''

واجپئی نے میرے دل کی بات کو ٹھیک سے سمجھا تھا۔اس کی اس بات سے مجھے نئی روشنی ملی۔میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا:

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو مجھے اس پوسٹنگ کو اسی صورت میں لینا چاہیے... تھینکس یار! تم نے مجھے اندرونی کرب سے باہر نکلنے میں مدد کی ہے۔''

محکمہ میں عہدے کو سنبھالنے سے پہلے ہی میں نے چھٹیوں کے لیے عرضی دے دی تھی تا کہ چندا بھی یہاں آجائے تو ٹھیک رہے گا۔سرکاری گھر مجھے مل گیا تھا اس لیے گھر گرہستی کا سامان بھی شفٹ کرنا تھا۔

جیسے ہی میں دہرادون پہنچا اچانک مہیندر وشسٹ کا فون آیا۔وہ جبل پور آرڈیننس فیکٹری کے جوائنٹ کنٹرولر آف ڈیفنس اکاؤنٹس تھے۔جی۔سی۔ایف میں ہی ان کا دفتر تھا۔جیسے میری ڈیوٹی جوائن کرنے کی خبر ان کے پاس پہنچی تو انھوں نے جوائنٹ مینیجنگ ڈائرکٹر (انتظامیہ) این۔کے۔واشنئے کو فون کیا:

''یہ اوم پرکاش والمیکی نے ابھی ابھی جوائن کیا ہے۔کیا یہ دہرادون سے آئے ہیں۔؟''

''ہاں! کیوں؟ کیا بات ہے؟'' این کے واشنئے جی نے سوال کیا۔
'' آپ نے انھیں کہاں پوسٹ کیا ہے...صفائی کے کام میں...؟''
مہیند وششٹ نے کہا:
''کیوں سر!...پھر کہاں کرتا یہ تو ان کے لیے سب سے صحیح جگہ ہے...''
این۔کے۔واشنئے جی نے طنز سے کہا:
''آپ کو پتہ ہے...وہ ایک مشہور افسانہ نگار، شاعر اور نقاد ہیں۔''
مہیند روششٹ نے ان کو بتایا:
''کیا؟...'' یہ سن کر این۔کے حیرت زدہ ہوا۔
''وہ اس وقت کہاں ہیں؟...میری ان سے بات کراؤ...''
مہیند روششٹ نے کہا:
''وہ تو دہرادون گئے...فیملی کو لانے...جنوری میں واپس آئیں گے۔''
این۔کے۔واشنئے جی نے کہا:
''ان کا کوئی رابطہ نمبر ہو تو دیجیے۔'' مہیند روششٹ نے کہا۔
وہاں سے نمبر لے کر انھوں نے مجھے فون کیا تھا:
''فکر مت کرو...میں یہاں اس حرامی این۔کے۔ واشنئے کو میں سبق سکھاؤں گا...تم کب آ رہے ہو؟...''
''جی میں ۱۰ جنوری کی صبح پہنچ رہا ہوں...اسی کے ساتھ ٹرک بھی نکلے گا۔امید ہے کہ وہ بھی وقت پر پہنچ جائے گا۔'' میں نے کہا:
''مجھے فون کرنا سامان اتارنے میں لیبرس کی ضرورت پڑے گی...ان کا انتظام میں کر دوں گا۔'' مہیند وششٹ نے کہا۔

مہیند راششٹ ایک طنزیہ افسانہ نگار کے طور پر جانے جاتے تھے۔ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ منظر عام پر آچکا تھا۔ان سے ملاقات تو کبھی نہیں ہوئی تھی لیکن ان کے نام اور تحریروں سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ جان کر اچھا لگا کہ وہ جی۔سی۔

ایف میں ہی بیٹھتے ہیں۔ ملنے جلنے کے امکانات بڑھ گئے تھے۔ جی۔سی۔ایف میں رہتے ہوئے ان سے کافی گہرے تعلقات ہو گئے تھے۔ ہر روز ملاقات ہوتی تھی۔ گھریلو سطح پر ہماری نزدیکیاں بڑھ گئی تھی، بعد میں ان کا تبادلہ دلّی ہو گیا تو رابطہ بھی کم ہو گیا۔اس کے بعد ایک ٹرین میں ملے تھے اس کے بعد کافی عرصہ تک ملاقات نہیں ہوئی۔

جی۔سی۔ایف اسٹیٹ کا کام میں نے سنبھالا۔ پہلے دن کا تجربہ ہی چوکانے والا تھا۔ جب میں آفس پہنچا تو با قاعدہ میرے نام کی پٹّی دروازے کے باہر لگی ہوئی تھی۔ اور پورا اسٹاف برآمدے میں بھیڑ لگائے کھڑا تھا۔ باہر لیبر اور صفائی کرنے والے قطار بنائے کھڑے تھے۔ عجیب منظر تھا۔ اتنی لمبی نوکری میں یہ حال کسی بھی فیکٹری میں دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ اپنے آفس کے سامنے اتنے آدمی دیکھ کر میں چونک گیا، میں نے وہاں کھڑے اسٹاف سے پوچھا:

"یہ بھیڑ کس لیے؟"

"آپ سے ملنے کے لیے کھڑے ہیں سر! آپ کا استقبال کرنا چاہتے ہیں۔" سینئر اسٹاف نے کہا۔

"ان سے کہنا اپنی اپنی جگہوں پر جائیں، میں وہیں آکر ان سے ملنا چاہوں گا۔"

یہ کہہ کر میں اپنے آفس میں آ گیا، جیسے ہی کرسی پر بیٹھا ایک ایک کر کے سب آنے لگے اور میرے پاؤں چھونے کا کام شروع ہو گیا۔ میرے لیے یہ عجیب بات تھی۔ اس میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اچانک ایک بزرگ عورت اندر آئی اور پاؤں چھو کر بولی:

"آپ کے بارے میں بہت سنا ہے آج دیکھ لیا تو اچھا لگا، یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ ہمارے افسر ہیں۔"

میں باہر آ گیا سب ہی وہاں موجود تھے۔ میں نے کہا:

''کل سے کوئی بھی یہاں پیر چھونے نہیں آئے گا۔سبھی اپنی حاضری لگا کر سیدھے کام پر جائیں گے، ہاں...اگر کسی کو کوئی پریشانی ہے تو وہ مجھ سے ضرور ملنے آسکتا ہے۔آپ ایک سرکاری نوکر ہیں اسی طرح میں سرکار کا نوکر ہوں، یہ الگ بات ہے کہ آپ صفائی کرنے والے لیبر ہیں اور میں افسر ہوں۔کل سے کوئی کسی کے بھی پیر چھونے نہیں آئے گا نہ میرے نہ کسی اسٹاف کے..اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو میں اس کو غیر مہذّب مانوں گا۔آپ اپنا کام ٹھیک سے کریں، ایمانداری سے کریں آپ کو کوئی مشکل ہے مجھے بتائے۔اب آپ کام پر جائیں۔''

میری بات سن کر وہ کافی نا امّید ہوئے۔ان میں کانا پھوسی شروع ہوگئی اور وہ وہاں سے چلے گئے۔میں نے اسٹاف کو بلا کر یہی ہدایت دی تھی کہ کل سے کسی بھی مزدور کو چاہے وہ صفائی کرنے والا ہو یا لیبر پیر چھونے کے لیے بڑھاوا نہ دے۔اگر ایسا ہوا تو ذمہ داری اسٹاف کی ہوگی۔مجھے یہ سب بالکل پسند نہیں۔میرے جوائن کرنے کی خبر جی۔سی۔ایف کے دکانداروں کو بھی مل چکی تھی۔وہ بھی ایک ایک کر کے آنے لگے۔انھیں بھی میں نے یہی کہہ کر واپس کر دیا تھا۔

''آپ سے ملنے میں دکان پر ہی آؤں گا۔یہاں آپ اسی وقت آئیں جب آپ کو کوئی پریشانی ہو، مجھے یہ پیر چھونے والی جیسی رسم پسند نہیں ہے اور نہ مجھے ان سب کی عادت ہے۔مجھے یہ سب حاکمانہ طور طریقے لگتے ہیں۔آگے سے خیال رہے آپ مجھے الجھن میں نہیں ڈالیں گے۔''

ان سب کے لیے یہ روز مرّہ کا کام تھا جیسے ان کے خون میں یہ سب چیزیں گھول دی گئیں ہوں۔میری باتوں نے ان کے دل میں عجیب طرح کی خاموشی پیدا کر دی تھی وہ واپس ضرور جا رہے تھے لیکن خوش نہیں تھے اور مجھے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔شاید اس سے پہلے انھیں جو لوگ ملے تھے وہ سب ان سے اس طرح کا سلوک چاہتے رہے ہوں گے۔

صبح کا وقت تھا میں آفس میں پہنچا ہی تھا کہ میرے گرو اور بڑے بھائی پرکاش کا ملے جی جو آرڈیننس فیکٹری امبا جھری میں اعلیٰ عہدے پر تھے، اچانک میرے آفس میں آ گئے۔ میں انھیں دیکھ کر چونکا اچانک وہ بھی بغیر کسی اطلاع کے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ خود ہی کہنے لگے:

''تمہاری جوائننگ کی خبر مجھے مل گئی تھی اس لیے چلا آیا... سب ٹھیک تو ہے؟... چندا کیسی ہے''۔

''جی سب ٹھیک ہے چندا بھی ٹھیک ہے، آج صبح ہی کہہ رہی تھی کہ آپ کا ایک بھائی اسی فیکٹری میں ہے... پتہ کرنا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں میں سیدھے یہیں آ رہا ہوں ابھی گھر نہیں گیا ہوں'' کا ملے جی نے کہا۔

''باقی تو سب ٹھیک ہے لیکن یہ جو سیکشن ملا ہے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

میں نے دبی آواز میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ وہ تپاک سے بولے:

''پاگل مت بنو، اس سے تمہارا کیا فائدہ ہونے والا ہے اس کے بارے میں سوچو۔ فیکٹری کے اندر اگر کوئی پروڈکشن ڈپارٹمنٹ مل جاتا تو صرف پروڈکشن کے ہی جھنجھٹوں میں الجھے رہتے۔ جبل پور میں کوئی تمہیں پہچان نہیں پاتا۔ اب یہاں بیٹھ کر آرام سے فیکٹری کا بھی کام دیکھو اور اپنے تعلقات بھی بناؤ۔ تمہارے ادیب دوست تم سے ملنے فیکٹری میں نہیں آ سکتے تھے یہاں آرام سے آ سکتے ہیں۔ کوئی سکیوریٹی بھی انھیں یہاں آنے سے نہیں روک سکے گی کیوں کہ یہاں تمہارے پاس عوامی خدمت کا کام ہے، جس میں کوئی بھی آ سکتا ہے۔ اس لیے فالتو کی باتیں دماغ سے نکال کر اپنے کام میں دل لگاؤ۔ تم خود دیکھو گے کہ سب لوگ تمہیں کس طرح عزت دے رہے ہیں اور تمہاری پہچان کا دائرہ کتنی تیزی سے بڑھ رہا ہے... خیر چھوڑو، چندا کو بتا دینا لنچ میں تم لوگ کے ساتھ ہی کروں گا۔ تمہارے اسکوٹر کی چابی کہاں ہے مجھے دو میں گھر ہو کر آتا ہوں یہی ملنا

مجھے۔‘‘

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے اسکوٹر کی چابی انھیں دے دی۔ ان کے لفظوں نے مجھے ایک نئی طاقت دی اور اپنے کام کو پورے دل سے کرنے لگا تھا۔

جبل پور کے ادباء کو بھی یہ خبر مل گئی کہ میں جی۔سی۔ایف میں آ گیا ہوں۔ سب سے پہلے مجھے تلاش کرتے ہوئے افسانہ نگار رمیش سینی آئے تھے۔ پھر مشہور افسانہ نگار اور اداکار راجیندر دانی، دیویش چودھری 'دیویش' آئے تھے۔ دیویش چودھری ہی مجھے جگدیش بھاٹیہ جی، اسنگھ گھوش کے آفس لے گئے تھے یعنی پرکاش کا ملیے جی کی صلاح صحیح ثابت ہونے لگی۔ دلّی کے سبھاش گتاڑے جی بھی ملنے آئے، فیکٹری کے باہر چائے کی دکان کے سامنے پڑی بینچوں پر ہم نے کافی دیر بیٹھ کر گپ شپ کی تھی ساتھ ہی جبل پور کی کٹ گلاسوں میں چائے کی چسکی لیتے ہوئے اس ماحول کا مزہ لیا۔
دکاندار بار بار میرے لیے کرسی لاکر رکھ رہا تھا لیکن میں نے اس کو سمجھایا:

’’بھائی! مجھے اس بینچ پر بیٹھ کر چائے پکوڑے کھانے دو۔ بھول جاؤ کہ اس بجریا کا میں افسر ہوں۔ مجھے بھی ایک عام زندگی کا مزہ لینے دو۔‘‘

دکاندار کو ہماری یہ باتیں عجیب لگ رہی تھیں۔ سبھاش گتاڑے کے ساتھ میری یہ ملاقات بے حد خوشگوار تھی۔

دہرادون سے میرا سامان ٹرک سے آیا۔ وجئے گوڑ ٹرک کے ساتھ آئے تھے۔
سامان اتارنے کے بعد وجئے نے کہا:

’’بھائی صاحب! مجھے کل ہی واپس جانا ہے اگر ممکن ہو تو وقت نکال کر آج گیان رنجن جی سے ملنے چلیں۔‘‘

میں نے کہا:

’’وجئے تم ٹرک کے ساتھ آئے ہو تھکے ہوئے ہو گے ایک آدھ دن رک جاؤ تھوڑا آرام بھی مل جائے گا جبل پور میں تھوڑا گھوم بھی لینا۔‘‘

لیکن وہ نہیں مانا، کہنے لگا:

''کل ہی نکلنا ہے آج کوشش کرو کسی طرح گیان رنجن جی سے ملاقات ہو جائے۔''

تو ہم دونوں گیان رنجن جی سے ملنے ان کے گھر پر گئے۔گیان جی بے حد اپنائیت سے ملے تھے۔انھوں نے کہا تھا:

''والمیکی جی! آپ جبل پور آ گئے ہیں تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔میں ذاتی طور پر بے حد خوش ہوں۔اس شہر میں آپ کا استقبال ہے۔''

مجھے بھی جبل پور آ کر اچھا لگ رہا تھا۔بہت سارے دوست مجھے مل گئے کچھ پرانے تو کچھ نئے۔

گیان رنجن جی سے اکثر ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔انھوں نے ''پہل'' کے دلت نمبر نکالنے کا منصوبہ میرے سامنے رکھا تھا ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اس نمبر کا اعزازی مدیر میں ہی بنوں۔میں نے ان کی یہ پیش کش بھی قبول کر لی تھی لیکن حالات کچھ ایسے بنے کہ وہ منصوبہ آگے نہیں بڑھ پایا اس کا مجھے افسوس ہے۔

کندن سنگھ پریہار جی جبل پور کے ایک کالج میں پرنسپل تھے۔ان سے کالج میں ہی ملاقات ہوتی تھی۔بے حد سیدھے، کم گو، لیکن گہری انسانیت سے لبریز انسان۔ اسنگھ گھوش اور دیویش چودھری سے مل کر ''تیسرا پکچھ'' رسالے کا منصوبہ بنایا تھا۔جس کی ذمہ داری اسنگھ گھوش اور دیویش چودھری نے لے رکھی تھی اور اس کی تیاری بھی شروع کر دی۔جبل پور میں دلت ادب کے لیے ایک کامیابی تھی، جس کو دیویش چودھری اور اسنگھ گھوش نے بخوبی نبھانے کے لیے کڑی محنت کی تھی۔اس میں اور بھی کئی ساتھی جڑ گئے تھے۔

عظیم شاعر ملئے جی سے تھوڑی الگ انداز میں ملاقات ہوئی بھوپال میں چار پشتوں کے شاعروں کا ایک بڑا انعقاد ہو رہا تھا۔جس میں مجھے بھی دعوت نامہ ملا۔ گیان رنجن جی نے فون کر کے بتایا:

''جس ٹرین سے آپ بھوپال جارہے ہیں اسی ٹرین میں ملئے جی بھی جارہے ہیں۔''

ملئے جی کے کوچ اور سیٹ کی معلومات بھی گیان جی نے مجھے دی تھی۔ٹرین شام کی تھی۔جیسے ہی میں نکلنے کے لیے تیار ہوا چندا کی طبیعت خراب ہوگئی کچھ دیر تو میں تیمارداری میں لگا رہا لیکن طبیعت ٹھیک ہونے کے بجائے اور زیادہ بگڑنے لگی۔میرے ہی بلاک میں ویاس جی تھے جب ان کو معلوم ہوا کی مسز والمیکی کی طبیعت خراب ہوگئی ہے تو وہ اپنی بیوی کے ساتھ آئے اور بولے:

''سر! آپ بھوپال ہوآیئے۔ان کو ہم لوگ سنبھال لیں گے۔''

لیکن میں انھیں اس طرح چھوڑ کر چلا جاؤں میرے دل نے گوارہ نہیں کیا۔ٹرین کے چھوٹنے میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ویاس جی کہنے لگے:

''سر! اگر جانا نہیں ہے تو ٹکٹ کیوں خراب کیا جائے۔آپ ٹکٹ مجھے دے دیجیے دیکھتے ہیں کیا ہوسکتا ہے۔''

میں نے ٹکٹ انھیں دے دیا۔تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ویاس جی واپس ٹکٹ کے پیسے لے کر آئے اور مجھے دیے۔اسی وقت راجیش واجپئی اور بھابھی جی بھی آگئی۔اس رات وہ ہمارے ہی پاس رکے۔راجیش واجپئی ہومیوپیتھک کے ڈاکٹر تھے چندا کو بھی اکثر وہ دوائیں دیتے رہتے تھے۔اس روز بھی چندا کو ان کی ہی دوا سے آرام ملا تو وہ سو گئی۔ملئے جی مجھے ٹرین میں تلاش کررہے تھے جب نہیں ملا تو بھوپال جا کر مجھے پھر ڈھونڈا۔منتظمین نے بتایا کہ وہ آ نہیں پائے ان کی بیوی کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی ہے۔یہ سن کر ملئے جی تھوڑا ناامید ہوئے۔اس واقعہ کے بعد بہت دن تک نہ وہ مجھ سے ملے اور نہ ہی میری ان سے ملاقات ہوئی۔

ایک روز اسنگھ گھوش جی نے ملئے جی سے پوچھا:

''والمیکی جی سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟ ان کو یہاں آئے تو کافی وقت ہو گیا ہے۔''

ملئے جی کا ردعمل کافی ناامیدی بھرا تھا۔ انھوں نے اسنگھ گھوش کو منفی جواب دیا:

''کیا ملنا، سنا ہے بہت مغرور، منہ پھٹ، گالی گلوج کرنے والے گھمنڈی انسان ہیں کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے ایسے لوگوں سے ملنا وقت کی بربادی ہی ہوگی۔''

ان کا یہ بیان اسنگھ گھوش کو ناگوار گذرا۔

'' ملئے جی! آپ کو یہ سب کس نے بتایا؟ ہماری تو ہر دوسرے دن ملاقات ہوتی ہے۔ کبھی ان کے گھر تو کبھی ان کے آفس میں، یا کبھی میرے آفس بھی آجاتے ہیں۔ دلت بستیوں میں وہ اکثر جاتے ہیں۔ وہاں بھی اچھے سے ملتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو لمبی ملاقاتیں ہوتی ہیں... جس نے بھی ان کے بارے میں فیڈ بیک دیا ہے... مجھے لگتا ہے وہ انسان کبھی والمیکی جی سے ملا ہی نہیں ہے۔ اس نے سنی سنائی باتیں آپ تک پہنچائی ہے۔ کیا گیان رنجن جی کی بھی یہی رائے ہے؟''

''نہیں گیان جی سے کبھی اس موضوع پر بات نہیں ہوئی ہے'' ملئے جی نے کہا

''راجیند ردانی جی سے؟'' اسنگھ گھوش نے سوال کیا۔

''نہیں! ہاں راجیند ردانی جی نے ایک بار بتایا ضرور بتایا تھا کہ والمیکی جی کا آفس جی۔ سی۔ ایف بجریا میں ست پُلا کے پاس ہے۔ بس اتنی ہی بات ہوئی تھی۔'' ملئے جی نے اسنگھ گھوش کو بتایا

''تب آپ ان سے ایک بار مل لیجیے... پھر بات کریں گے۔''

اسنگھ گھوش نے پورے یقین کے ساتھ ملئے جی سے گزارش کے ساتھ ہی یہ بھی کہا:

''سنی سنائی بات پر یقین نہ کریں... شاید ناانصافی ہوگی۔''

اتوار کا دن تھا۔ اکثر اتوار کو ہم کبھی صدر تو کبھی بڑا فوارا یا کسی دوست سے ملنے نکل جاتے تھے۔ صبح کے دس گیارہ بجے نکل کر شام چار سے پانچ کے بیچ واپس آتے

تھے۔اس روز اچانک ملئے جی میرے گھر پر تقریباً ۳:۳۰ بجے آئے۔انھوں نے آس پڑوس میں جب معلوم کیا تو انھوں نے بتایا کہ ۴:۴۰ یا ۵ بجے تک آجاتے ہیں آپ چاہیں تو یہاں بیٹھ کر انتظار کر سکتے ہیں لیکن وہ رکے نہیں۔ مین روڈ پر ایک پلیا تھی وہاں اپنی اسکوٹی کھڑی کر کے پلیا پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

ہم لوگ تقریباً ۴:۳۰ بجے تک لوٹ آئے تھے۔ہماری نظر ان پر پڑی لیکن میں ان کو چہرے سے نہیں پہچانتا تھا صرف اتنا ہی دھیان گیا کہ ایک بزرگ جن کے سر کے بال بالکل سفید ہیں پلیا پر بیٹھا ہے اور پاس ہی اسکوٹی کھڑی ہے، شاید اس کھلی جگہ کا جس میں چاروں طرف ہرا جنگل ہے، پہاڑی ہے، پتھریلی ڈھلان وغیرہ کا مزہ لے رہا ہے۔جیسی ہی ہم لوگ مین روڈ سے اپنے گھر کی طرف مڑے ملئے جی بھی اپنی اسکوٹی لے کر پیچھے پیچھے چل پڑے۔جیسے ہی میں نے اپنا اسکوٹر گھر کے سامنے روکا وہ بھی پہنچ گئے۔انھوں نے پوچھا:

''آپ اوم پرکاش والمیکی جی ہیں؟''

''جی ہاں، آپ؟''میں نے پوچھا۔

''میں ملئے، شاید آپ نے نام سنا ہوگا۔''انھوں نے اپنا تعارف کرایا۔

میں ان کا نام سنتے ہی اچھل پڑا اور پوری شدّت کے ساتھ استقبال کیا۔

''ملئے جی استقبال ہے آپ کا، آپ تو پلیا پر بیٹھے تھے میں شرمندہ ہوں آپ کو پہچان نہیں پایا۔''میں نے کہا۔

''آپ کے انتظار میں وہاں بیٹھا تھا یہ سوچ کر کہ چاہے آج جتنی دیر ہو جائے آج آپ سے مل کر ہی جاؤں گا۔''

کہتے ہوئے وہ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ان کی وہ کھل کھلاہٹ میں کبھی بھول نہیں پاؤں گا۔اتنی فطری ہنسی اس قدر سادی شخصیت آج کہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔میرا گھر پہلی منزل پر تھا جب میں ملئے جی کو لے کر اوپر پہنچا تب تک چندا دروازہ کھول ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ملئے جی کو عزّت سے بیٹھا کر چندا نے ان سے کہا:

''آپ آنے والے ہیں اگر پتہ ہوتا تو ہم باہر ہی نہیں جاتے۔آپ کو انتظار کرنا پڑا مجھے خراب لگ رہا ہے۔''

''ارے غلطی میری ہے۔مجھے ہی خبر کر کے آنا چاہیے تھا۔خیر چھوڑو ان باتوں کو اگر تھوڑی دیر بیٹھ کر انتظار کر لیا تو فائدہ مجھے ہی ہوا۔آپ لوگوں سے ملاقات ہوگئی یہی میرے لیے خوشی کی بات ہے۔''

ملیئے جی کا اپنا پن ایک ایک لفظ سے ٹپک رہا تھا۔وہ ایک انسان کی صورت میں بھی میرے دل میں بیٹھ چکے تھے۔اس روز باتوں میں ایسے کھوئے کہ وقت کا نہ خیال انھیں رہا اور نہ مجھے۔دلت ادب سے لے کر تبدیل مذہب،جبل پور،مدھیہ پردیش وغیرہ پر ہم نے کھل کر بات کی۔اچانک ملیئے جی بولے:

''وقت کتنا ہو گیا ہوگا؟''

میں نے گھڑی کی طرف گردن گھما کر دیکھا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ہم لوگ تقریباً ساڑھے پانچ گھنٹے سے باتوں میں ایسے گم ہوئے کہ اس بیچ چندا دو بار چائے پلا چکی تھی۔ملیئے جی نے کہا:

''اب میں چلتا ہوں کافی دیر ہوگئی رات میں میرے لیے اسکوٹی چلانا بھی مشکل ہوتا ہے۔''

ملیئے جی کے چہرے پر فکر کی لکیریں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔میں نے کہا:

''ملیئے جی! آپ فکر نہ کریں اسکوٹی یہی چھوڑ دیں میں اپنے اسکوٹر سے آپ کو چھوڑ دوں گا۔کل کسی کو بھیج دینا اسکوٹی لے جائے گا۔''میں نے انھیں اطمینان دلایا۔

''ارے نہیں۔آپ کے لیے یہ شہر نیا ہے اور میرا گھر بھی یہاں سے دور ہے رات میں کہیں آپ راستہ بھٹک گئے تو دقت ہوگی۔آپ کے پاس فون ہے؟ دیجیے کسی کو گھر سے بلاتا ہوں۔''

جی میں نے پرسکون انداز سے کہا۔لیکن فکر ابھی بھی ان کے چہرے پر دھائی

دے رہی تھی۔قریب آدھے گھنٹے کے بعد دو نوجوان آئے۔ان میں سے ایک میرے ہی شعبے کا کشل کام گر کے۔کے۔شرما تھا تو دوسرا ملئے جی کا بیٹا۔جانے سے پہلے ملئے جی نے وہ پورا بیورا دیا جو اسنگھ گھوش جی سے ان کی بات ہوئی تھی۔کہنے لگے:

''اسنگھ گھوش جی کے کہنے پر ہی میں آپ سے ملنے آیا ہوں، لیکن مجھے اچھا لگا آپ سے مل کر۔لوگ جو باتیں کرتے ہیں یا جو سنا تھا وہ سب غلط تھا۔''

ان کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ ایسا کیا ہے جو میرے بارے میں لوگ ایسی رائے بنا لیتے ہیں؟ کافی سوچنے کے بعد بھی سوائے تکلیف کے کچھ نہیں ملا۔لیکن آج کی کامیابی یہی تھی کہ ملئے جی جیسے ایک اچھے انسان سے ملاقات ہوئی۔

جی۔سی۔ایف کالونی کے بنگلا نمبر ۲ میں مکھیجا صاحب رہتے تھے۔وہ جی۔سی۔ایف میں ایڈیشنل جنرل منیجر (پروڈکشن) کے عہدے پر تھے۔بنگلا نمبر ۲ میں تیرہ سرونٹ کواٹر تھے۔اسٹیٹ آفس سے ہر روز ان کے بنگلے پر دو لیبر بھیجے جاتے تھے لیکن انھیں ان دو کے علاوہ اور لیبر کی ضرورت ہوتی تھی۔جب تک لیبر ان کے بنگلے پر پہنچ نہیں جاتے مسلسل فون آتا رہتا۔اس مشکل کا حل نکالنے کے لیے میں جب اپنے ایم۔ڈی این۔کے۔واشنئے سے بات کرنے گیا تو انھوں نے میرے اوپر ہی ساری ذمہ داری ڈال دی واشنئے جی نے کہا:

''یہ آپ کی ہوشیاری ہوگی کہ اس مشکل کا حل کیسے نکالتے ہیں۔اصول تو یہی ہے کہ اے۔جی۔ایم کے بنگلے پر دو ہی لیبر ہی دیے جائیں۔''

میں حیرانی سے واشنئے جی کا چہرہ دیکھا اور کہا:

''سر! یہ ایک دن کی بات نہیں ہے۔یہ تو ہر روز کا مسئلہ ہے ابھی تک آپ لوگوں نے جو اصول بنائے ہیں اس کے مطابق صرف دو لیبر دیے جاتے ہیں۔مزید لیبر مانگے جانے پر کیا کیا جائے۔کیسے کیا جائے آپ راستہ بتائیں۔''

واشنئے جی نے کوئی حل نہ دیکھ کر مجھے ہی پھنسا دیا۔ اگلے روز جب مکھیجا صاحب کا فون آیا تو میں نے کہا:

''سر! میں کوشش کروں گا کہ آپ کے بنگلے پر زیادہ لیبر پہنچ جائیں۔ آپ بے فکر رہیں۔''

میرے جواب پر مکھیجا صاحب بے حد خوش ہوئے۔ میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ وہ جتنے بھی لیبر مانگیں گے میں ان کے بنگلے پر بھیج دوں گا۔ جب واشنئے جی کی طرف سے کوئی منفی رائے زنی ہوگی تب دیکھا جائے گا، تب تک مکھیجا صاحب کو ہی خوش کر دیا جائے۔

ایک روز اچانک آفس کا ایک اعلیٰ اسٹاف میرے پاس آیا۔

''سر! ایک بہت ضروری کام آ گیا ہے اور اسی وقت کچھ لوگوں کو بھیجنا پڑے گا۔''

''تو بھیج دو کوئی پریشانی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سبھی لوگ اپنے کام پر جا چکے ہیں۔ انھیں ڈھونڈھ کر جمع کرنا پڑے گا۔''

اسٹاف نے اپنی پریشانی میرے سامنے رکھی۔

''کام کیا ہے، جو اتنا ضروری ہے؟'' میں نے جاننے کی کوشش کی۔

''سر! واشنئے صاحب کے بنگلے کے سامنے ایک بڑا سا گڈّا ہے اس میں ایک بیل مرا پڑا ہے.. واشنئے صاحب کا صبح سے تین بار فون آ چکا ہے۔ اس بیل کو یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے اٹھوا کر کہیں دور پھینکو ... بدبو آ رہی ہے؟''

اسٹاف نے واشنئے صاحب کی پریشانی سے آگاہ کرایا۔

''تو یہ ہے، ضروری کام؟'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''یہ کام بھی اسٹیٹ آفس کے ذمّے ہے؟'' میں نے اسٹاف کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

''ہاں سر! اس کے لیے دس بارہ لوگوں کی ایک ٹیم ہمارے پاس ہے جو یہ

کام کرتی ہے اور وہ سب ہی اپنے کام میں ماہر ہیں۔" اسٹاف نے
ورکرس کے بارے میں مجھے بتایا۔

"تو پھر دقت کیا ہے اکٹھا کروان ورکرس کو جا کر دیکھو کیا ہوسکتا ہے۔" میں
نے اسے جانے کے لیے کہا۔

جی۔سی۔ایف کالونی کا علاقہ کافی بڑا تھا۔اس لیے ورکرس کو جمع کرنے میں
وقت لگتا۔فیکٹری سے ایک ٹرک بھی وہاں پہنچ چکا تھا جس میں بیل کو اٹھا کر کہیں دور
جنگل میں پھینکنا تھا۔جی۔سی۔ایف کے آس پاس کا علاقہ پہاڑی ہونے کے ساتھ
ساتھ دور دور تک پھیلا ہوا جنگل بھی تھا۔اسٹاف نے مجھے فون پر بتایا:

"ورکرس کام پر لگ گئے ہیں لیکن بیل کافی بھاری ہے اور اسے بارہ تیرہ
گھنٹے ہو چکے ہیں۔اس لیے اٹھاتے وقت جگہ جگہ سے اس کی کھال پھٹ
رہی ہے اور بدبو بھی زیادہ آرہی ہے۔واشنئے صاحب بھی باہر کھڑے
ہیں وہ اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد میں بھی جب وہاں پہنچا حقیقتاً واشنئے صاحب اپنے بنگلے کے
سامنے منہ پر کپڑا لپیٹے کھڑے تھے۔ورکرس اس مشکل اور بدبودار کام کو انجام دینے
میں مشغول تھے۔مجھے دیکھتے ہی واشنئے صاحب بولے:

"ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ہے لیکن یہ لوگ اس بیل کو ٹرک میں نہیں
چڑھا پا رہے ہیں۔سب کے سب حرام خور اور نکمّے ہو گئے ہیں۔"

ان کے اس ردّعمل نے مجھے مجبور کر دیا تھا کی میں ان کی رائے کا جواب دوں۔
جس محنت سے ورکرس بدبودار بیل کو اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے بغیر کسی گارڈ کے،
اپنی صحت کی پرواہ کیے بغیر وہ پورے انہماک سے کام میں لگے ہوئے تھے اور واشنئے
صاحب انھیں نکمّا کہہ رہے تھے۔مجھے ان کا اس طرح ورکرس کے کام کو نہ ماننا کسی
طرح گوارا نہیں ہوا۔میں نے بنا دیر کیے کہا:

"اتنا آسان کام نہیں ہے سر! آپ اتنی دور کھڑے ہیں پھر بھی اپنے منہ

اور ناک پر کپڑا ڈھک رکھا ہے۔ان کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے اپنی حفاظت کے لیے، کیا انھیں بد بو نہیں آ رہی ہوگی ؟ انھیں کیا اپنی صحت کی فکر نہیں ہے؟ پھر بھی وہ پوری محنت سے کام کر رہے ہیں...''

میری پوری بات سنے بغیر ہی واشنئے جی بنگلے کے اندر جانے کے لیے کچھ اس طرح مڑے جیسے میں نے انھیں گالی دے دی ہو۔جاتے جاتے انھوں نے بنگلے کا گیٹ اتنی زور سے بند کیا کہ اس کی آواز دور تک سنائی دی۔انھیں لگا کہ میں نے ان کی انا پر چوٹ ماری ہے۔دروازے کی آواز کو کام کرتے ہوئے ورکرس نے بھی سنی، اس لیے وہ سب گیٹ کی طرف دیکھنے لگے تھے کی اچانک واشنئے جی کو کیا ہو گیا۔کافی مشقت کے بعد لڑکوں کی تکنیک کام کر گئی اور وہ مرے بیل کو ٹرک میں چڑھانے میں کامیاب ہو گئے۔مجھے دیکھتے ہی ان کا مقدّم گنیش جوان کے ساتھ تھا میرے پاس آیا۔

''سر! لڑکوں کی ہمت دیکھی آپ نے؟''

''ہاں دیکھی...ویری گڈ...گنیش کل سب سے پہلا کام آپ یہ کریں گے کہ ان سب کے لیے گارڈس جو ضروری ہے فیکٹری اسٹور میں جا کر ڈھونڈھیں گے اگر وہاں موجود نہیں ہے تو بازار سے خرید کر لائیں گے۔ بنا گارڈ کے ان لوگوں کو اس کام میں نہیں لگایا جائے گا سمجھ رہے ہیں میری بات۔اتنی بد بو کا کام یہ لوگ بغیر کسی حفاظت کے کر رہے ہیں اس کی طرف آپ لوگوں نے کبھی دھیان کیوں نہیں دیا؟ کیا ان لوگوں کی زندگی ضروری نہیں ہے؟'' میں نے زور دے کر مقدّم کو ہدایت دی۔

مقدّم گنیش میرا منہ دیکھ رہا تھا کیوں کہ اس سے پہلے کسی نے ان مزدوروں کی حفاظت کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔انھیں تو بس ان کے کام سے مطلب تھا یہ جیے یا مرے ان کی بلا سے۔

''سر ایک گزارش ہے یہ لڑکے کافی تھک گئے ہیں ان کو نہانا دھونا بھی ہے، آپ ٹھیک سمجھیں تو لنچ کے بعد ان کو چھٹی دے دیں؟'' مقدّم نے کہا۔

''ٹھیک ہے جانے دو انھیں۔ لیکن میں نے جو کہا ہے اس پر بھی دھیان دینا ہے مجھے کل رپورٹ دیں گے کہ کیا پوزیشن ہے۔''

کہہ کر میں واپس اپنے آفس میں آ گیا لیکن واشنئے صاحب کے رویّہ سے میرا سر بھنّا رہا تھا۔ اپنی صحت ٹھیک تو سب ٹھیک دوسرا جان سے بھی چلا جائے تو کچھ نہیں... عجیب ذہنیت ہے۔ اس کے بعد لنچ کے لیے گھر جانے کا میرا دل بھی نہیں کیا۔ واشنئے اور مرا ہوا بیل میرے دل و دماغ میں گھس کر بیٹھ گئے تھے اور دونوں ہی بھیانک بدبو کا سبب بن رہے تھے۔

اس واقعہ کے بعد واشنئے صاحب قدم قدم پر مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی دوران ایک اچھے لوکیشن کا مکان خالی ہوا تھا۔ یہ مکان جی۔ سی۔ ایف سے اسٹیشن جانے والی سڑک اور بازار کے پاس تھا۔ جس میں جگہ بھی کافی تھی۔ تھا تو کافی پرانے ڈیزائن کا لیکن سہولیات کے تحت اچھا تھا۔ اس مکان کے لیے میں نے بھی درخواست دی۔ واشنئے جی آخر تک یہی کہتے رہے کہ آپ کو ہی ملے گا۔ رہائشی کوارٹرس کا تعین واشنئے جی کی ہی ذمہ داری تھی لیکن اچانک وہ مکان مجھ سے کم عہدے کے افسر کو دے دیا گیا۔ جب مجھے پتہ چلا تو میں واشنئے جی سے پوچھنے گیا، کہنے لگے:

''والمیکی جی! آپ کو اس سے بڑھیا بنگلا الاٹ کریں گے آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔''

میں نے کہا: ''لیکن سر! عہدے کے اعتبار سے تو مجھے ملنا چاہیے تھا اور آپ بار بار یہی کہتے رہے کہ یہ مکان مجھے ہی الاٹ ہوگا۔ پھر اچانک یہ کیسے ہوا؟''

''آپ کو ہم پر یقین نہیں ہے؟ ہم نے کہا نہ کہ آپ کو اس سے بہتر بنگلہ الاٹ کریں گے۔'' واشنئے جی نے زور دے کر کہا۔

مجھے لگا کہ یہ سب جان بوجھ کر کیا جا رہا ہے۔

''ٹھیک ہے سر! میں آپ کی بات پر یقین کر کے جا رہا ہوں، لیکن دیکھتے

ہیں آپ اگلی بار کیا کرتے ہیں۔'' کہتے ہوئے میں ان کی آفس سے باہر آ گیا۔

کچھ دن کے بعد ایک اور بنگلہ خالی ہوا۔ میں نے پھر سے درخواست بھیجی۔ واشنئے جی نے وہی تکنیک اپنائی آخر تک کہتے رہے کی بس چابی آپ ہی کو ملے گی...لیکن وہ بھی کسی دوسرے افسر کو دے دی گئی۔ میں بہت غصہ میں ان کے آفس گیا۔ انھوں نے اتنے بہانے میرے سامنے رکھ دئے کہ مجھے واپس آنا پڑا، پھر بھی میں نے کہہ ہی دیا:

''سر! اگر مجھے مکان دینے میں آپ کو دقت ہو رہی ہو تو صاف صاف بتائیں میں درخواست ہی نہیں دوں گا۔ پچھلی بار اپنے مجھے پختہ یقین دلایا تھا وہ تو ہوا ہو گیا، اب مجھے کیا کرنا چاہئے یہ بھی بتا دیجئے۔''

''والمیکی جی! دیں گے آپ کو بھی مکان آپ اتنا بھڑک کیوں رہے ہیں؟'' واشنئے جی نے کہا۔

''ٹھیک ہے سر! اگلی بار دیکھتے ہیں آپ کس طرح سے مجھے اپنے قاعدے قانون سمجھائیں گے۔'' کہہ کر میں واپس آ گیا۔

تیسری بار بھی ویسا ہی ہوا، آخر تک واشنئے جی یہی کہتے رہے کہ چابی آپ کو مل رہی ہے۔ دو تین دن میں آڈر ہو جائے گا چابی لے لینا۔ تیسرے دن جب میں پتہ کرنے گیا تو واشنئے جی نے کہا۔

''آپ جا کر چابی لے لیجیے۔''

جب میں چابی لینے گیا تو مجھے بتایا گیا کہ بنگلہ کسی دوسرے افسر کو دے دیا گیا ہے اور وہ چابی بھی لے کر چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ واشنئے جی ایسا کیوں کر رہے ہیں میں واشنئے جی کے آفس گیا اور دروازہ کھول کر سیدھے ہی کہا:

''اس مذاق کے لیے شکریہ سر! مجھے نہیں پتہ تھا کہ آپ میرے ساتھ اس طرح سے پیش آئیں گے۔ میں آپ کے ماتحت کام کرتا ہوں اور آپ ہی میرے ساتھ اس طرح کا سلوک کریں گے یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔

تھینک یو سر! اچھا ہے مجھے احساس کرا دیا۔'' کہتے ہوئے میں باہر آ گیا۔

اسی روز شام کو مہیندر روشششٹ میرے گھر آئے۔ بات بات میں مجھ سے واشنئے جی کی حرکت کا ذکر نکل گیا۔ میں اس کو موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن بات منھ سے نکل چکی تھی۔ تو وہ کہنے لگے:

''چلو! ابھی چلتے ہیں اور ان کی اس حرکت کا جواب دے کر آتے ہیں۔''

میں نے کہا: ''نہیں مہیندر جی رہنے دیجیے۔ ویسے بھی مجھے زیادہ دن جبل پور میں نہیں رہنا ہے۔''

لیکن وہ نہیں مانے اور اسی وقت واشنئے کے بنگلے پر چلے گئے۔ اگلے روز پتہ چلا دونوں میں کافی جھگڑا ہوا ہے۔ مہیندر روشششٹ جی نے انھیں یہ بھی کہا تھا کہ اب آگے سے اپنے بلس ذرا سوچ سمجھ کر بھیجنا۔ والمیکی جی چپ ہیں اس کی کچھ وجہ ہے لیکن میں خاموش نہیں رہوں گا۔ دونوں کے بیچ جھگڑا بڑھ گیا تھا۔ جب میں مہیندر جی سے ملنے ان کے آفس گیا تو انھوں نے تفصیل سے پورا واقعہ سنایا تھا۔ ساتھ ہی کہا کہ اب وہ تمھیں تنگ نہیں کریں گے۔ ایڈمن کے جتنے بھی بلس آتے ہیں ان پر میری نظر رہے گی. کہیں نہ کہیں تو وہ پھنسے گا۔

میں نے کہا: ''مہیندر جی! آپ ایسا کچھ نہ کریں اس فیکٹری کے کام میں دقتیں آئیں گی. جو میں نہیں چاہتا ہوں۔''

''آپ کچھ بھی کہیں پر اسے تو میں سبق سکھا کر ہی رہوں گا۔''

مہیندر روشششٹ نے سنجیدگی سے کہا۔

لیکن واشنئے جی کے ذہن میں جو چل رہا تھا اسے نکالنا اتنا آسان نہیں تھا۔ کہیں نہ کہیں میرے نام کو لے کر ان کے ذہن میں پہلے سے جو خیالات تھے اس کا اثر دکھائی دینے لگا تھا۔ ان کا ایک آفیشیل خط ملا۔ جس میں لکھا تھا جی۔ سی۔ ایف بازار کے دکانداروں پر بقایہ کرایا جتنی جلدی ہو سکے وصول کیا جائے۔ جس کی ہفتہ وار رپورٹ مجھے بنا کسی ٹال مٹول کے بھیجی جانی چاہیے۔ اگر اس میں کسی بھی قسم کی تاخیر ہوئی

تو افسر کی ذمہ داری ہوگی اور اگر اس کام میں ذرا بھی سستی ہوئی تو افسر کے خلاف قانونی کاروائی ہوگی۔ یعنی دھمکی بھرا خط مجھے خفیہ طریقے سے بھیجا گیا تھا۔

ہر کوئی جانتا تھا کہ بازار سے کرایہ وصولنے میں جی۔سی۔ایف (انتظامیہ) کئی سال سے ناکام رہی تھی۔ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا۔ جب جب کرایہ کی بات آتی بازار میں غنڈہ گردی دیکھنے کوملتی۔ جب میں نے بازار میں کام کرنے والوں کو بلا کر معلومات کی تو تمام لوگوں کی ایک رائے تھی:

''صاحب! بہت ٹیڑھا کام ہے۔اس معاملے میں آپ سے پہلے کے دو افسر سرے عام مار کھا چکے ہیں۔ جی۔سی۔ایف کی سکیوریٹی اور پولیس بھی اس معاملے میں ناکام رہی ہے۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ اب آپ کو اس معاملے میں الجھایا جارہا ہے لیکن صاحب ہماری تو یہی رائے ہے کہ آپ خاموش ہوکر بیٹھ جائیں۔ کچھ دن میں پھر بات اٹھے گی تب تک کا وقت تو گذر ہی جائے گا۔''

میں نے بازار میں پوسٹیڈ اسٹاف سے پوچھا: ''آپ کی کیا رائے ہے؟''

اس نے بھی ہچکچاہٹ کے ساتھ بتایا:

''صاحب پچھلی بار جب ہم سکیوریٹی کو لے کر کرایہ وصول کرنے بازار گئے تو وہاں پہلے سے ہی غنڈے لوگ ہاکی، ڈنڈے اور تلواریں لے کر کھڑے ہوئے تھے۔اس وقت پولیس اور جی۔سی۔ایف انتظامیہ بھی ہماری مدد نہیں کرسکی تھی ہم لوگ چپ چاپ واپس آگئے تھے۔''

یعنی میرا حوصلہ توڑنے کے سارے ہتھیار پہلے سے تیار تھے۔ میں نے اسٹاف اور ورکرس کو یقین دلانے کی کوشش کی اور کہا:

''کیا مجھے بھی ڈر کر چپ بیٹھ جانا چاہیے؟ اگر آپ سب لوگوں کی رائے 'ہاں' ہے تو مجھے یہ نوکری چھوڑ دینی چاہیے یہ میری رائے ہے۔ یہ میرے لئے ایک چیلنج ہے آپ لوگوں میں سے جو یہ سوچتا ہے کہ اس کو یہ

کام نہیں کرنا ہے وہ کھل کر بتا سکتا ہے اور جو اس مشکل اور خطرے کے کام میں میرے ساتھ کھڑا ہونا چاہتا ہے وہ بھی بتائے۔ کسی پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔''

وہ سب لمحہ بھر تک تو خاموش رہے۔ میں نے ان کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے ایک مزدور اٹھا:

''صاحب میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد ایک ایک کر کے سبھی نے ساتھ دینے کا یقین دلایا۔ میں نے کہا:

''آپ سب کا شکریہ! اب سب سے پہلا کام یہ کرنا ہے کہ جو ہمارے درمیان گفتگو ہوتی ہے اس کا ذکر آپ باہر کسی سے بھی نہیں کریں گے۔ دوسرا کل تمام دکانداروں کو بازار والے آفس میں چائے کی دعوت دو شام کے چار بجے۔ خیال رہے کی صرف چائے ناشتے کے لیے بلایا ہے۔ یہ دعوت میری طرف سے ہے آفس میں کرسیوں کا انتظام بھی کرنا ہے۔ چائے اور سموسے کا آرڈر بھی دینا ہے۔ آپ سب لوگ بھی وہاں موجود رہیں گے۔ او کے!''

وہ سب میرا منھ تک رہے تھے ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ ان دکانداروں کو جو غنڈہ گردی کرتے ہیں ان کو چائے ناشتے پر کیوں بلایا جا رہا ہے۔

بازار کے نگراں نے پوچھا: ''سر! اگر وہ نہیں آئے تو؟''

''آپ جا کر دعوت تو دو پھر دیکھو کہ آتے ہیں یا نہیں۔ پہلے سے ہی منفی سوچ کیوں؟ یہ ایک کوشش ہے اگر کامیاب ہوئے تو جیت ہماری اور فیل ہوئے تو دوبارہ کوشش کریں گے...او کے کل ملتے ہیں بازار والے آفس میں، شام چار بجے!''

ان کے چہروں پر ایک عجیب طرح کی خوشی نظر آ رہی تھی جس کو میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ سب بڑے محنتی ہیں لیکن گمراہ ہیں۔ اگر کل ہم کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہی

لڑ کے فتح یاب ہو کر اپنے گھر جائیں گے یہ میرا یقین تھا۔

اگلے روز جب میں بازار والے آفس میں ٹھیک چار بجے پہنچا تو تقریباً ۵۰ لوگ آفس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کروایا اور ان کا شکریہ ادا کیا کہ وہ سب میرے بلانے پر آئے مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ چائے ناشتہ ہو جانے کے بعد میں نے ان سب سے پوچھا:

''بازار میں آپ لوگوں کو کسی بھی طرح کی پریشانی ہے تو مہربانی کر کے مجھے بتائے تا کہ میں ان کا حل نکال سکوں۔''

ایک بزرگ دکاندار ہاتھ جوڑ کر بولا:

''صاحب! یہ پہلی بار ہوا ہے کہ ہم لوگ آمنے سامنے بیٹھے ہیں ہمارے لائق کوئی کام بتائے ہم کریں گے۔''

''ضرور بتائیں گے لیکن ایک بات جو میں آپ لوگوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ جس جگہ پر آپ لوگ دکان چلا رہے ہیں وہ جگہ جی۔سی۔ایف کی ہے۔ آپ اپنی روزی روٹی کمانے کے لیے اس کا استعمال کر رہے ہیں ،کیا اس کے بدلے میں جی۔سی۔ایف کا یہ حق نہیں بنتا کہ اس جگہ کا آپ لوگ واجب کرایہ جی۔سی۔ایف کو دیں؟'' میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

وہی بزرگ سب سے پہلے بولے:

''کرایہ دینے سے ہم نے کبھی منع نہیں کیا لیکن جی۔سی۔ایف کے کار کنان جس طرح پیش آتے ہیں اس سے یہاں کا ماحول بگڑ جاتا ہے۔''

اس بزرگ کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا جس کے ہونٹ پان کی پیک سے بھرے ہوئے تھے اور اس نے گلے میں ایک رنگین گمچھا کچھ اس طرح ڈال رکھا تھا کی جیسے وہ اس علاقے کا سب سے بڑا رنگ دار ہے۔ ایک دم سے تناؤ میں آ کر بولا:

''ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں جوان سب سے ڈر کر چپ بیٹھ جائیں گے۔''

''آپ کا تعارف؟''میں نے پوچھا۔

''ٹھاکر للت پرساد!''اس نے اسی ٹھسکے میں جواب دیا۔

''آپ کب سے دکان چلا رہے ہیں؟''میں نے پوچھا۔

''پچھلے پانچ سالوں سے ... پان تمباکو اور گٹکے کی دکان ہے میری پیپل کے پیڑ کے پاس!''وہ ایک سانس میں ساری بات کہہ گیا۔

''آپ نے کرایا کب سے نہیں دیا؟ اور کیوں نہیں دیا؟''

میں نے تھوڑا سخت لہجے میں کہا۔ اس بار وہ کچھ نہیں بولا صرف خاموشی سے میری طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔

میں نے بزرگ دکاندار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''آپ سب چھوٹے چھوٹے دکاندار ہیں جو کسی طرح اپنے گھر کے لیے روزی روٹی کمانے کی کوشش کر رہے ہیں اسی لیے جی۔سی۔ایف نے آپ لوگوں کو جگہ بھی دی ہے۔ پھر اس میں غنڈہ گردی اور لڑائی جھگڑا کہاں سے آ گیا۔ رہی ہمارے کارکنان کے سلوک کی بات میں آپ سب کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے کارکناں سے آپ کوئی شکایت نہیں ہوگی بدلے میں میں آپ سب سے یہی امید رکھتا ہوں کہ آگے سے ٹھاکر للت پرساد جیسی زبان ہم سننا نہیں چاہیں گے۔ اگر آپ سب میری بات سے متفق ہیں تو ہم کوئی بیچ کا راستہ نکال سکتے ہیں جس میں آپ کو بھی کوئی مشکل نہ ہو اور جی۔سی۔ایف انتظامیہ کو بھی کوئی قانونی کاروائی نہ کرنا پڑے...''

میری بات کو بیچ میں کاٹ کر ٹھاکر للت پرساد نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن وہاں موجود اس بزرگ نے اسے ڈانٹ دیا تو وہ چپ ہو گیا۔ بزرگ نے ہاتھ جوڑ

کر درخواست کی:

''صاحب! آپ اپنے دل کی بات بتائیے۔ ہم لوگ بڑی مشکل سے گذارا کرتے ہیں اتنی آمدنی نہیں ہوتی ہے کہ بقایہ کرایہ ایک ساتھ جمع کر دیں۔''

میں نے کہا: ''میں بھی آپ کی بات سے متفق ہوں... میری بھی ایک تجویز ہے... کہ اس مہینے سے آپ لوگ جو بھی طے کیا گیا کرایہ ہے وہ بھی جمع کر دیں۔ کس تاریخ تک آپ لوگ جمع کریں گے وہ طے کر لیتے ہیں۔ اس سے پہلے ہمارا کوئی بھی کارکن آپ کے پاس نہیں آئے گا۔ آپ لوگ چاہے تو دکان پر ہی کرایہ دیں یا آفس میں آکر جمع کر دیں، یہ آپ کے اوپر ہے... اس بات سے کتنے لوگ متفق ہیں... یہ بھی پتا چلے تو اچھا رہے گا!''

جواب بزرگ نے دیا: ''ٹھیک ہے صاحب! مہینے کی ۱۵ ر تاریخ تک ہم ہر مہینے کا کرایہ جمع کر دیں گے۔''

''ٹھیک ہے... میری آپ لوگوں سے ایک اور درخواست ہے کہ پچھلے بقایہ کرایہ کے بارے میں بھی آج بات کر لیں تو اچھا رہے گا... کیوں کہ انتظامیہ کا ہم پر کافی دباؤ ہے اور ہمیں بھی تو نوکری کرنی ہے... اگر آپ ٹھیک سمجھیں تو جن کا کرایہ ۵۰۰ ر روپے مہینہ ہے وہ ۵۰۰ کے ساتھ پچھلا ۱۰۰ ر ہر مہینے دیں گے۔ جس سے بقایہ کرایہ بھی آپ لوگوں پر گراں نہیں گذرے گا۔ جو ہر مہینے ۲۵۰ روپے دیتے ہیں وہ ۵۰ روپے ہر مہینے پچھلا بقایہ دیتے رہیں گے۔ جس کی رسید آپ لوگوں کو ملے گی...''

کچھ دیر تک ان دکانداروں میں آپس میں کانا پھوسی ہوتی رہی تھوڑی دیر بعد خاموش ہو کر بیٹھ گئے اور انھوں نے ہماری شرطیں مان لیں۔ اچانک ایک نوجوان دکاندار بولا:

''صاحب! ہم نے آپ کی ساری باتیں مان لی ہیں اب آپ ہماری ایک بات مان لو۔''

''ہاں! کہیے''میں نے یقین دلایا۔

''صاحب! وہ پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک بڑھیا بیٹھتی ہے مٹّی کے برتن بیچتی ہے۔ وہیں اس نے اپنی جھوپڑی بنالی ہے۔ اس بیچاری کا اپنا کوئی نہیں ہے۔ اس کی آمدنی بھی اتنی نہیں ہوتی ہے ہر مہینے ۳۰۰/روپے دے سکے۔ اگر آپ کی مہربانی ہو جائے تو اس سے کرایا نہ لیا جائے۔ ویسے بھی اس کا کوئی بھروسا نہیں کہ کتنے دن اور جیے گی۔''

میں نے اپنے کارکناں کی طرف دیکھا۔ انھوں نے بھی اس بڑھیا کے لیے رضامندی دے دی۔

''ٹھیک ہے جب میں یہاں ہوں اس سے کوئی کچھ نہیں کہے گا... بعد کی میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔''

تمام دکاندار میری بات سے خوش ہو گئے۔ اس طرح ہم نے بازار کی پہلی جنگ فتح کر لی تھی۔ دو مہینے میں ہم نے تقریباً ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ کی رقم جمع کر کے جی۔ سی۔ ایف کے خاطے میں جمع کر دیے۔ یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی لیکن واشنئے جی خوش نہیں تھے۔ ان کا ارادہ تو کچھ اور ہی تھا جس کو میں نے ناکام کر دیا تھا۔ سارا بازار میرے ساتھ کھڑا تھا دکانداروں کا پورا ساتھ مجھے ملا۔

ایک دن مکھیجا صاحب کے پی۔ اے کا فون آیا:

''والمیکی جی! صاحب یاد کر رہے ہیں۔ کتنی دیر میں آسکتے ہو؟''

میں نے کہا:''میں ابھی آتا ہوں... کوئی خاص بات؟''میں نے جاننے کی کوشش کی۔

پی۔ اے نے کہا:''میرے خیال سے کوئی خاص بات تو نہیں ہے... پھر بھی کہہ نہیں سکتے۔ ویسے آج صاحب اچھے موڈ میں ہیں... آجاو۔''

مکھیجا صاحب مجھ سے کافی گرم جوشی سے ملے۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ انھوں نے مجھے بیٹھنے کا شارہ کیا۔ چند لمحوں تک وہ مجھے دیکھتے رہے۔ پھر میرے بارے میں پوچھ تاچھ کی، مثلاً اب تک کس فیکٹری میں کام کیا ہے، کس علاقے میں کتنے تجربات ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں ریسرچ اور ڈیولپمنٹ کے کاموں میں لمبے عرصے سے منسلک رہا ہوں اور مکینیکل ڈیزائننگ میں کافی تجربہ ہے تو بولے پھر اسٹیٹ آفس میں آپ کی پوسٹنگ کیسے ہوگئی؟ میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک بار تو لگا کہ کہے دیتا ہوں کہ یہ جو میرا نام ہے واشنئے جی کی نظر میں میری قابلیت بن گیا ہے۔ لیکن میں خاموش رہا پتہ نہیں مکھیجا صاحب کا اس جواب پر کیا ردِّ عمل ہوگا؟ ویسے بھی یہ پہلی ملاقات تھی کہیں کوئی غلط اثر نہ پڑ جائے یہ سوچ کر چپ رہا۔ وہ میری طرف دیکھتے رہے پھر اچانک بولے:

''کس شعبہ میں آنا چاہو گے؟''

میں نے ان کی طرف دیکھا وہ بہت فکر مند لگ رہے تھے۔

''جی ضرور... ویسے بھی وہاں میری مرضی کا کام نہیں ہے۔ اس شعبے کو تو کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔'' میں نے دبی آواز میں کہا۔

ایک ہفتے کے اندر اندر میری پوسٹنگ پروڈکشن ڈپارٹمنٹ میں ہوگئی۔ اس محکمہ میں ٹی ۷۲ رگن کی اسمبلی ہوتی تھی کچھ خاص پرزے بھی بنائے جاتے تھے۔ محکمہ کافی بڑا تھا تقریباً دو سو ماہر کاری گر کام کرتے تھے جس کا سالانہ ٹرن اور بھی کافی زیادہ تھا۔ اس پوسٹنگ سے میری ذہنی صلاحیت میں اضافہ ہوا تھا۔ دل میں جو بھی احساس کم تری تھی وہ بھی ایک جھٹکے میں ختم ہوگئی۔ اس شعبہ میں صبح سے شام تک مشغول رہنا پڑتا تھا۔ دن میں دو بار مکھیجا صاحب کا دورہ ہوتا تھا یہ ایک ایسا اصول تھا جس میں کسی طرح کی رعایت نہیں ہوتی۔ پروڈکشن کے ہر مرحلہ پر ان کی نظر رہتی، کہیں پر ذرا بھی کوتاہی ہوئی کہ وہاں تعینات افسر کی خیر نہیں۔ بے حد سخت اور تیکھا بولتے تھے لیکن اس سے مجھے ایک فائدہ ہوا کہ نئے کام کو سمجھنے میں مکھیجا صاحب سے کافی مدد ملی لیکن باہر

اسٹیٹ آفس میں جس طرح یار دوست بے روک ٹوک کے ملنے آتے تھے اس پر پابندی لگ گئی تھی۔ باہری آدمی کا فیکٹری کے اندر آنا ممکن نہیں تھا ڈھیروں رسومات ادا کرنی پڑتی تھیں۔ خمریاں سے آگے پروف رینج تھا جہاں جی۔ سی۔ ایف میں بنائی گئی بندوق کا فائرنگ ٹرائل ہوتا تھا وہاں بھی کبھی کبھی جانا پڑتا تھا۔

ایک روز اچانک مکھیجا صاحب کی بیوی کا فون آیا، اس وقت میں ورک شاپ میں مکھیجا صاحب کے ساتھ راؤنڈ پر تھا۔ جب آفس کے کلرک نے بتایا کہ میڈم مکھیجا فون پر ہیں، مجھے لگا کہ مکھیجا صاحب سے بات کرنا چاہ رہی ہوں گی ...لیکن مکھیجا صاحب نے کہا:

''ارے ہاں! جاؤ جا کر بات کرو شاید آپ سے کچھ کام ہے انھیں!''

میں عجیب سی کشمکش کے ساتھ فون پر آیا۔ جیسے ہی میں نے ہیلو کہا وہ فوراً بولیں: ''مسٹر والمیکی! آپ سے ذاتی کام ہے کیا آج شام کو آپ میرے بنگلے پر آسکتے ہیں؟''

''جی...میڈم! کتنے بجے آنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آجانا سات بجے تک اور ہاں بیوی کو بھی ساتھ لیتے آنا۔ رات کا کھانا آپ لوگ یہی کھائیں گے...او کے۔''

انھوں نے مجھے کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں ان کی دعوت پر تھوڑا حیران بھی تھا کہ ہمیں ڈنر پر بلایا جا رہا ہے یا کوئی اور وجہ ہے۔ ویسے بھی ایک اعلیٰ افسر اپنے سے ادنیٰ افسر کو کھانے پر بلائے یہ کلچر آرڈیننس فیکٹری کی تہذیب میں نہیں تھا۔ اس حقیقت سے میں اچھی طرح واقف تھا، دل میں کئی طرح کے سوالات دستک دے رہے تھے...پھر بھی میں نے چندا کو فون کیا کی شام کو مکھیجا صاحب کے گھر ڈنر کے لیے جانا ہے ان کی بیوی کا فون آیا تھا۔ اس دعوت سے چندا کو بھی حیرانی ہوئی تھی۔ ہم لوگ ابھی تیار ہی ہو رہے تھے کہ باہر گاڑی کا ہارن بجا میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو نیچے سرکاری گاڑی کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

''سر! میدم مکھیجا نے گاڑی بھیجی ہے۔''

''ٹھیک ہے تھوڑا رکو ابھی آتے ہیں۔'' میں نے ڈرائیور سے انتظار کرنے کو کہا۔

چندا گاڑی کے آنے پر اور زیادہ حیران ہوئی، لگتا ہے کوئی زیادہ ہی خاص بات ہے جو میدم مکھیجا نے گاڑی بھجوائی ہے۔

جب ہم مکھیجا صاحب کے بنگلے پہنچے، مکھیجا صاحب کی بیوی باہر صحن میں کھڑی ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ میں ان سے پہلی بار مل رہا تھا، فون پر تو کئی دفعہ بات ہو چکی تھی وہ بھی تب جب میں اسٹیٹ آفس دیکھ رہا تھا اور وہ ہر روز لیبر بنگلے پر بھیجنے کے لیے کہتیں تھیں۔ انھوں نے عزّت کے ساتھ ہمارا استقبال کیا ڈرائنگ روم میں بٹھایا، انھوں نے بے حد شائستگی اور اپنائیت سے بات کی، ان کے برتاؤ میں ذرا بھی جھلک نہیں تھی کہ وی۔ جی۔ سی۔ ایف کے ایڈیشنل جنرل منیجر کی بیوی ہیں.... جو اس وقت سیدھے سیدھے میرے باس ہیں۔ اسی دوران ہماری گفتگو میں مکھیجا صاحب بھی شامل ہو گئے۔ ان کا برتاؤ بھی کافی بدلا ہوا تھا کافی گھل مل کر بتیا رہے تھے۔ اچانک گفتگو کا رخ بدل گیا، مکھیجا صاحب کی بیوی نے کہا:

''والمیکی جی! میں آپ کو ایک گیت سناتی ہوں، یہ بتائیے کیسا ہے؟''

اور انھوں نے مشہور فلم کا گیت گانا شروع کیا جس کو لتا منگیشکر نے گایا تھا۔ انھوں نے بے حد خوبصورتی سے گانا گایا۔ ان کا گلا بے حد سریلا تھا، سر تال کی بھی مکمل معلومات تھی انھیں! گانا ختم ہونے پر میں نے ان کی تعریف کی تو وہ بولیں:

''لیکن والمیکی جی! مجھے آپ کی ایک مدد چاہیے''

میں نے کہا: ''میم یہ تو موسیقی کا معاملہ ہے۔ جس میں صفر ہوں۔ بھلا اس میں میں کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

''کر سکتے ہو مجھے پتا ہے آپ شاعر ہو۔ بس اتنا کرنا ہے کہ اس گانے کی دھن پر آپ کو الفاظ بٹھانے ہیں۔''

اچانک مجھے لگا کہ کسی نے مجھے چلتی ٹرین سے دھکا دے دیا ہو۔ یعنی مجھے اس

گانے کی پیروڈی لکھنی ہے۔ ایک شاعر کے لیے اس سے بڑی سزا کیا ہوگی کہ اس سے پیروڈی لکھنے کو کہا جائے۔ لمحہ بھر کو میں ان کے چہرے کو تکتا رہ گیا کہ اتنا سریلا گلا اور اتنی اچھی پیش کش، پھر یہ پیروڈی کا بھوت کہاں سے آ گیا۔

میں نے ہمّت کر کے کہا: ''میم! اس گانے کے تو بول بھی اتنے اچھے ہیں تو پھر آپ اپنے لفظوں کو اس میں کیوں ڈالنا چاہتی ہیں۔''

''مجھے اچھا لگتا ہے بس ایک آدھ دن میں آپ اس گانے کے الفاظ بدل کر مجھے دے دیجیے۔ آپ تو شاعر ہیں آپ کے لیے یہ کام اتنا مشکل نہیں ہوگا۔''

انھوں نے ایک طرح سے فیصلہ سنا دیا تھا۔ چندا میری اس قابل رحم حالت پر آہستہ آہستہ مسکرا رہی تھی، جیسے کہہ رہی ہو ...بچّو آج پھنس گئے ہو، بڑے شاعر بنے گھوم رہے تھے اب تو پیروڈی نگار بھی بن جاؤ گے۔ میں نے اور بھی کئی دلیل دیں مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

اچانک بولیں: ''چلو! کھانا تیار ہے ...کھانے کے بعد میں آپ کو اپنی پسند کے ایک دو گیت اور سناؤں گی۔''

اس فیصلے کے بعد میرا دل نہ تو کھانا کھانے کو ہو رہا تھا اور نہ ہی گانا سننے کا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی خطرناک سازش میں پھنس گیا ہوں۔ آدھے ادھورے دل سے میں نے کھانا کھایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب میری نوکری کا خطرناک دور شروع ہونے والا ہے کیوں کہ میں نے نوکری اور مصنّف کے درمیان فاصلہ بنا رکھا تھا، لیکن یہاں تو سر منڈاتے ہی اولے گر پڑے تھے۔ مکھیجا صاحب کی بیوی نے تین چار گانے سنائے میں نے ان کی رسماً تعریف بھی کی۔ اس وقت جو میری ذہنی حالت ہو رہی تھی مجھے گانے نہیں سنائی دے رہے تھے۔ میری ساری توجّہ تو شاعر کے قتل پر اٹکی ہوئی تھی۔ کسی طرح سے جان چھڑا کر ہم لوگ واپس آئے۔ گھر آتے ہی چندا نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ جتنا ہنس رہی تھی میں اتنا ہی خود کو گہرے سائے میں گھرا ہوا

محسوس کر رہا تھا۔ رات بھر میں اسی فکر میں لگا رہا کہ یہ سب میں کیسے کر پاؤں گا۔ صبح جب میں آفس پہنچا، ٹھیک سے بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ مکھیجا صاحب کی بیوی کا فون آ گیا:

''کچھ بنا والمیکی جی...!''

''جی میم! سرکار اونڈ ہو جائے پھر کچھ سوچتا ہوں۔''

''ارے! ان کی فکر کیوں کرتے ہو، وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ آرام سے اپنے آفس میں بیٹھو اور کوشش کرو کہ کم سے کم لنچ تک کچھ بنا دو۔''

''جی میم! جیسے ہی کچھ بنتا ہے میں آپ کو فون کروں گا۔''

میں نے خود کی جان بچانے کے لیے یہ کہہ تو دیا لیکن میں یہ کام کیسے کروں گا ابھی تک میرے دل میں اندیشہ تھا۔ ''ٹھیک ہے!'' اور ان کا فون بند ہو گیا۔

جان چھڑانے کی نیت سے اس روز فلمی گانے میں اپنے الفاظ بٹھائے تھے۔ لنچ میں گھر جانے سے پہلے وہ پیروڈی مکھیجا صاحب کو ان کے آفس میں جا کر دے دی۔ انھوں نے پڑھ کر کہا:

''الفاظ تو اچھے ہیں۔''

میں نے کہا: ''میم کو پسند آنے چاہیے۔''

''آئیں گے ...ضرور آئیں گے۔'' مکھیجا صاحب نے میرا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔

لیکن میں جانتا تھا اس وقت میں کس کرب سے گذر رہا تھا معلوم نہیں آگے میرا کیا حشر ہونے والا ہے یہ سوچ سوچ کر میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ شام کو جب میں ڈیوٹی کے بعد گھر پہنچا تو مکھیجا صاحب کی بیوی کا فون آیا:

''والمیکی جی ! گانا اچھا بنا ہے...سناتی ہوں آپ کو!''

اور انھوں نے پورا گانا فون پر ہی گا کر سنایا، جیسے جیسے گانا آگے بڑھ رہا تھا میرے برے دن شروع ہو رہے تھے۔ اب ہر روز ایک گانا لکھنے کی فرمائش شروع ہو جائے گی... مجھے ایسا اندیشہ ہونے لگا تھا اور میرا شک صحیح ثابت ہوا۔ جب بھی انھیں

کسی پروگرام میں جانا ہوتا ان کا فون آجاتا اور ورک شاپ کی مشغولیت میں مجھے ان کا گانا سننا پڑتا اور پھر ایک نئی پیروڈی۔ جب تک میں جبل پور میں رہا یہ سلسلہ جاری رہا اور اس دوران میں نے ایک بھی نظم نہیں لکھی۔ مکھیجا صاحب کی بیوی نے میری نظموں کو سکھا دیا تھا جو میرے لیے گہرے سایہ کی وجہ بن رہی تھی۔

لیکن ان کا برتاؤ چندا اور میرے لیے اپنے پن سے بھرا ہوا تھا۔ وہ چندا کا بے حد خیال رکھتی تھیں۔ وہ ایک ہرفن مولا عورت تھیں۔ ان کا فلمی گانوں کی پیروڈی بنا کر اسٹیج پر ان کو گانا یہ بات میرے گلے کبھی نہیں اتری۔ ان کا یہ شوق کچھ الگ قسم کا تھا۔ جس طرح کا ان کا سریلا گلا تھا وہ ایک اچھی گلوکار بن سکتی تھیں لیکن ان کے اس عجیب سے شوق نے ان کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ایسا مجھے لگتا ہے۔

چندا ہر اتوار کو آدھا پون گھنٹہ اپنی اما سے فون پر بات کرتی تھی۔ ان کے پڑوس میں ایک گھر تھا جہاں پر فون تھا ان سے کہہ رکھا تھا کہ اگر وہ اتوار کو اما کو فون پر بلا دیں تو ہم بات کر سکتے ہیں۔ وہ مان گئے بھلے لوگ تھے۔ فون پر اما کا ایک ہی اصرار ہوتا:

''دہرادون کب آرہے ہو؟''

ایک روز چندا نے کہا:

''مکھیجا صاحب سے بات کر کے دیکھو شاید کچھ مدد کر سکے۔''

میں نے کہا کہ:

''کوشش کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کچھ کر بھی پائیں گے یا نہیں کیوں کہ تبادلے کا آڈر آرڈیننس بورڈ کولکاتہ سے آتا ہے۔''

اگلے ہی روز مین نے اپنی پریشانی کا ذکر مکھیجا صاحب سے کیا۔ انھوں نے کہا:

''آپ درخواست لے کر آؤ، میں دیکھتا ہوں، کیا ہوسکتا ہے۔''

ان کا رویّہ مثبت تھا میں نے محسوس کیا تھا۔ اگلے ہی روز تبادلے کے لیے درخواست مکھیجا صاحب کو دے دی۔ جس پر اپنی رائے لکھ کر انھوں نے چیئرمین بورڈ کولکاتہ سے میرے تبادلے کی سفارش کی تھی۔ انھوں نے یہ بھی امید دلائی تھی کہ موقع

ملتے ہی وہ چیئر مین سے بھی بات کریں گے۔ ایک روز ورک شاپ کا راؤنڈ لیتے ہوئے ان کی نظر ایک طرف پڑے ہوئے کمپوننٹ پر گئی۔ انھوں نے مجھ سے کہا:

''آپ کو پتہ ہے یہ کمپونٹ پچھلے کئی برسوں سے اسی طرح پڑے ہیں کسی نے اس انھیں چھوا تک نہیں۔ دیکھو شاید آپ کے ہاتھ لگنے سے یہ انسٹرومنٹ اسمبل ہو جائیں، کوشش کر کے دیکھو۔''

میں نے انسٹرومنٹ کی ڈرائنگ منگا کر دیکھی اور ان کمپونٹ کو ایک ایک کر باہر نکالا۔ اسٹاف اور ورکر کی ایک ٹیم بنا کر کام شروع کر دیا۔ ٹیم نے کافی لگن سے کام کیا۔ کچھ لوگ ورک شاپ میں ایسے بھی تھے جو لگاتار یہی کہتے رہے کہ یہ یہاں اسمبل نہیں ہو سکتا لیکن دھیرے دھیرے ہمارا کام آگے بڑھنے لگا اور ہم اس آلے کی اختتامی اسمبلی تک آ گئے۔ بس اس کا ہائڈرولک ٹیسٹ باقی تھا جو کافی مشکل اور خطرے سے بھرا ہوا تھا۔ ٹیسٹ کرتے وقت آلے کے پھٹنے کا بھی ڈر تھا جس میں کسی کی جان بھی جا سکتی تھی۔ میں نے مکھیجا صاحب سے بات کی:

''سر! ٹیسٹ کرنے کے لیے ہمیں ایک سیفٹی گارڈ کی ضرورت ہے۔ آپ اجازت دیں تو ہم یہیں ورک شاپ میں اسے بنا سکتے ہیں۔''

انھوں نے ہماری تجویز مان لی۔ اگلے دن ہم سیفٹی گارڈ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ سیمنٹ اور کنکریٹ سے ہم ایک سیفٹی گارڈ بنا لیا۔ جب ہم پہلے آلے کا ٹیسٹ کر رہے تھے تو ورک شاپ کے کافی لوگ اسے دیکھنے آئے لیکن ہم نے وہاں بھیڑ نہیں لگنے دی۔ جو کام پچھلے پانچ برسوں میں نہیں ہوا تھا، وہ آج یہاں ہو رہا تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز واقعہ تھا۔ پہلے ہی ٹیسٹ میں ہم کامیاب ہو گئے ہم نے ایک ساتھ ۵ آلے بنائے۔ جس میں پہلا کامیاب ہو چکا تھا۔ یہ خوشخبری جب ہم نے مکھیجا صاحب کو سنائی تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔

میں نے کہا: ''سر! اگر ایک بار آپ خود بھی دیکھ لیں تو ہمیں بھی خوشی ہوگی۔''

ہم نے پانچوں آلوں کا ٹیسٹ کر لیا تھا۔ اگلے روز مکھیجا صاحب آئے تو انھیں

دکھانے کے لیے ورکرس میں بے حد جوش تھا۔آلے کا ٹیسٹ ان کے سامنے بھی کامیاب رہا۔انھوں نے سبھی ورکرس اور اسٹاف کو شاباشی دی اور ساتھ ہی انھیں اعزاز دلانے کا بھی یقین دلایا۔ یہ واقعی میری زندگی کی ایک بڑی کامیابی تھی، جو میں نے اپنی اس نوکری میں حاصل کی۔تمام اندرونی مخالفت کے بیچ یہ کامیابی ایک روشنی کے مرکز کی طرح مجھے روشنی دے رہی تھی۔اپنی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے انھوں نے کہا:

''والمیکی! کل بورڈ کے ممبر آرہے ہیں۔کیا یہ ٹرائل ان کے سامنے رکھا جاسکتا ہے؟''

''کیوں نہیں سر! آپ بتائے،ہمیں کتنے بجے تیّار رہنا ہے۔''

''میں آپ کو فون پر بتادوں گا۔آپ لڑکوں کو تیار رکھنا۔''

''ٹھیک ہے سر!''میں نے انھیں یقین دلایا۔

اگلے روز ممبر سیدھے ورک شاپ میں آگئے۔ ہمارے ورکرس اور اسٹاف نے اس ٹرائل کو شاندار طریقے سے دکھایا۔آلے کے بارے میں تمام معلومات دکھائی گئی تھی۔ٹینک اور گن کے سسٹم کو یہ آلہ کس طریقے سے چلائے گا یہ ساری چیزیں وہاں دکھائی گئی تھیں۔ ہمارا ٹرائل ممبر کے سامنے کامیاب رہا۔ مکھیجا صاحب نے ممبر سی۔ پی اگروال سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان کی ہی ٹیم نے اس ناممکن کام کو ممکن کر دکھایا ہے۔پچھلے پانچ سال سے یہ کمپونٹ پڑے زنگ کھا رہے تھے مسٹر والمیکی نے انھیں نکال کر دوبارہ کام شروع کیا تو دیکھیے یہ سب ہوگیا۔ہمارے پانچ آلے مکمل ہیں۔

سی۔پی۔اگروال نے مجھے مبارکباد دیتے ہوئے کہا:

''اپنی ٹیم کا نام بورڈ میں بھیجو میں کوشش کروں گا ان سب کو اعزاز دیا جائے۔آپ اپنا نام بھی ساتھ میں بھیجنا۔''

میں نے کہا:''سر آپ کا شکریہ! اپنے اتنی حوصلہ افزائی کے لیے جو الفاظ ہمارے لیے کہے ہیں میں آج بھی ورکرس اور اسٹاف کا نام بھیج دیتا ہوں لیکن سر! مجھے ایوارڈ نہیں چاہیے۔''

اگروال جی میری طرف حیرت زدہ ہوتے ہوئے دیکھنے لگے: ''کیوں؟''

''سر! ایوارڈ کی جگہ مجھے ٹرانسفر چاہیے وہ بھی دہرادون۔'' میں نے موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

میں جانتا تھا اگر اگروال صاحب کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تو میرا ٹرانسفر ہو ہی جائے گا۔ مکھیجا صاحب نے بھی ان سے کہا:

''سر! یہ گھریلو وجوہات کی بنا پر تبادلہ چاہتے ہیں اگر کچھ ہوسکتا ہے تو آپ دیکھ لیجیے۔''

مکھیجا صاحب کا یہ مثبت پہلو دیکھ کر میں دل ہی دل میں ان کے لیے گدگد ہو گیا تھا۔

''آپ نے درخواست بھیجی ہے بورڈ کو۔'' اگروال صاحب نے پوچھا۔

''جی سر! بھیجی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اس کی ایک کاپی مجھے دیجیے۔'' انھوں نے کہا۔

میں نے درخواست کی ایک کاپی ان کو دے دی۔ ایک ہفتہ بعد ہی میرا تبادلہ دہرادون ہو گیا۔ اتنی تیز کاروائی کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا لیکن ابھی کافی اڑچنیں باقی تھیں جن کو پار کرنا تھا۔ میرے اور مکھیجا صاحب کے درمیان ایک اور باس تھے بھرت سنگھ جی جو ایک ڈائنمک افسر مانے جاتے تھے۔ میرے تبادلے کا آرڈر مارچ کے آخر میں آیا جس کی بھنک بھرت سنگھ جی کو نہیں لگی تھی لیکن فروری کے شروعات میں میں نے ایک روز بھرت سنگھ جی سے کہا تھا:

''سر میں تبادلے کی کوشش میں لگا ہوں کبھی بھی میرے لیے بورڈ کا آڈر آسکتا ہے۔ اس لیے آپ کو پہلے سے باخبر کر رہا ہوں، تاکہ آپ میری جگہ پر کسی دوسرے آفسر کو لانے کی کوشش کیجیے تاکہ آڈر آتے ہی آپ مجھے جانے دیں۔''

بھرت سنگھ میرا منہ دیکھتے رہے۔ انھوں نے مجھے اوپر سے نیچے تک کچھ اس

انداز میں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں ''اچھا! ٹرانسفر کے خواب دیکھ رہے ہو وہ بھی جی۔سی۔ایف میں سے، عجیب سا چہرہ بنا کر بولے:

''ٹرانسفر! اتنا آسان ہے۔ایسے کیسے چلے جاؤ گے، بھول جاؤ ٹرانسفر کے بارے میں، جاؤ اپنا کام دیکھو۔دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔''

پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر جانے کے لیے کچھ اس طرح مڑے جیسے انھوں نے کوئی قلع فتح کرلیا ہو۔ایک بارگی تو لگا کہ اب میں پھنس چکا ہوں اب یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔میرے تبادلے کو لے کر جھنجھٹ پیدا کریں گے یہ اشارہ انھوں نے دے دیا تھا۔کچھ دیر تو میں اسی جگہ پر کھڑا سوچتا رہا کہ اس حاکمانہ افسر سے کیسے چھٹکارا پایا جائے۔اسی اُدھیڑ بن میں میں اپنے آفس میں آکر بیٹھ گیا اس وقت میرے دماغ میں صرف بھرت سنگھ گھوم رہا تھا۔اگلے روز باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اس کے ماتحت تین چار افسروں کے تبادلے بورڈ سے منظور ہوکر آ چکے تھے اور ان کو بھرت سنگھ خارج کر چکے تھے یعنی اس بار میرا نمبر بھی ہوسکتا ہے۔

تبادلے کی خبر میرے ایک افسر دوست نے رات ہی میں دے دی تھی جو ان دنوں بورڈ میں ہی پوسٹیٹ تھا۔چندا کے لیے یہ ایک بڑی خبر تھی۔صبح ہوتے ہی جب میں ڈیوٹی پر پہنچا تو پہلے ایم۔ڈی کے آفس میں جا کر پتہ کیا، پی۔اے مجھے دیکھتے ہی چونکا۔

''کیا بات ہے! مطلب ہم سے پہلے آپ کو خبر مل گئی ہے۔''

ان کے اس جملہ سے میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ آڈر آچکا ہے پھر بھی میں نے پکّا کرنے کے لیے پی۔اے سے پوچھا:

''اس کا مطلب میرا تبادلہ ہوگیا ہے۔''

''ہاں ہوگیا ہے لیکن تمہیں بھرت سنگھ جانے نہیں دیں گے۔''

اس نے اپنے دل کی بات کہہ دی، شاید اسے بھی بھرت سنگھ کے رویّہ کا اندازہ

تھا، اسی نے مجھے بتایا کہ اس کے ماتحت کسی بھی افسر یا اسٹاف کا ٹرانسفر آیا لیکن اس نے انھیں جانے نہیں دیا۔ آخر تبادلے کا اڈر لانگ رن میں کینسل ہو جاتا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ بھرت سنگھ کوئی نہ کوئی پنگا ضرور کرے گا۔ میں نے مکھیجا صاحب سے بات کرنے کی ٹھانی، مجھے امید تھی کہ مکھیجا صاحب میری مدد ضرور کریں گے۔ آفس سے سیدھا میں اپنے ورک شاپ میں آگیا اور مکھیجا صاحب کے آنے کا انتظار کرنے لگا، وہ اپنے وقت پر آئے۔ آتے ہی انھوں نے مجھے مبارک باد دی اور گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ میں نے پہلے ان کا شکریہ ادا کیا پھر میں نے کہا:

''لیکن سر! تبادلہ تو ہو گیا ہے پر بہت بڑی مشکل ہے اسے بھی آپ ہی دور کریں گے۔''

انھوں نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا:

''سر! بھرت سنگھ جی رکاوٹ ڈال سکتے ہیں آپ ہی کچھ کر پائیں گے۔''

''جی۔ ایم سے بات کریں گے، ڈونٹ وری، یہاں تک ہوا ہے تو آگے بھی ہو جائے گا۔ تم ایک بار بھرت سنگھ سے مل کر بات کرو، ہو سکتا ہے تمہارے متعلق ان کی رائے بدلی ہو۔ اس سال تو پروڈکشن کا کام بھی وقت سے پہلے ہی مکمل ہو گیا ہے۔'' مکھیجا صاحب نے امید بندھائی۔

اگلے روز مین بھرت سنگھ سے بات کرنے کی غرض سے ان کے کیبن میں گیا۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔

''بتاؤ کیا بات ہے؟'' بھرت سنگھ نے سیدھے سیدھے سوال کیا۔

''سر! میرے تبادلے کا آڈر آگیا ہے۔ اگر آپ مجھے جلدی جانے کی اجازت دیں گے تو میرے لیے آسان ہوگا۔'' میں نے بنا کسی تمہید کے سیدھے سیدھے بات کی۔

''مسٹر والمیکی! میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ آپ کو چھوڑنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ ایک سال اور رکو میں آپ کا ٹرانسفر جہاں کہو گے

کرادوں گا، لیکن میں ابھی آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔''

بھرت سنگھ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ لمحہ بھر تو میں خاموشی سے سوچتا رہا لیکن جلدی ہی ان کے بنائے ہوئے جھانسے سے باہر آ کر میں نے پوچھا:

''اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''مجھے فیکٹری بند نہیں کرنی ہے۔ بہتر ہوگا آپ اس فیکٹری کی بھلائی میں دہرادون جانے کا خیال دل سے نکال دیں۔'' بھرت سنگھ نے صاف لفظوں میں کہا۔

''اس کا یہ بھی تو مطلب نکلتا ہے کی میرے آنے سے پہلے کیا یہاں کام نہیں ہو رہا تھا، یعنی یہ فیکٹری بند پڑی تھی یا کل آپ کا تبادلہ کسی دوسری فیکٹری میں ہو جاتا ہے تو یہ فیکٹری بند ہو جائے گی؟'' میں نے دلیل دینے کی کوشش کی۔

''مجھے یہ سب سننے کی عادت نہیں ہے اپ جو چاہے سمجھیں میں آپ کو یہاں سے جانے دینے کا حامی نہیں ہوں۔'' بھرت سنگھ نے صاف صاف کہا۔

''ٹھیک ہے سر! اگر آپ کو میری ذاتی مشکلات سے کوئی لینا دینا نہیں ہے تو مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے طریقے سے اپنی گھریلو پریشانیوں کو سلجھانے کی کوشش کروں گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ سے کوئی امید رکھنا غلط ہے۔ اب آگے سے میں بھی اپنے طریقے سے کام کروں گا۔ اگر ایمانداری اور لگن سے کام کرنے کا یہ نتیجہ ملتا ہے تو ٹھیک ہے آپ کی مرضی۔ اب میں آپ کے پاس گزارش کرنے نہیں آؤں گا، شکریہ سر!'' کہتے ہوئے میں اٹھ کر چلا آیا۔

اس وقت غصہ سے میری کنپٹیاں پھٹنے کو تھیں لیکن کسی طرح میں نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ بھرت سنگھ نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ کوئی ان سے اس طرح بھی بات

کر سکتا ہے۔ کیوں کہ ان کا طور طریقہ راجستھانی حاکموں جیسا تھا جو اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ سب سے پہلے میں نے ان کو پروڈکشن رپورٹ دینی بند کر دی۔ دوسرا یہ کہ جب بھی وہ ورک شاپ میں آتے میں کسی نہ کسی بہانے ورک شاپ سے باہر نکل جاتا۔ ایک ہفتے بعد تک یہ سب چلتا رہا۔ ایک دن ان کے پی۔ اے کا فون آیا:

''صاحب بلا رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے فرصت ملتے ہی آؤں گا۔''

میں نے پی۔ اے کو ٹال دیا۔ اگلے روز فیکٹری کے گیٹ سے وہ میری ورک شاپ میں آ گئے۔ آتے ہی سیدھے سوال کیا:

''کب جانا چاہتے ہو؟''

''ابھی اسی وقت۔'' میں نے بھی سوال کا جواب دیا۔

''اتنی جلدی کیوں؟'' بھرت سنگھ نے سوال کیا۔

''اب یہاں کام کرنے کا دل نہیں ہے۔'' میں نے بات کو چباتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے پی۔ اے سے کہہ کر خط بنوالو، میں دستخط کر دوں گا۔''

کہتے ہوئے وہ ورک شاپ سے باہر چلے گئے۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنے آپ کو تسلی دی کہ چلو اس حاکم سے بھی چھٹکارا ملا۔ اور اسی ہفتہ سنیچر کی ٹرین ''گوڑوانا ایکسپریس'' میں اسنگھ گھوش جی نے وی آئی پی کوٹے سے دو ٹکٹ بک کرا دیئے تھے۔

دہرادون

او۔ ایل۔ ایف دہرادون میں میں نے ۲۹/اپریل ۲۰۰۱ کو اپنی ڈیوٹی جوائن کی، اس وقت او۔ ایل۔ ایف میں وائس مینیجنگ ڈائرکٹر کے عہدے پر شوبابو مشرا تھے۔ ادب سے دلچسپی رکھنے والے افسر تھے۔ اس وقت تک ان کی دو کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ جبل پور میں رہتے ہوئے ان سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ میرے آنے کی خبر ان کو پہلے ہی مل چکی تھی۔ ان کے وہاں ہونے سے مجھے بھی بے حد خوشی تھی۔ اسی

دن میرے لیے ایک اچھے سرکاری مکان کا انتظام کرنے میں انھوں نے اہم رول ادا کیا تھا۔نوکری سے دست بردار ہونے تک ہم اسی گھر میں رہے۔

میری پوسٹنگ شعبۂ پلاننگ میں ہوئی تھی جس کے گروپ افسر راجیو گپتا جی تھے جن کے ساتھ تال میل بٹھانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔میں پہلے بھی لمبے عرصہ تک او۔ایل۔ایف میں رہ چکا تھا اس لیے میں زیادہ تر اسٹاف اور ورکرس کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔

پلاننگ میں میرے آنے سے اسٹاف میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کو میری موجودگی کھل رہی تھی لیکن میں نے بنا کسی ردِ عمل کے اپنا کام شروع کیا۔جب تک راجیو گپتا جی صدرِ شعبہ رہے تب تک سب ٹھیک تھا،لیکن ان کا تبادلہ ہو جانے کی وجہ سے ان کی جگہ امت مہتا آ گئے۔پہلے ہی دن سے میرے لیے ان کا برتاؤ بے حد روکھا اور نا قابل برداشت تھا۔وہ ظاہری طور پر تو کچھ نہیں کہتے تھے لیکن انھوں نے مجھے اتنا احساس ضرور دلایا کہ وہ دلت طبقہ سے تعلّق رکھنے والے افسر کو اپنے ساتھ بیٹھا دیکھنے کے عادی نہیں ہیں۔ان حالات کو دیکھ کر بھی میں خاموش تھا کیونکہ میں اپنی طرف سے کسی طرح کی پہل نہیں کرنا چاہتا تھا۔جی۔سی۔ایف میں میں نے جس طرح مسٹر واشنئے کے مکر کو بھڑ کے بغیر ہی برداشت کیا تھا ویسی ہی حالت یہاں بھی بنی ہوئی تھی۔میں چاہتا تھا کہ وہ میری ذات سے میری اہمیت کا اندازہ نہ لگائے بلکہ مجھے کام کرنے کا موقع دیں۔اگر میں کھرا نہیں اترتا ہوں تو پھر وہ جو چاہے کریں لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا تھا۔اکثر وبیشتر افسران کی ذات کے بارے میں پہلے سے ہی رائے بنی ہوئی تھی۔ان میں سے امت مہتا بھی ایک تھے۔

شیو بابو سے تو اکثر روزانہ ہی ملاقات ہوا کرتی۔سرکاری کام کے ساتھ ساتھ ادبی گفتگو بھی ہوا کرتی۔ان کا میرے ساتھ سلوک نرم اور غیر رسمی تھا۔میں ان کے مقابلے میں ادنیٰ عہدے پر تھا لیکن انھوں نے کبھی بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ مجھ سے بڑے افسر ہیں۔وہ مجھے نام سے ہی بلایا کرتے بلکہ ''بھیا جی'' کہہ کر بلاتے تھے۔کچھ افسر ایسے بھی تھے جن کو یہ سب ٹھیک نہیں لگتا تھا،لیکن شیو بابو مشرا نے کبھی ان

افسروں کی بات کی پرواہ نہیں کی۔ آفیشیل اجلاس میں بھی وہ مجھے بھیا جی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ آرڈیننس فیکٹری کی تاریخ میں شاید یہ ایک ہی مثال ہوگی جو ایک بڑا افسر اپنے سے نیچے کے افسر کو بھیا جی کہہ کر مخاطب کرے، یہی وجہ تھی کہ شیو بابو مشرا بہت جلد میری فیملی میں ایک بڑے فرد کی حیثیت سے حصّہ بن گئے تھے۔ چندا ان پر بے حد یقین کرتی تھی۔ گھر کی چھوٹی چھوٹی مشکلات میں چندا کے لیے شیو بابو مشرا کی رائے پتھر کی لکیر ہوا کرتی تھی۔

سنجے خیروال کافی جدوجہد کر چکا تھا لیکن ٹھیک سے کہیں بھی پیر نہیں جما۔ ممبئی، لدھیانہ وغیرہ جگہوں کی خاک چھان کر واپس دہرادون آگیا۔ ممبئی میں وہ کافی عرصہ رہا لیکن اس کو کوئی ڈھنگ کی فلم نہیں ملی۔ دہرادون آکر اس نے سیریل بنائے تھے۔ ادھر اُدھر کافی ہاتھ پیر مارے لیکن زندگی کو صحیح ڈھنگ سے چلانے کے لیے جو کامیابی ملنی چاہیے وہ اسے نہیں مل پا رہی تھی۔ اس کے بابا اور ماں بہت پریشان تھے۔ اس وقت تک شادی بھی نہیں ہوئی تھی یہ بھی ان دونوں کی فکر کا سبب تھا۔ ایک دن وملا بھابھی نے میرے سامنے پریشانی رکھی کی تم سمجھاؤ کی شادی تو کر لے۔ ان کا وہ اکلوتا بیٹا تھا۔ بڑی بیٹی منجو کی شادی وہ کافی پہلے کر چکے تھے۔ میں نے ان کو امید دلائی کہ میں سنجے سے بات کروں گا۔ میں نے یہ کام چندا کے ذمہ کیا کہ وہ پتہ کرے کہ وہ آخر چاہتا کیا ہے۔

چندا نے اس سے بات کی تو پتہ چلا کہ وہ شادی تو کرنا چاہتا ہے مگر اس کا کام کہیں جم نہیں پا رہا اس لیے وہ انا کانی کر رہا ہے۔ آخر میں اس نے ہاں کر ہی دی۔ میری نظر میں ایک لڑکی تھی بات ہوئی تو ایک مہینے کے اندر اندر شادی ہوگئی۔ شادی کے تین دن بعد ہی میرا اور چندا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ ہم اسکوٹر سے جا رہے تھے سائڈ سے آتے وکرم نے ہمیں ٹکر مار دی مجھے تو زیادہ چوٹ نہیں آئی لیکن چندا کو ہاتھ اور ریڑ کی ہڈی میں کافی چوٹ لگی۔ ہاتھ پر پلاسٹر چڑھایا گیا۔ اس وقت شیو بابو شرما اور سبھاش چندر کشواہا نے مجھے کافی حوصلہ دیا تھا۔ سبھاش چندر کشواہا ان دنوں دہرادون

میں آر۔ ٹی۔ او کے عہدے پر تھے۔ وہ وقت میری زندگی کا مشکل دور تھا لیکن ان دنوں نے مجھے برے وقت نکالنے میں جو طاقت دی وہ میرے لیے کسی کامیابی سے کم نہیں ہے۔

سرکاری گھر سی ۲۔۵ کے آس پاس رہنے والے لوگوں نے ہر طرح سے ہماری مدد کی۔ سامنے راجیندر پرساد جموولا رہتے تھے۔ ان کی بیوی پریتما نے جس طرح چندا کی دیکھ بھال کی وہ میرے لیے کسی سوغات سے کم نہیں ہے۔ مہیش نے پورے ایک ہفتہ تک اپنی بیوی پنکی کو چندا کی دیکھ بھال کے لیے ہمارے پاس چھوڑا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا سہارا تھا۔ وجیندر مسلسل ہری دوار اور مراد آباد سے آتا رہتا تھا۔ جس روز چندا کے ہاتھ سے پلاسٹر کٹا تو بہت راحت ملی تھی لیکن جیسے بلائیں دروازے پر کھڑی ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ ہری دوار سے ایک رشتہ دار کی موت کی خبر ملی۔ میں وہاں جانے کے لیے جب گھر سے نکلا تو اس وقت تک چندا کی طبیعت ٹھیک تھی لیکن جیسے ہی میں ہری دوار سے دہرادون آنے کے لیے بس میں بیٹھا، جموولا کی بیوی کا فون آیا:

''بھائی صاحب آپ اس وقت کہاں ہیں۔''

میں نے جواب دیا۔

''ہری دوار سے دہرادون آنے کے لیے بس میں بیٹھ چکا ہوں۔''

''ٹھیک ہے کہیں رُکنا مت سیدھے گھر آیئے۔'' جموولا کی بیوی نے کہا۔

''کیا بات ہے؟ سب ٹھیک تو ہے؟'' میری فکر بڑھ رہی تھی۔

''چندا بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے انھیں اسپتال لے کر آئیں ہیں۔''

جموولا کی بیوی نے کہا۔

''ہوا کیا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''آپ فکر نہ کریں، سب ٹھیک ہے... بس سیدھے اسپتال ہی آجانا ہم سب وہیں ہیں۔'' جموولا کی بیوی نے کہا۔

میرے لیے دہرادون کا راستہ کئی گنا لمبا ہو گیا تھا جو کاٹے ہی نہیں کٹ رہا تھا۔

طرح طرح کے خیالات دل میں آرہے تھے یہ سمجھ نہیں آرہا تھا کی اچانک کیا ہو گیا جو اسپتال لے جانا پڑا۔ جیسے ہی بس دہرادون میں داخل ہوئی۔ شیو بابو مشرا کا فون آیا:

''بھیا جی! کہاں پہنچے ہو؟''

''دہرادون پہنچ چکا ہوں۔ آپ کہاں ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''فکر مت کرو آرام سے آؤ ہم سب اسپتال میں ہیں۔ چندا میم ٹھیک ہیں بس تھوڑا گھبرائی ہوئی ہیں کسی بھی طرح کی جلد بازی مت کرنا ہم لوگ یہاں ہیں۔'' شیو بابو مشرا نے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

میں بس سے پرنس چوک پر ہی اتر گیا۔ وہاں سے تھری ویلر پکڑ کر اسپتال پہنچا۔ دیکھا تو بھیڑ لگی ہوئی ہے میں بری طرح گھبرا گیا کہ اتنے لوگ وہاں کیوں ہیں وہ بھی میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کئی لوگ ایک ساتھ کہہ رہے تھے ''والمیکی جی آگئے ہیں'' برآمدے میں شیو بابو مشرا کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے:

''آگئے، چلو اندر چلو پہلے۔''

وہ مجھے چندا کے پاس لے گئے، دیکھا تو وہاں دو ڈاکٹر کھڑے ہیں اور چندا کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ آپ کو کچھ نہیں ہوا ہے آپ گھبرا رہی ہیں اطمینان رکھیے لیکن چندا انھیں سمجھانے کی کوشش میں لگی تھی کہ اسے کیا ہوا۔ ڈاکٹر پریشان تھے انھیں کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ مجھے دیکھتے ہی چندا خاموش تو ہو گئی مگر پریشانی کم نہیں ہوئی۔

میں نے چندا سے پوچھا: ''کیا ہوا ہے؟''

''کمر سے اوپر والا حصہ کام نہیں کر رہا ہے میں اٹھ نہیں سکتی۔ مجھے یہاں سے کہیں اور لے چلو ان سرکاری ڈاکٹروں کو کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے... کچھ تو کرو... میری حالت ٹھیک نہیں ہے۔''

''تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاؤ میں ڈاکٹر سے بات کر کے پھر تمھیں کسی دوسرے اسپتال میں لے کر چلتا ہوں۔''

جیسے ہی میں ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے باہر جانے لگا چندا زور سے چلائی۔
''مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''
''ٹھیک ہے میں کہیں نہیں جا رہا ہوں لیکن ڈاکٹر سے تو بات کرنی ہوگی'' میں نے چندا کو سمجھانے کی کوشش کی۔
''مشرا بھائی صاحب کو بولو جو بھی بات کرنی ہے وہ کرلیں گے، تم یہیں رہو میرے پاس۔'' وہ بولی۔
عجیب حالت تھی، میں نے مشرا جی سے کہا:
''ڈاکٹر کو یہیں بلا لیجیے... آخر انھیں ہوا کیا ہے؟''
شیو بابو مشرا ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے۔ اتنی دیر میں جُھمو لا جی کی بیوی اندر آئی۔ ان کے چہرے پر بھی فکرمندی جھلک رہی تھی انھوں نے کہا:
''بھائی صاحب آپ کسی بڑے ڈاکٹر سے بات کرو۔ ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے سرکاری اسپتال کے بھروسے مت رہو۔''
''ہاں میں بھی انھیں کسی بڑے اسپتال لے کر جاؤں گا... آپ بے فکر رہیں۔'' میں نے انھیں اطمینان دلایا۔
شیو بابو مشرا ڈاکٹر کو ساتھ لے کر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے:
''مسٹر والمیکی یہ ٹھیک ہیں صبح تک نارمل ہو جائیں گی۔ ان کے ساتھ آج جو ہوا ہے اس سے یہ گھبرا گئیں ہیں۔ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں آج رات انھیں یہاں آرام کرنے دیجیے! میں نے دوائی لکھ دی ہے ایک دو خوراک سے ہی انھیں آرام محسوس ہوگا۔''
مجھے لگا ڈاکٹر زیادہ سنجیدگی سے نہیں لے رہا ہے۔ ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد میں نے مشرا جی سے کہا:
''ان کی طبیعت واقعی زیادہ خراب ہے لیکن ڈاکٹر کا جس طرح سے کہنا ہے، مجھے نہیں لگتا کی انھوں نے کچھ خاص دوائی لکھی ہوگی۔ کہیں نیند کی

دوا تو نہیں لکھ دی؟''

ڈاکٹر کی پرچی دیکھ کر شیو بابو مشرا بھی میری بات سے متفق تھے۔ میں نے اپنے جان پہچان کے ڈاکٹر او۔ پی۔ شری واستو سے فون پر بات کی اور انھیں چندا کی تکلیف کے اثرات بتائے۔ میری بات سنتے ہی وہ بولے:

''یہ تو لگتا ہے اسپونڈیلائٹیز کا دورہ ہے۔ ایسا کرو انھیں یہ دو ٹیبلیٹ دے دو کسی کو بھیج کر منگا لو۔ اگر وہ ہل ڈل سکتی ہیں تو دون اسپتال لے کر آ جاؤ میں وہیں مل جاؤں گا نہیں تو صبح لے کر آ جانا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

وہ رات بہت پریشانی میں گذری۔؟ اس وقت وجے گوڑ اور رام بھرت رام رات بھر میرے ساتھ اسپتال میں رہے۔ صبح شیو بابو مشرا بھی آ گئے۔ میں نے ان سے کہا:

''میں انھیں لے کر سی۔ ایم۔ آئی جا رہا ہوں۔ راجیندر گپتا سے میری بات ہو گئی ہے۔ اس نے ڈاکٹر کڑیال سے بات کی ہے راجیندر گپتا ہمیں وہیں ملیں گے۔''

شیو بابو مشرا نے گاڑی کا انتظام کر دیا تھا اور ہم لوگ سی۔ ایم۔ آئی کے لیے روانہ ہو گئے۔ آرڈیننس فیکٹری کے ڈاکٹر میرے اس فیصلے سے ناراض تھے۔ انھوں نے اپنے رجسٹر میں صاف صاف لکھا تھا کہ مسٹر والمیکی اپنی بیوی کو اپنے رسک پر بنا کسی ڈاکٹر کی صلاح کے لے جا رہے ہیں کچھ بھی غلط ہونے پر مسٹر والمیکی ذمہ دار ہوں گے۔ میرے اس فیصلے میں شیو بابو مشرا کی رضامندی شامل تھی۔ سی۔ ایم۔ آئی میں راجیندر گپتا جی باہر ہی مل گئے وہاں کی تمام فارمیلٹیز شیو بابو مشرا نے ادا کی۔ ڈاکٹر کڑیال نے چندا سے بات کی پھر مجھ سے سوالات کیے۔ انھوں نے چندا کو بھرتی کرنے کے لیے کہا تب تک وہ چندا کو ایک انجکشن دے چکے تھے جس سے چندا کو آرام ملا۔ ڈاکٹر کڑیال نے کہا:

''دو چار دن میں نارمل ہو جائے گی لیکن انھیں اکیلا مت چھوڑیے۔ یہ بے حد ڈر گئی ہیں باقی گھبرانے والی کوئی بات نہیں ہے۔''

چندا نے اس روز کا واقعہ جب مجھے تفصیل سے سنایا تو لمحہ بھر کو تو میں بھی سکتے میں آ گیا تھا۔ چندا نے بتایا دوپہر کو وہ لیٹ کر ٹی۔ وی دیکھ رہی تھی ۳ ربجے فراغت کے لیے جب وہ اٹھنے لگی تو اس سے اٹھا نہیں گیا کئی بار کوشش کرنے کے بعد بھی نہیں اٹھا گیا تو وہ گھبرا گئی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے؟ باہر کا دروازہ بند تھا کسی کے آنے کا امکان بھی نہیں تھا۔ میں ہری دوار گیا ہوا تھا۔ اوپر منزل پر اندر مڑی رہتے تھے ان کی بیوی بچّوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کالونی میں یہ وہ وقت ہوتا جب زیادہ تر لوگ اپنی ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ گھروں میں صرف گھریلو عورتیں اور بچّے ہی ہوتے ہیں۔

بستر پر گھسٹتے ہوئے کسی طرح کھڑکی کی طرف پلنگ پر آئی تا کہ کھڑکی سے کسی کو آواز لگا سکے۔ اسے یہ تو احساس ہو گیا تھا کہ اس کے جسم کا اوپری حصہ کام نہیں کر رہا ہے۔ دماغ اس وقت بھی ٹھیک سے کام کر رہا تھا کہ باہر کا دروازہ بند ہونے کی وجہ سے کوئی مدد کے لیے نہیں آ سکتا۔ کھڑکی کی طرف آتے ہی چندا نے زور زور سے چلاّنا شروع کیا:

''پرشانت کی ممّی جلدی آؤ میں مر رہی ہوں، مجھے بچاؤ۔''

کئی دفعہ آواز دینے کے بعد پرشانت نے آواز سن لی تھی۔

''ممّی لگتا ہے چندا آنٹی آپ کو آواز دے رہی ہیں۔''

چندا پھر سے چلاّئی۔ اس بار پرشانت کی ممّی منا کشی نے ان کی آواز سن لی۔ وہ جلدی سے نیچے آئیں۔ دیکھا دروازہ بند ہے باہر سے آواز دی:

''چندا بھابھی جی! کیا ہوا ہے۔''

''منا کشی! جلدی کرو میں مر رہی ہوں۔''

منا کشی نے دروازہ پیٹنا شروع کیا لیکن دروازہ تو اندر سے بند تھا منا کشی زور زور سے رونے لگی جس کو سن کر آس پڑوس کی عورتیں جمع ہو گئیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ کسی کا دھیان گیا کہ:

''ارے! ہوسکتا ہے بالکنی کا دروازہ کھلا ہو۔''

دوسری نے کہا: ''بالکنی پر چڑھیں گے کیسے؟''

تیسری نے رائے دی: ''آس پڑوس اگر کوئی بڑا بچّہ ہو اس کو دیکھو۔ کسی طرح اسے بالکنی میں چڑھانے کی کوشش کریں گے۔''

آس پڑوس کی تمام عورتوں کے اتحاد سے راستہ نکل آیا۔ اسی دوران سامنے والے جھمولا کا چھوٹا بیٹا روہت اسکول سے آ گیا۔ اس نے بالکنی میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ ایک عورت نے کہا کہ کسی کے پاس سیڑھی یا کوئی چارپائی ہو اس سے اوپر چڑھا جا سکتا ہے۔ سیڑھی تو نہیں ملی رسّی والی چارپائی مل گئی جس پر چڑھ کر روہت بالکنی پر چڑھ گیا۔ جیسے ہی وہ بالکنی میں پہنچا اور اس نے دروازے پر ہاتھ لگایا تو دروازہ کھلا ہوا تھا وہ زور سے چلاّیا: ''دروازہ کھلا ہے۔''

ساری عورتیں ایک ساتھ چلاّئیں: ''باہر کا دروازہ کھولو۔''

روہت پہلے آنٹی کو دیکھنے گیا۔ ''آنٹی آپ گھبراؤ مت دروازہ کھول رہا ہوں۔'' اور اس نے باہر کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی ساری عورتیں اندر آ گئیں چندا کو دیکھتے ہی بولیں: ''کیا ہوا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم میں اٹھ نہیں پا رہی ہوں، روہت کی ممّی پہلے مجھے فراغت کراؤ۔''

عورتوں نے چندا کو اٹھا کر لے جانے کی کوشش کی مگر وہ چندا کو کسی بھی طرح اٹھا نہیں پا رہی تھیں۔ روہت کی ممّی نے کہا:

''رکو! میں کوئی بڑا برتن لاتی ہوں۔''

فراغت کی مشکل کے بعد اب کیا کرنا ہے اس کے لیے وہ سب فکرمند تھیں۔

ایک نے کہا:

''والمیکی بھائی صاحب کو خبر کرو۔''

روہت کی ممّی نے کہا:

''وہ تو باہر گئے ہوئے ہیں۔ ہری دوار میں کسی رشتہ داری میں کوئی گزر گیا ہے شام تک واپس ہوں گے تب تک ہم لوگ انھیں اسپتال لے کر چلتے ہیں۔کوئی اسپتال میں فون کر کے ایمبولنس بلاو۔''

ایمبولنس تو آگئی مگر اس کے ساتھ اسپتال کا کوئی بھی کارکن نہیں تھا جو اسٹریچر پر لٹا کر انھیں پہلی منزل سے نیچے اتار سکے۔تب عورتوں نے ہمّت دکھائی اور مل جل کر کافی مشقت کے بعد ایمبولنس تک اتارا اور انھیں لے کر اسپتال گئیں۔اس واقعہ کی خبر جب فیکٹری میں پہنچی تو لوگ اسپتال پہنچے کسی نے شیو بابو مشرا کو بھی خبر کر دی۔ اسپتال میں لوگوں کا جھمگھٹا لگ گیا تھا۔

جب مجھے یہ سب معلوم ہوا کہ عورتوں نے کس حوصلے اور سمجھداری سے چندا کی مدد کی ہے سچ کہتا ہوں میرا دل بھر آیا تھا۔میری غیر موجودگی میں جس طرح انھوں نے میری بیوی کو ایسی مشکل حالات سے نکال کر اسپتال پہنچایا۔ان کا میرے اوپر بہت بڑا احسان ہے۔عورتوں کے ایسے حوصلے کو میں سلام کرتا ہوں ساتھ ہی ساری زندگی ان کا احسان مند رہوں گا جنھوں نے میری بیوی کو حوصلہ دیا۔میری زندگی کا یہ بہت بڑا واقعہ تھا ایسے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن برے وقت کو اچھے میں بدلنے کا جو حوصلہ عورتوں نے دکھایا وہ بہت بڑا کام تھا۔اس روز مجھے لگا کہ معمولی دکھنے والے لوگوں کے درمیان رہنے کا میرا فیصلہ کتنا صحیح تھا۔اگر یہی حادثہ سرکاری کالونی میں ہو جاتا تو کسی کو بھی خبر نہیں ہوتی اور چندا کے ساتھ کچھ بھی غیر متوقع ہو سکتا تھا۔

۵ر دن بعد چندا نے ڈاکٹر کڑیال سے کہا:

''ڈاکٹر صاحب! مجھے گھر جانا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب بولے:

''ٹھیک ہے ضرور جاؤ گی لیکن ایک شرط ہے اپنے بیڈ سے اٹھ کر جب میرے آفس تک بنا کسی سہارے کے چل کر جاؤ گی تبھی میں آپ کو گھر جانے کی اجازت دے سکتا ہوں۔''

اگلے ہی دن چندا نے اسپتال کی برآمدے میں آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا لیکن میں وہاں سے ایک منٹ کے لیے بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔ اس حادثہ سے چندا کے دل میں دہشت بیٹھ گئی تھی۔ میں ذرا بھی ادھر اُدھر ہوتا تو چندا گھبرا جاتی تھی۔ اس وقت میرے لیے آفس جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ میرے ان حالات سے امت مہتا کو ایک موقع مل گیا انھوں نے ایم۔ڈی کو میرے حالات نہ بتا کر میری شکایت درج کر دی کہ مسٹر والمیکی لمبے عرصے سے ڈیوٹی پر نہیں آ رہے ہیں جب کہ میں نے چھٹی کے لیے باقاعدہ درخواست دے رکھی تھی جس میں صاف طور سے لکھا ہوا تھا کہ میری بیوی کی طبیعت خراب ہے وہ اسپتال میں داخل ہیں، اس کے باوجود امت مہتا نے حقیقت کو چھپا کر میری شکایت مینیجنگ ڈائریکٹر سے کر دی اور یہ بھی کہا کہ مجھے والمیکی نہیں چاہیے۔ میں ان کے بغیر اپنا شعبہ چلا سکتا ہوں بہتر ہوگا انھیں کہیں اور پوسٹ کرا دیں۔ جس لہجے میں امت مہتا نے یہ باتیں کہیں تھیں وہ بہت غلط تھا۔ اتفاق سے اس وقت شیو بابو مشرا بھی وہیں موجود تھے۔ انھیں کے ذریعہ مجھے یہ سب معلوم ہو سکا۔

ایم۔ڈی نے میرا ٹرانسفر یارڈ محکمہ میں کر دیا تھا جہاں صفائی کرنے والوں اور لیبرس وغیرہ کو دیکھنا تھا۔ لوگوں کی ایسی سوچ تھی کہ اس محکمہ میں نکمّے لوگوں کا ہی ٹرانسفر کیا جاتا ہے۔ یعنی مجھے بھی نکمّے لوگوں کی فہرست میں شامل کرنے میں امت مہتا کامیاب ہو گئے تھے اس شعبہ کے افسر شیو بابو مشرا تھے انھوں نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا:

''بھیا جی! آپ اسے دل سے نہ لگائیں اسی میں سے راستہ نکلے گا اور امت مہتا غلط ثابت ہوں گے۔''

میرا ٹرانسفر پوری فیکٹری میں چرچا کا موضوع بن گیا تھا یہاں تک کہ یونین نے بھی ایم۔ڈی کے اس فیصلے پر اعتراض کیا تھا لیکن میں نے بغیر کسی مخالفت کے اس محکمہ کی ذمہ داری سنبھال لی۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا ردّ عمل اس ٹرانسفر پر کچھ ایسے لفظوں میں سنائی دیا: 'جس لائق تھے وہیں پہنچا دیا۔' یعنی اس شعبہ میں جو فیکٹری

کی صاف صفائی کرتا ہے۔ ان ردّعمل سے میں نے خود کو پرسکون رکھا۔ میں جانتا تھا یہ جو کچھ ہوا ہے اس کے پیچھے میرا نام ہے جو بیچ بیچ میں میری اوقات بتاتا رہتا ہے لیکن ان حالات سے نکلنا مجھے آ گیا تھا۔ اس لیے میں نے سیدھے سیدھے ٹکراؤ کے بجائے دوسرا راستہ اپنایا۔

ہندوستانی اعلیٰ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، صدر ہاؤس، شملہ کا خط مجھے دسمبر میں ملا جس میں ۶ رمہینے کے اندر ہی انسٹی ٹیوٹ کو رپورٹ بھیجنی تھی۔ اس سے پہلے بھی ۲۰۱۰ء میں ایسا ایک خط آ چکا تھا لیکن نوکری سے دست برداری کے بعد اپنا گھر نہ ہونے کی بڑی مشکل میرے سامنے کھڑی تھی۔ سرکاری مکان میں زیادہ سے زیادہ چھ مہینے اور رہ سکتے تھے اس کے بعد بھی مسئلہ سنگین تھا۔ کافی تلاش کے بعد بھی پسندیدہ مکان نہیں مل رہا تھا۔ کہیں قیمت بہت زیادہ تھی تو کہیں جگہ پسند نہیں آ رہی تھی۔ جب تک ٹھور ٹھکانہ نہ ہو جائے تب تک کہیں جانا ممکن نہیں تھا۔ سرکاری مکان میں رہنے کے اپنے ہی حدود تھے کبھی بھی گھر خالی کرنے کا آڈر آ سکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح کا آڈر مجھے ایک سال تک نہیں دیا گیا۔ میں نے انسٹی ٹیوٹ سے زیادہ وقت مانگا تھا لیکن اس کے بھی اپنے کچھ اصول اور قاعدے قانون تھے۔ مجھے دوبارہ درخواست دینے کے لیے کہا گیا اور اس کی منظوری بھی مل گئی تھی۔

کافی بھاگ دوڑ کے بعد مکان مل گیا۔ ۳۰ رجون ۲۰۱۱ء کو ہمارے مکان کی رجسٹری ہوئی۔ مکان کی منظوری ملتے ہی ہم نے اس میں رنگ وروغن اور دوسرے کاموں کو شروع کروا دیا۔ اگست ۲۰۱۱ء میں ہم اپنے نئے مکان میں آ گئے۔ یہ ہمارے لیے بے حد خوشی کا موقع تھا ہم بھی کہہ سکتے تھے کی اب ہمارے پاس بھی سر چھپانے کی اپنی جگہ ہے۔ سرکاری ملازمت نے ہمیں ضرور تمام سہولیات اور مکان مہیا کرائے تھے۔ ورنہ ہمارے زندگی تو مٹی یا ٹین ٹپر سے بنے گھروندوں میں ہی گذری تھی۔ اچھا گھر تو ہماری لیے صرف ایک خیال ہی تھا لیکن نوکری میں آنے کے بعد سے زندگی کی تمام خوشیاں عیش آرام ٹھیک طرح سے دیکھ سکے۔

کرایے کے مکان ڈھونڈھنے اور ان میں رہنے کی مصیبت کو ایک دلت کس طرح جھیلتا ہے اسے ریزرویشن کے مخالفین اور ہندوستان کی مہانتا (عظمت) پر فخر کرنے والے کبھی بھی انسانی نظریہ کے ساتھ نہیں دیکھ پائیں گے۔ان حالات میں ایک دلت کے پاس اپنا مکان ہونا کیا معنٰی رکھتا ہے اسے صرف وہی جان سکتے ہیں جنھونے اسے برداشت کیا ہو۔

چندا کا شملہ اجانے کا دل نہیں تھا۔وہ اپنے اس نئے گھر میں سکون سے رہنا چاہتی تھی۔کافی بحث ومباحثہ کے بعد آخرکار چندا نے بھی حامی بھردی اور ہم نے شملہ جانے کی تیاری شروع کردی۔مکان کا اپری حصہ کرائے دار کے لیے رکھا تھا لیکن اتنی جلدی کوئی ڈھنگ کا کرایہ دار ملنا بھی آسان نہیں تھا۔اس لیے اشتہار کا سہارا لیا گیا۔ایک فیملی آئی،گھر ان کے حوالے کر کے ہم نے شملہ جانے کا پروگرام بنالیا۔

۱۲رمئی ۲۰۱۳ءکو میں نے ہندوستانی اعلیٰ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ شملہ میں ایک فیلو کی حیثیت سے جوائن کیا۔اس روز ہم مہمان خانے میں ٹھہرے۔میس اور مہمان خانے کے زیادہ تر کام کرنے والے مجھے اور چندا کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔اس سے قبل ہم لوگ کئی بار انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے منعقد سمیناروں میں شرکت کرچکے تھے۔انسٹی ٹیوٹ کی گورننگ باڈی کا بھی تین سال تک میں ممبر رہ چکا تھا اس لیے انسٹی ٹیوٹ میرے لیے نئی جگہ نہیں تھی۔سب لوگ میرے وہاں آجانے سے خوش تھے۔

اگلے ہی روز کورٹین ہال کا بنگلہ نمبر۳ ہمیں الاٹ کیا گیا۔ہمارے ساتھ والے حصے میں جمو یونیورسٹی کی پروفیسر انوپما تھیں۔برابر والے بنگلے کے گراؤنڈ فلور میں کویتا پنجابی،جو کولکاتہ سے تھیں۔اس کے اوپری منزل میں پولینڈ سے الیکزینڈرا وینٹا تھیں۔کویتا پنجابی کے بعد اس بنگلے میں مالویکا تلسی آگئی تھیں۔یہ سب اپنے اپنے علاقے کی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتیں تھیں۔جن کے ساتھ رہ کر مجھے بھی اچھا لگ رہا تھا۔

یہاں بنگلہ بہت خوبصورت جگہ پر تھا جہاں سے نئے شملہ کو رات میں جگمگاتے ہوئے دیکھنا بے حد پرکشش لگتا تھا۔سامنے ایک چھوٹا سا آنگن تھا۔اس کے بعد نیچے

گہری کھائی اور بابوگنج کو جوڑنے والی سڑک۔ خالی وقت میں آنگن میں کرسی ڈال کر بیٹھنے میں مجھے بہت سکون ملتا تھا۔ بابوگنج بازار میرے اس بنگلے سے بالکل نزدیک تھا۔ چندا کو بھی آسانی تھی کہ روزمرّہ کی ضروری چیزیں لانے کہیں دور نہیں جانا پڑتا تھا شملہ جیسی جگہ پر ایسی سہولیت ملنا مشکل تھی۔

جس دن ہم شملہ پہنچے رات کا کھانا ہم نے میس میں ہی کھایا۔ اس وقت تمام فیلو اور وہاں زیرِ مطالعہ عالموں سے ایک ساتھ ملاقات ہوگئی۔ کئی لوگوں سے میرا پہلے سے تعارف تھا تو کچھ ایسے بھی تھے جن سے پہلی بار ملاقات ہو رہی تھی۔ کچھ کے نام اتنے بڑے تھے کہ بھلے ہی ذاتی طور پر پہلی بار ملاقات ہوئی ہو لیکن ان کے کام اور نام سے بخوبی واقف تھا۔ راج وندر جرمنی سے تھے لیکن ان سے میری ملاقات پونے کے ایک ادبی جلسے میں ہو چکی تھی۔ بنگلور سے جسبیر سنگھ تھے، جن کو میں مسلسل پڑھتا تھا اور ستیش شرما تھے یعنی کل ملا کر ایک اچھے ماحول کے امکانات بن رہے تھے۔

انسٹی ٹیوٹ کی دوسری منزل پر مجھے مطالعہ کے لیے ایک کمرہ ملا۔ کمرہ میں میرے ساتھ ڈاکٹر ایم برول پنٹو بیٹھتے تھے جو کرناٹک سے آئے تھے۔ خاموش مزاج کے اور دن بھر اپنے کام میں ڈوبے رہنے والے سنجیدہ انسان تھے۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ چرچ میں ایک خادم کے طور پر بھی کام کیا کرتے تھے۔ ان سے مل کر بہت اچھا لگا تھا۔ اپنے کام کو کس طرح منظّم طریقے سے کرنا ہے یہ میں نے ان سے سیکھنے کی کوشش کی۔ علمیت کے ساتھ ساتھ میرے دل میں ان کی ایک نیک انسان کی تصویر بن گئی تھی۔ کچھ مسئلوں پر ہمارے بیچ اتفاق نہیں تھا مثلاً انھیں دنوں این۔ سی۔ آر۔ ٹی کی کتاب میں چھپے ڈاکٹر امبیڈکر کے کارٹون کو صحیح ٹھہراتے ہوئے ان کی ایک تحریر انگریزی کے ایک بڑے رسالے میں چھپی تھی جس پر میں نے کھل کر ان کے سامنے اپنی نااتفاقی جتائی تھی۔ اس کارٹون کو لے کر پورے ملک میں کافی غصہ تھا۔ دلتوں نے کھل کر مخالفت کی تھی اور سرکار کو اسے نصاب سے ہٹانا پڑا۔

انسٹی ٹیوٹ جوائن کرنے کے بعد دوسرے دن انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر

پروفیسر پیٹر رینولڈ ڈسوزا سے ان کے آفس میں ہی ملاقات ہوئی۔ اس وقت چندا بھی میرے ساتھ تھی۔ انھوں نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ میری تحریروں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ''جھوٹن'' وہ کافی پہلے پڑھ چکے تھے۔ میری تمام کتابیں انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں موجود تھیں۔ میں جس موضوع پر کام کرنے آیا تھا انھوں نے میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا:

''والمیکی جی! اگر اس کام میں کوئی بھی کتاب آپ کو چاہیے جو یہاں نہیں ہے ہمیں بتایئے ہم اس کو منگوائیں گے۔ ایک اچھا ماحول یہاں دینے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ امیّد ہے آپ اور محترمہ انسٹی ٹیوٹ میں اچھا محسوس کریں گے۔ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے جو بھی مدد چاہیے ہوگی ملے گی۔''

ان سے مل کر جب ہم واپس ہوئے تو ہمیں بہت اچھا لگا۔ ان کے سلوک نے ہم دونوں کا دل جیت لیا تھا۔ چندا اپنے گھر گرہستی کو جمانے میں مصروف ہوگئی اور میں اپنا کام شروع کرنے کے لیے کتابیں، کمپیوٹر، اسٹیشنری وغیرہ کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ لائبریری سے کتابیں ڈھونڈھنے میں وہاں کے اسٹاف نے کافی مدد کی۔ کمپیوٹر وغیرہ کے لیے کافی ہنرمند انجینئر وہاں موجود تھے۔ اس لیے کام شروع کرنے میں کوئی دقّت نہیں آئی۔

انسٹی ٹیوٹ کا ماحول کافی خوشگوار اور پرسکون تھا۔ کام کرنے میں دل لگتا تھا۔ پڑھنے لکھنے کی تمام سہولیات وہاں موجود تھیں۔ میں صبح ۹:۳۰ر سے ۱۰ربجے تک انسٹی ٹیوٹ پہنچ جاتا تھا اور دوپہر ۱ربجے تک کام کرتا۔ لنچ کے بعد ۲:۳۰ربجے تک پھر اپنے کمرے میں پہنچ کر کام میں مگن ہو جاتا۔ کچھ دیر لائبریری میں رسالے دیکھتا۔ ہفتہ کے ہر جمعرات یوم سمینار کے طور پر رکھا جاتا۔ اس دن ۳ربجے دوپہر کے بعد کسی ایک یا دو فیلو کو اپنے کام سے متعلق تفصیل دینی ہوتی تھی جس پر باقی فیلو چرچا کرتے۔ یہ ایک اہم سمینار ہوتا، جس میں سب ہی ساتھی فیلو حصہ لیتے ساتھ ہی اپنے مطالعہ کو آگے

بڑھانے اور صحیح رخ میں لے جانے میں مدد ملتی تھی۔

شملہ میں رہتے ہوئے اس رفتار سے میں نے اپنا کام شروع کیا تھا ویسے ہی میری جسمانی طاقت کم ہو رہی تھی۔ شروع شروع میں میں نے اسے زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا لیکن جیسے جیسے وزن گھٹنے لگا میری فکر بڑھنے لگی۔ کھانا بھی ایک دم کم ہو گیا۔ کھانے میں میری دلچسپی دہرادون سے ہی کم ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ دہرادون میں ہری دوار روڈ پر ڈاکٹر کے۔ ایس۔ راوت سے میں دو تین بار ملا اور اپنی پریشانی ان کے سامنے رکھی انھوں نے ہر بار ایک ہی جواب دیا:

''آپ ایک دم فٹ ہو! اس عمر میں کھانا ویسے بھی کم ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں زیادہ مت سوچو۔''

ہر بار ان کا یہی کہنا تھا۔ شملہ کے لیے نکلنے سے پہلے چندا ایک بار پھر ڈاکٹر راوت کے پاس لے گئی۔ اس روز بھی انھوں نے وہی پہلا والا جواب دہرایا تھا۔ چندا نے ان سے کہا بھی تھا:

''ڈاکٹر! ہم لوگ کچھ وقت کے لیے شملہ جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر کوئی نئی پریشانی نہ ہو جائے اس لیے آپ ایک بار ٹھیک سے دیکھ لیجیے کوئی ٹیسٹ وغیرہ کرانا ہو تو وہ بھی کروا سکتے ہیں اور اگر کوئی فکر والی بات ہے تو میں انھیں لے کر شملہ نہیں جاؤں گی۔''

''آپ بے کار میں پریشان ہو رہی ہیں۔ ایک موقع ملا ہے شملہ کا مزہ لیجیے۔'' ڈاکٹر راوت نے چندا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

آگے چل کر یہی فیصلہ میرے خلاف نکلا۔ آہستہ آہستہ دوپہر کا کھانا نہ کھانے کی حالت ہو گئی۔ رات میں بھی تھوڑی سی کھچڑی جس کی وجہ سے میرا وزن تیزی سے گرنے لگا۔ چڑھائی چڑھنے میں سانس بھی پھولنے لگی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ میں ڈاکٹر مینو سے میں نے بات کی تھی لیکن ان کو بھی میری بات سمجھ نہیں آئی۔ دھیرے دھیرے میری حالت خراب ہو رہی تھی۔

جون کے آخری ہفتے میں سیما اپنی دونوں بیٹیوں نتوں اور بنی کو ساتھ لے کر ہمارے پاس آئی تھی۔ ساتھ میں چندا کی بڑی بہن سورن لتا بھی تھیں۔ یہ لوگ تقریباً ایک ہفتے تک ہمارے ساتھ رہے۔ سیما ہر روز کہتی تھی:

''چاچا جی! آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے جا کر ملیے۔ آپ کافی کمزور ہو گئے ہیں یا پھر میرے ساتھ نوئیڈا چلیے وہاں اچھے ڈاکٹر ہیں ہماری جان پہچان بھی ہے ان کو دکھا دیں گے۔''

''ٹھیک ہے ملتا ہوں کسی اچھے داکٹر سے۔'' میں نے اسے اطمینان دلایا۔

جس روز میں انھیں شملہ کے نئے بس اڈّے پر دہرادون کی بس میں بٹھانے کے لیے آیا تو چندا کی بڑی بہن نے ایک بار پھر مجھے ڈاکٹر سے ملنے کی صلاح دی۔ میں نے ان سے کہا:

''ٹھیک ہے، میں ایک آدھ روز میں کسی اچھے ڈاکٹر سے ملتا ہوں، آپ فکر نہ کریں۔''

انھیں بس کا ٹکٹ دلوا کر میں واپس آ گیا۔ اپنے مطالعہ کے کمرے میں پہنچتے ہی سب سے پہلے میں نے مشہور افسانہ نگار ہرنوٹ کو فون کیا۔ وہ شملہ کے محکمہ سیاحت میں تھے وہ میرے اچھے دوست بھی ہیں۔ میں نے انھیں اپنی پریشانی بتائی تو بولے:

''آپ کی گرتی صحت کو دیکھ کر میں خود بھی فکر مند ہوں کئی بار سوچا کی آپ کا کسی اچھے ڈاکٹر سے چیک اپ کرایا جائے، آپ فکر نہ کریں میرے بیٹے کی بیوی سنیتا سینی ٹوریم اسپتال میں نوکری کرتی ہے۔ اپنے گھر سے زیادہ دور بھی نہیں ہے آپ جب بھی چاہیں ان سے مل لیں۔ اسپتال میں ڈاکٹر امام الدین ایک اچھے اور قابل ڈاکٹر ہیں۔ سنیتا کو میں کہے دیتا ہوں وہ آپ کو ساتھ لے کر جائے گی۔ ضرورت پڑی تو میں خود بھی آپ کے ساتھ آ جاؤں گا۔''

اگلے روز میں سینی ٹوریم اسپتال پہنچا، سنیتا میرا انتظار کر رہی تھی دیکھتے ہی بولی:

''انکل جی آپ بیٹھیے ڈاکٹر ابھی آئے نہیں ہیں جب تک میں آپ کا رجسٹریشن کارڈ بنوا دیتی ہوں۔''

ڈاکٹر نے سب سے پہلے مجھے ہی بلایا۔ باقی معلومات کرنے کے لیے ڈاکٹر نے میرے کچھ ٹیسٹ کروائے جو وہیں لیب میں ہی ہو گئے تھے۔ کچھ کے رزلٹ تو ہاتھ کے ہاتھ مل گئے۔ کچھ اگلے دن ملنے کی بات ہوئی۔ جو رزلٹ ملے تھے وہ تو سب ٹھیک تھے ان میں کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی جس سے معلوم ہو کہ کوئی مہلک بیماری ہے۔

میں نے ڈاکٹر سے کہا بھی تھا: ''ڈاکٹر صاحب! کچھ دوائی دیں گے؟''

''ابھی کوئی دوا لکھنا ٹھیک نہیں ہو گا جب تک بیماری کا ٹھیک سے پتہ نہ چل جائے۔ پھر بھی میں آپ کو کچھ وٹامنس لکھ دیتا ہوں۔ آپ کا ہیموگلوبین بہت کم ہے۔ یہ آئرن اور وٹامنس کی گولیاں ہیں انھیں آپ لیتے رہیے۔'' ڈاکٹر نے پرچی میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔

تقریباً ۲۰؍دن تک طرح طرح کے ٹیسٹ ہوتے رہے لیکن مرض کی کسی بھی علامت کو ڈاکٹر امام الدین پکڑ نہیں پائے۔ ان ۲۰؍دنوں میں میری طبیعت اور زیادہ خراب ہونے لگی میرا وزن کافی کم ہو گیا تھا۔ ایک روز جب میں ایک ٹیسٹ کا رزلٹ لینے اسپتال کے لیے گیا تو میرے پیٹ میں کافی درد ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سنیتا نے کہا:

''انکل جی! آج آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ آپ گھر جائیے۔ لیب سے رپورٹ ملتے ہی میں آپ کے پاس بھجوا دوں گی۔ میں آپ کے لیے کسی گاڑی کا انتظام کرتی ہوں۔''

''نہیں سنیتا میری گاڑی انسٹی ٹیوٹ سے آ رہی ہے تم فکر مت کرو میرے پیٹ میں تھوڑا درد ہے میں ڈاکٹر سے کہا بھی تھا کہ کوئی دوا دیجیے لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا ہے۔ گاڑی آتے ہی میں گھر جاؤں گا۔'' میں نے سنیتا سے کہا۔

اس وقت مجھے ڈاکٹر پر کوفت ہو رہی تھی میں اس درد کو برداشت کرتے ہوئے جب میں گھر پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی چندا گھبرا گئی لیکن میں نے چندا کو اپنے پیٹ درد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اسی روز ''ہماچل دستک'' اخبار کے صحافی رجنیش شرما کا فون آیا:

''سر! آپ کہاں ہیں؟ میں آپ کے آفس میں ہوں۔''

''میں اس وقت اپنے گھر کورٹین ہال ۳ میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''سر! ہفتہ واری ضمیمے کے لیے ایک طویل انٹرویو چاہئے۔'' رجنیش نے کہا۔

''آپ کل آسکتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''سر! اسی اتوار کو یہ میٹر جانا ہے۔ آپ تھوڑا وقت مجھے دیجیے۔'' رجنیش نے مجبوری بتائی۔

اس وقت میں انٹرویو دینے کی حالت میں نہیں تھا لیکن رجنیش کو میں ٹال نہیں سکا۔

''ٹھیک ہے آجایئے! آفس سے کوئی بھی میرے گھر کا راستہ بتا دے گا میں انتظار کروں گا آپ کا۔'' میں نے اسے بلایا۔

رجنیش شرما جلدی ہی میرے گھر آ گئے۔ باہر ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی لیکن شملہ والوں کے لیے یہ عام بات تھی کیوں کہ یہ تو روز مرّہ کی بات تھی موسم کبھی بھی بدل جاتا ہے۔ اس لیے ہر کسی کے پاس ایسے موسم سے بچنے کے لئے ایک چھتری ضرور ہوتی۔ رجنیش شرما نے آتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ گفتگو اچھی چل رہی تھی کہ رجنیش نے پوچھا:

''سر! آپ کی جو فوٹو رسالوں میں چھپی ہیں ان میں اور اس وقت جو آپ دکھ رہے ہیں کافی فرق ہے؟''

''ہاں میری طبیعت بہت خراب ہے۔ سینی ٹوریم اسپتال کے ڈاکٹر امام الدین ۲۰ ؍دن سے میری بیماری ڈھونڈھ نہیں پائے ہیں جب کہ میری صحت لگاتار گر رہی ہے وزن کافی کم ہو گیا ہے۔ میں خود بھی کافی پریشان

ہوں کیوں کہ اس سے میرے کام پر بھی اثر پڑ رہا ہے۔''

''سر! آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ آپ فکر نہ کریں میں ابھی آپ کو ایک اچھے ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتا ہوں۔'' رجنیش نے کہا۔

اس نے کسی ڈاکٹر سے بات کی تو ادھر سے جواب ملا کہ ابھی لے کر آ جاؤ۔ رجنیش مجھے اندرا گاندھی میڈیکل کالج میں ڈاکٹر راجیش کشیپ کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر کشیپ میرے نام سے پہلے سے متعارف تھے۔ وہ بہت اچھے سے ملے۔ انھوں نے عام گفتگو کے بعد کہا:

''ابھی ہم ڈاکٹر کے پاس چلیں گے، وہ گیسٹرولوجی کے ماہر مانے جاتے ہیں۔''

راجیش کشیپ نے جلدی سے میری کچھ اہم جانچ کروائی۔ آخری ٹیسٹ لینے جب میں میڈیکل کالج کے لیب میں پہنچا تو ٹیسٹ کی رپورٹ میں نے دیکھی تو ایک بارگی تو میرا سر گھوم گیا مجھے لگا کہ زندگی کا آخری پڑاؤ آ گیا ہے۔ جب میں رپورٹ دکھانے ڈاکٹر کے کیبن میں پہنچا تو وہ مریضوں سے گھرے ہوئے تھے مجھے دیکھتے ہی بولے:

''میں تو آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

انھوں نے باقی مریضوں کو باہر جانے کو کہا۔ میں ان کے سامنے خاموش بیٹھا تھا۔ میرے دماغ میں زندگی کے باقی بچے لمحوں کو لے کر فکر شروع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کشیپ نے کہا:

''آپ ایڈمٹ ہو جاؤ کل یا پرسوں، آپ کا آپریشن ہو جائے گا ایک ہفتے کے اندر، اگر آپریشن نہیں ہوا تو خطرہ اور بھی بڑھ سکتا ہے۔ آج ہی آپ کو خون چڑھانا پڑے گا جسم میں خون ایک دم ختم ہے۔ یہاں آپ کا زیادہ خرچ بھی نہیں ہونے دوں گا۔ جو بھی فیصلہ لینا ہے جلدی لیں۔ دیر کرنے سے حالت بگڑ سکتی ہے۔''

''ڈاکٹر! یہاں شملہ میں آپریشن کرانا میرے لیے ممکن نہیں ہو گا۔ یہاں

چندا مجھے اکیلے نہیں سنبھال پائیں گی وہ خود شوگر، بلڈ پریشر کی مریضہ ہے۔ کیا یہ آپریشن دہرادون میں نہیں ہوسکتا؟'' میں نے اپنے دل کے شک کو ظاہر کیا۔

''دہرادون سے یہاں کسی کو بلا لیجیے۔'' ڈاکٹر کشیپ نے کہا۔

''نہیں یہ بھی آسان نہیں ہوگا۔'' میں نے اپنے دل کی بات ڈاکٹر کے سامنے رکھی۔

''تو بہتر ہوگا پھر دلّی میں کرائیں۔'' انھوں نے صاف صاف کہا۔

''لیکن جو بھی فیصلہ کرو جلدی کرو۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر!...'' کہہ کر میں اٹھ گیا۔

وہ بھی کھڑے ہو گئے، ہاتھ ملاتے ہوئے بولے:

''امید ہے... سب ٹھیک ہوگا اور ہم پھر یہیں شملہ میں ملیں گے۔ اپنے آپ کو کمزور مت پڑنے دینا۔'' کہہ کر انھوں نے مجھے وداع کیا۔

میں بے حد تھکے قدموں سے ان کے کیبن سے باہر آیا تھا۔ باہر انسٹی ٹیوٹ کی گاڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ ڈرائیور نے پوچھا:

''سر! گھر چلیں گے یا انسٹی ٹیوٹ۔''

''انسٹی ٹیوٹ ہی چلو۔'' میں نے چلنے کے لئے کہا۔

باہر تیز بارش ہو رہی تھی جس کو دیکھ کر میں ہمیشہ خوش ہوتا تھا لیکن آج یہ بارش بھی میری ناامیدی دور نہیں کر پا رہی تھی۔ سارے راستے میرے ذہن میں چندا کا خیال آرہا تھا۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو چندا بالکل اکیلی ہو جائے گی۔ اتنی لمبی زندگی میں ہم کبھی بھی اکیلے نہیں رہے سکھ دکھ ساتھ گذارے یہی میری سب سے بڑی کمزوری بھی ہے۔

انسٹی ٹیوٹ میں ڈاکٹر ایمبر وس پنٹو کے بعد میرے کمرہ میں نئی دلّی سے ڈاکٹر وبھا اروڑا آئی۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو وہ وہاں بیٹھی کام کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں:

''والمیکی جی! بڑی دیر لگا دی... رپورٹ ملی؟''

''ہاں مل گئی'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''سب ٹھیک تو ہے کچھ سست لگ رہے ہیں آپ... دکھایئے رپورٹ۔''

اس نے اپنا پن جتایا رپورٹ دیکھ کر کچھ نہیں کہا سیدھے آ کر میرے کمپیوٹر کی کرسی پر بیٹھ گئی اور نیٹ سے ڈھونڈھ کر اس رپورٹ سے متعلق تمام معلومات میرے سامنے رکھ دیں۔

''آپ جانتے ہیں آپ کو کیا تکلیف ہے؟'' وبھا نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں جانتا ہوں۔''

میرے لہجے میں چھپی ناامیدی کو اس نے پکڑ لیا تھا۔

''ٹھیک ہے سامان سمیٹ کر الماری میں بند کیجیے اور آپ میم کو فون کیجیے کہ کل صبح آپ لوگ دلّی جا رہے ہیں۔ اس کیس میں دیر کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔''

اس نے میری کتابیں اٹھا کر الماری میں بند کرنا شروع کر دیا۔ جو ساتھ لے جانے والا سامان تھا میرے بیگ میں رکھ دیا۔

''وبھا جی! لائبریری کی کتابیں تو واپس کر دیں پتہ نہیں کتنے دن لگ جائیں گے۔ تب تک یہاں بند پڑی رہے گی۔'' میں نے کہا۔

''بعد میں جب دوبارہ ڈھونڈیں گے تو مل ہی جائیں گی۔'' وبھا نے کہا۔

سارا سامان اکٹھا کر کے میں اپنے گھر پر آ گیا۔ انسٹی ٹیوٹ کو میں نے خبر کر دی کہ میں اپنے علاج کے لیے دلّی جا رہا ہوں۔ چندا کو بیماری کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتایا تھا صرف یہی کہا تھا کہ پیٹ کا آپریشن ہوگا۔

اگلے روز سنیچر تھا۔ انسٹی ٹیوٹ بند رہتا تھا۔ ہم نے اتوار کو شملہ سے نکلنے کا پروگرام بنایا۔ پہلے دہرادون جانا ضروری تھا۔ علاج میں کیا خرچہ آئے گا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا پھر بھی پیسوں کا انتظام کر کے ہی دلّی جانا ٹھیک ہوگا یہی سوچ کر پروگرام بنایا تھا۔ ایک ڈرائیور کا بھی انتظام کرنا تھا جو ہمیں ہماری گاڑی سے دہرادون چھوڑ

دے کیوں کہ میری حالت ایسی نہیں تھی کہ میں اتنی دور گاڑی چلا کر لے جا سکوں۔انسٹی ٹیوٹ کا ملازم سنیل کمار نے انسٹی ٹیوٹ کے ہی ایک ڈرائیور راکیش سے بات کی جو ہمیں دہرادون چھوڑ کر اسی دن واپس لوٹ آئے گا۔راکیش بڑی مشکل سے تیّار ہوا تھا۔

سنیچر کو دن بھر لوگ آتے رہے جس کو بھی معلوم ہوا وہی ملنے چلا آیا۔مالویکا کشوری پڑوس میں تھیں وہ بھی آکر چندا کو سمجھاتی رہیں۔مالویکا کشوری کی ممّی کا اسی طرح کا آپریشن سر گنگا رام اسپتال میں ہی ہوا تھا۔انکا کہنا تھا کی آپ سیدھے سر گنگا رام اسپتال میں ڈاکٹر نندی سے رابطہ کریں امید ہے سب ٹھیک ہوگا۔انھوں نے کافی ترسیل کے ذرائع بھی میسّر کیے تھے لیکن ڈاکٹر نندی اپنا موبائل نمبر کسی کو بھی نہیں دیتے اس لیے آپ سیدھے ان کا اپائنٹمنٹ لے کر ان سے ملیں آپ ان سے مل کر نا امّید نہیں ہوں گے۔

میں نے ابھی تک ہوئے میڈیکل ٹیسٹ کی تمام رپورٹیں منیش کے پاس نوئیڈا بھیج دی تھیں تاکہ وہ کسی اچھے ڈاکٹر سے صلاح لے سکے۔میں نے منیش کو میتریہ کا پتہ اور نمبر دے کر کہا تھا کہ ان سے بھی مل لینا۔ان کی بیٹی اور داماد ایمس میں ڈاکٹر ہیں۔ایمس میں ایڈمشن مل جائے تو ٹھیک رہے گا۔

منیش میتریہ پشپا جی سے ملا۔ان کو پیپر بھی دیے لیکن ان کی بیٹی کا کہنا تھا کہ ایمس میں آپریشن کے لیے ایک مہینے سے پہلے نمبر نہیں آسکتا۔میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا مجھے جلد از جلد آپریشن کرانا تھا جیسا کہ ڈاکٹر کشیپ کی رائے تھی۔

دہرادون پہنچ کر میں نے سب سے پہلے پیسوں کا انتظام کیا۔پڑوس میں مدن شرما جی رہتے تھے جیسے ہی انھیں خبر ملی وہ بھابھی جی کے ساتھ آگئے۔چندا کی بڑی بہن سورن لتا بھی آئی۔دھیرے دھیرے خبر رشتہ داروں میں پھیل گئی وہ سب آنے لگے۔مدن شرما جی نے کچھ ادیب دوستوں کو خبر کر دی تھی۔وجے گوڑ بھی آئے۔سب میری صحت کو لے کر فکر مند تھے۔

۱۸ اگست کی صبح چندا مجھے لے کر دلّی کے لیے روانہ ہو گئی۔ منیش کو فون کر دیا تھا کہ ہم لوگ ایک بجے تک نوئیڈا پہنچ جائیں گے۔ اس نے سمرن نندی سے اپائنٹمنٹ لے لیا تھا۔ نوئیڈا پہنچتے ہی ہم لوگ سر گنگا رام اسپتال کے لئے نکل پڑے۔ وہی ہمیں جے۔ این۔ یو کے رام چندر جی بھی ملے انھیں پہلے سے معلوم تھا کہ میں علاج کے لیے دلّی آ رہا ہوں۔ شام ۴ ر بجے ڈاکٹر نندی او۔ پی۔ ڈی میں مریضوں کو دیکھتے تھے۔ میرے پیپر دیکھنے کے بعد انھوں نے میرا چیک اپ کیا۔ انھوں نے مجھے باہر جانے کے لیے کہا میں نے ان سے کہا:

''ڈاکٹر! آپ میرے سامنے ہی بتا دیجیے۔ مجھے کیا بیماری ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

لیکن وہ نہیں مانے۔ باہر آ کر منیش اور رام چندر نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا کہ کل آپ کو ایڈمٹ ہونا ہے اور صبح آ کر ایڈمیشن کے لیے رابطہ کرنا ہے۔ ڈاکٹر نندی نے آپریشن کی تاریخ ۱۰ ار اگست دی ہے۔ اگلے ہی روز ہم صبح صبح سر گنگا رام اسپتال میں ایڈمیشن کے لیے آ گئے لیکن وہاں کوئی بھی بیڈ خالی نہیں تھا۔ منیش کی کافی دوڑ بھاگ کے بعد بھی کوئی حل نہیں نکلا۔

دلّی کے بہت سے دوستوں کو میری بیماری کی خبر مل چکی تھی۔ وہ سب اسپتال آ کر میری خبر لینے کے لیے پریشان تھے، اجے ناوریہ، ہیم لتا مہیشوری، روہتک سے اجمیر سنگھ 'کاجل'، جے۔ این۔ یو کے بہت سے دوست اور شیو راج 'بے چین' بھی آئے تھے۔

پورا دن ایڈمیشن کے لیے انتظار کرنا بہت تکلیف دہ تھا۔ زیادہ دیر تک اسپتال کی سخت کرسیوں پر بیٹھنا میرے لیے کافی پریشان کن تھا پھر بھی مجبوری تھی اس مشکل سے بڑی مشکل کا میں انتظار کر رہا تھا لیکن دوستوں کو دیکھ کر مجھے طاقت ملی تھی۔ شام ہوتے ہوتے ایڈمشن مل گیا اور میں اپنے بیڈ پر چلا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں اسپتال میں داخل ہوا تھا وہ بھی اتنی مہلک بیماری کے علاج کے لیے جس کے بارے میں کبھی تصوّر

بھی نہیں کیا تھا۔

ہری دوار سے وجیندر بھی آئے رات کو میرے ہی پاس ٹھہرے تھے۔ باقی بہت سے لوگ دہرادون سے آئے تھے وہ سب منیش کے ساتھ نوئیڈا چلے گئے۔ چندا سے بھی میں نے کہا کہ ابھی چلی جاؤ صبح کو آجانا یہاں وجیندر تو میرے پاس ہیں۔ چندا جانا نہیں چاہتی تھی لیکن میں نے ضد کر کے اس کو بھیجا تھا کیوں کہ وہ بہت پریشان دکھائی دے رہی تھی نوئیدا جا کر تھوڑا آرام کر لے گی یہی سوچ کر میں نے اسے جانے کے لیے کہا تھا۔

اس رات وجیندر بہت رات تک باتیں کرتا رہا اور ساتھ ہی مجھے اس بات کا یقین دلاتا رہا کی آپ کسی بھی طرح کی فکر دل میں مت رکھیے ہر وقت میں آپ کے ساتھ ہوں علاج ٹھیک سے ہونا چاہیے پیسے چاہے جتنے بھی لگیں جب تک میں ہوں کسی سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لمحات مجھے جذباتی کرنے کے لیے کافی تھے لیکن میں نے خود کو کمزور نہیں پڑنے دیا۔ میرے دل میں اگر کوئی فکر تھی تو وہ چندا کی تھی جو ذہنی طور پر مضبوط نہیں تھی اس کو چھوٹی چھوٹی باتوں سے گھبرا جانے کی عادت تھی جس کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے علاوہ میرے دل میں کوئی بھی کسی بھی طرح کی فکر نہیں تھی۔

ویسے بھی مجھے کبھی بھی موت سے ڈر نہیں لگا جب تک سانسیں چل رہی ہیں تب تک دنیا بھر کی ہائے توبہ ہے، آنکھ بند ہوتے ہی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اگر کچھ بچتا ہے تو وہ ہے آپ کا کیا ہوا کام اس کے علاوہ کوئی کسی کو یاد نہیں کرتا۔ نہ جانے کس لمحہ میں مجھے مرنے کا خوف ختم ہوا۔ اسپتال میں بیڈ پر لیٹے ہوئے بھی میں اپنے آپ کو صحیح محسوس کر رہا تھا۔ وجیندر نے کہا:

''انکل جی! آنٹی کو لے کر کسی بھی طرح کی کوئی بھی فکر لے کر آپ آپریشن تھیٹر میں نہیں جائیں گے۔ اگر آپ کمزور پڑ گئے تو ہم سب کمزور پڑ جائیں گے۔ آپ نے جس طرح کی زندگی گذاری ہے وہ یہ ثابت

کرنے کے لیے کافی ہے کہ آپ کسی بھی حالات میں ہار ماننے والے نہیں ہیں۔ آپ ہر بار مخالف حالات میں کامیاب ہوئے ہیں اس بار بھی آپ کامیاب ہو کر ہی واپس آئیں گے، یہ میرا یقین ہے۔''

اسی وقت اسپتال کا نائی آیا۔

''سر! کل آپ کا آپریشن ہوگا اسی سلسلہ میں آیا ہوں۔ آپ سیدھے لیٹ جائیے۔ مجھے آپ کے جسم کی صفائی کرنی ہے۔''

بغیر دیر کیے اس نے میرے سارے کپڑے اتار دیے۔ پوری روشنی میں ایک اجنبی انسان کے سامنے میں بالکل بے لباس لیٹا تھا۔ اس سے پہلے کبھی بھی میں نے ایسا تصور نہیں کیا تھا کہ ان حالات سے بھی مجھے گذرنا پڑ سکتا ہے۔ اس نے میرے سارے کپڑے اتار دیے اور اپنے آلے سجانے لگا میرے لیے یہ سب عام نہیں تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی مشین نکال کر میرے جسم کے بالوں کی صفائی شروع کر دی۔ وجیندر کچھ دیر کے لیے باہر چلا گیا۔ سر کے بالوں کے علاوہ جسم کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں اس نے مشین نہ گھمائی ہو اس کے بعد تولیے سے پورے جسم کو پونچھا۔ اپنا کام ختم کر کے اس نے مجھے اسپتال کے کپڑے پہنا دیے۔ اس کے جاتے ہی وجیندر آیا۔ رات کے تقریباً ۱۲ ربج چکے تھے۔ وجیندر نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا:

''انکل جی! اب آپ سو جائیے دن بھر کے تھکے ہوئے ہیں، کل آپریشن بھی ہونا ہے۔''

میں نے ہنستے ہوئے کہا:

''وجیندر! جو ہونا ہے ہونے دو، یہ رات ہے جس کو ہم ڈھیر ساری باتوں کے ساتھ گذار سکتے ہیں۔ پتہ نہیں پھر دوبارہ رات آئے نہ آئے، کم سے کم یہ تو یاد رہے گا کہ ہم نے اس روز کتنی باتیں ایک دوسرے سے کی تھیں۔''

وجیندر مجھے اجنبی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے اس طرح دیکھتے ہوئے پوچھا:

''کیا ہوا، اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں یہی تو چاہیے آپ سے! اسی طرح آپ کی سوچ ہمیں طاقت دیتی ہے۔'' وجیندر نے مسکرا کر کہا۔

اس رات دیر تک ہم لوگ سماج، دنیاداری کی باتیں کرتے رہے۔ اگلے روز میرا آپریشن ہوگا اس خیال کو میں نے اپنے آس پاس بھی بھٹکنے نہیں دیا۔ صبح ہوتے ہی اسپتال کی سرگرمیاں شروع ہوگئی۔ ایک کے بعد ایک نئے ڈاکٹر لگاتار آرہے تھے۔ کبھی بلڈ ٹیسٹ تو کبھی بلڈ پریشر کبھی بلڈ شوگر ٹیسٹ تو کبھی ایکسرے کا عمل چل رہا تھا۔ ایک طرف ڈرپ چڑھ رہی تھی تو دوسرے ہاتھ میں سوئیاں چبھوکر ہاتھ میں جگہ جگہ نشان ڈال دیے تھے۔

چندا اور منیش نوئیدا سے آگئے۔ ساتھ میں چندا کی بہن سورن لتا، ونیتا اور وریش بھی آگئے۔ راجیو بھی پہنچنے والے تھے۔ دلّی کے بہت سے دوست آرہے تھے۔ یعنی میں ایسے وقت میں اکیلا نہیں تھا۔ یہ میرے لیے بڑا سکون بھرا احساس تھا۔ چندا کو بھی لگ رہا تھا کہ وہ اکیلی نہیں ہے لیکن پھر بھی فکر اس کے چہرے پر صاف دکھائی دے ہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میرا ایک بڑا آپریشن ہونے والا ہے جس میں کچھ بھی حادثہ ہو سکتا ہے اچھا یا برا۔ ہر ایک مخالف حالت کے لیے میں ذہنی طور پر تیار تھا لیکن دل کے ایک کونے میں ایک فکر بار بار دستک دے رہی تھی۔

''چندا جس طرح سے ہر ایک چیز کے لیے میرے اوپر منحصر ہے اگر مجھے کچھ ہو گیا تو وہ کیسے رہ پائے گی۔''

چندا خود کو صحیح دکھانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میں اس کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا پھر بھی وہ کافی خاموش اور مستعد تھی۔ وجیندر نے شاید ان حالت کو ٹھیک سے پکڑ لیا تھا، میرے پاس آکر وجیندر نے کہا:

''انکل جی! آپ دل میں کوئی بھی بوجھ لی کر آپریشن تھیٹر مت جانا۔ ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے۔ آنٹی کی طرف سے آپ بے فکر رہیں

اسپتال کا جو بھی خرچ آئے گا اسے میں اٹھاؤں گا۔''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

''اگر ضرورت پڑی تو دہرادون کے کدار پور میں میرا ایک فلیٹ ہے اسے بیچ دینا۔''

''انکل جی! یہ سب چھوڑو.....'' وجیندر نے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

تقریباً شام ۴:۳۰ بجے اسپتال کے کام کرنے والے مجھے آپریشن تھیٹر میں لے جانے کے لیے آ گئے تھے۔ جانے سے پہلے میں نے دیکھا سبھی رشتہ داروں کے پیچھے چندا ایک دم خاموش کھڑی ہے۔ میں نے پاس آنے کا اشارہ کیا جیسے ہی پاس آئی میری آنکھیں بھر آئی۔

اسپتال میں کام کرنے والے چھٹی فلور پر آپریشن تھیٹر میں لے گئے۔ ڈاکٹر سمرن نندی جو میرے آپریشن کی تیاری میں لگے تھے وہ میرا آپریشن کرنے والے تھے وہ میرے پاس آئے اور کہا:

''ہماری پوری کوشش رہے گی۔ پھر بھی آپ کی ہمت اور مثبت سوچ ہمارے کام کو کامیاب بنائے گی اس لیے ہمت رکھنا۔''

''ڈاکٹر آپ بے فکر رہیے میں اتنی جلدی مرنے والا نہیں ہوں آپ اپنا کام کیجیے...میں آپریشن کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نندی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''ویری نائس، یہی سوچ تو چاہیے۔''

''اوم پرکاش جی! تھوڑا سا اس طرف کروٹ لیں گے۔'' ایک نے کہا۔

وہ آپریشن کی تیاری میں لگا تھا۔ میں نے جسم کو دوسری طرف جھکایا۔

اس نے کہا:

''اوم پرکاش جی! ایک چھوٹی سی سوئی لگا رہا ہوں درد ہوگا تو بتایئے گا۔''

اس کے بعد مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ جب ہوش آیا تو خود کو آئی سی یو کے ریکوری روم میں پایا۔ میرے ارد گرد تین چار اسپتال میں کام کرنے والے ہرے رنگ کے

کپڑوں میں مشغول تھے۔ایک نے پوچھا:

''اوم پرکاش جی! کیسا لگ رہا ہے؟''

''ابھی تو میں ہل بھی نہیں پا رہا ہوں....اگر آپ لوگ میری بیوی کو یہاں بلا دیں تو اچھا رہے گا...''

میں نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔مجھے اپنی ہی آواز پرائی سی لگ رہی تھی ایک ایک لفظ گھٹ گھٹ کر باہر آ رہا تھا۔جسم کی کمزوری نے آواز کو بھی توڑ دیا تھا۔

''ابھی اناؤنس کراتے ہیں۔'' کام کرنے والے نے مجھے یقین دلایا۔

تھوڑی دیر بعد سر اور پاؤں تک ہرے رنگ کے کپڑوں میں ڈھکا جو شخص میرے سامنے کھڑا تھا وہ چندا نہیں وجیندر تھا جس کو میں نے اس کی آواز سے پہچانا تھا۔

''انکل جی! ٹھیک ہو؟''

''تمہاری آنٹی کہاں ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''آپریشن میں دیر لگ رہی تھی اور ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ آپریشن کے دو تین گھنٹے تک کسی کو بھی ملنے نہیں دیا جائے اس لیے آنٹی کو منیش نوئیڈا لے گیا۔یہاں وہ کافی پریشان لگ رہی تھیں۔صبح ہوتے ہی وہ آجائیں گی۔ آپ کیسے ہیں؟'' وجیندر نے دور کھڑے کھڑے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں...آپ یہاں اکیلے ہیں؟ باقی سب لوگ کہاں ہیں؟'' میں نے جاننا چاہا۔

''دہرادون سے جو لوگ آئے تھے وہ سب آنٹی کے ساتھ نوئیڈا چلے گئے لیکن کافی لوگ ابھی بھی اپریشن تھیٹر سے آپ کے باہر آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔اب اناؤنس ہوا ہے تو انھیں تسلی ہو گئی ہے اب وہ سب واپس جا رہے ہیں کیوں کہ اس وقت کسی کو بھی آپ سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔''

وجیندر نے جلدی جلدی کہا کیوں کہ انھیں زیادہ بات کرنے سے منع کیا گیا

تھا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر سمرن نندی میرا حال چال جاننے آئے۔

''کیسے ہو؟''

''ابھی تو صرف ذہن اور یادداشت ہی جاگی ہے جسم کا تو ابھی پتہ نہیں ہے۔'' میں نے ٹوٹے ٹوٹے لفظوں میں کہا۔

''تھوڑی دیر میں جسم میں بھی حرکت آجائے گی ابھی انجکشن کا اثر ہے... ہم نے بیماری کو جڑ سے ختم کر دیا ہے... اب آپ کو حوصلہ رکھنا ہے۔'' کہتے ہوئے ان کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ آئی ساتھ میں میں بھی ہلکا سا مسکرایا۔

مجھے وقت کا اندازہ نہیں تھا پلنگ پر سیدھے لیٹے ہوئے اسپتال کے ریکوری روم کی چھت کو دیکھ رہا تھا جہاں قسم قسم کے اوزار لٹکے ہوئے تھے جن کو میں خود سے ہی جاننے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے بار بار یہی احساس گھیرے ہوا تھا کی جیسے میں ٹھیک سے سوچ نہیں پا رہا ہوں۔ اسپتال کے سبھی اوزار میرے لیے اجنبی تھے۔ میرے خیال میں کئی دوست رشتہ دار ایک ساتھ دستک دے رہے تھے میں بنا ہلے ڈلے بستر پر لیٹا رہا۔ میں ان چہروں کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو دیر رات تک اسپتال میں میری پریشانی کا حصہ بنے رہے۔ شاید ان سبھی کی وجہ سے میں رشتوں کے بڑپن اور گہرائی کو سمجھ سکا... وہ سب میرے کون تھے... شاید اس وقت بتا پانا بھی میرے لیے مشکل تھا۔

اگلے روز تقریباً ۱۰ ر بجے مجھے ریکوری روم سے اس کمرے میں شفٹ کر دیا گیا جو مجھے الاٹ ہوا تھا۔ اس وقت وہاں چندا، وجیندر، منیش، چندا کی بڑی بہن سورن لتا میرا انتظار کر رہے تھے۔ چندا کو دیکھ کر لگ رہا تھا کی وہ رات بھر سوئی نہیں ہے۔

منیش نے بتایا کہ جے۔ این۔ یو کے طالب علموں نے میرے لیے خون دیا ہے۔ اسپتال نے ۶ ر یونٹ کا اندازہ لگایا تھا لیکن جے۔ این۔ یو کے طالب علموں نے ۸ ر یونٹ خون دیا تھا اور چندا نے اسپتال میں آنے والے لوگوں کے بارے میں خبر دیتے ہوئے بتایا تھا کی ان میں سے زیادہ جے۔ این۔ یو، ڈی۔ یو کے بچے لڑکے لڑکیاں اور پروفیسر تھے، سماجی کارکن، دوست اور میرے قارئین وغیرہ موجود تھے۔

ہریانہ، پنجاب اور دلّی سے آئے دلت کارکناں زیادہ تھے۔ان کی موجودگی سے چندا کو بھی طاقت ملی تھی۔

جیسے جیسے لوگوں کو خبر مل رہی تھی کہ میرا آپریشن ہو چکا ہے آنے والوں کا تانتا لگ گیا تھا جب کہ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کی میرے پاس باہر سے لوگ کم سے کم آئیں انفکشن کا خطرہ تھا۔ کچھ لوگوں کو تو بغیر ملے ہی واپس جانا پڑا۔ رمنیکا گپتا، شیوراج سنگھ 'بے چین'، انیتا بھارتی، اجے مشرا، رجنی تلک، سشیلا ٹاکبھورے (ناگ پور)، دہرادون سے گیتا گیرولہ، میرے بچپن کے دوست سکھن سنگھ، رام سنگھ ان کے بیٹے دنیش، رجنیش اور ان کی بیوی۔ روہتک سے اجمیر سنگھ 'کاجل'، مدن کشیپ، ہیم لتا مہیشوری، پونم، گلاب، سورج بڑتیا، دلیپ، موکیش اور کوشل پوار وغیرہ نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ یہ میرے لیے کامیابی کی طرح تھا۔ موکیش نے اسپتال میں جو میری دیکھ بھال کی ہے اسے کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ حیدرآباد سے ڈاکٹر دھرم پال اپنا کام دھندا چھوڑ کر کئی دن تک میری دیکھ بھال میں لگے رہے۔

کافی دن تک میں اسپتال میں رہا۔اسی دوران ڈاکٹر پلّو نے ہندو کالج سے طالب علموں کو میری دیکھ بھال کے لیے لگاتار بھیجتے رہے تھے۔ چندا دن بھر میرے ساتھ اسپتال میں رہتی اور رات میں بچّوں نے کبھی بھی چندا کو اسپتال میں نہیں رکنے دیا۔

''میڈم آپ جا کر آرام کیجیے رات میں، ہم 'سر' کی دیکھ بھال کریں گے۔''

میہر پانڈیا، اسیم اگروال، انکت، بھنور لال مینا، نوشاد علی، ستیا وغیرہ نے جس طرح میری خدمت گذاری کا مظاہرہ کیا وہ میرے لیے یقین کا سبب بنا۔ رات رات بھر جاگ جاگ کر ان طالب علموں نے میرا خیال رکھا۔ میرے گندے کپڑے بدلے، مجھے پاک صاف کرایا۔ان سب نے میرے اندر ایک عجیب سا احساس بھر دیا تھا ایک ایسا احساس جس نے میری سوچ اور یقین کو اور زیادہ مضبوط کیا تھا۔ میں نے چندا سے کہا تھا:
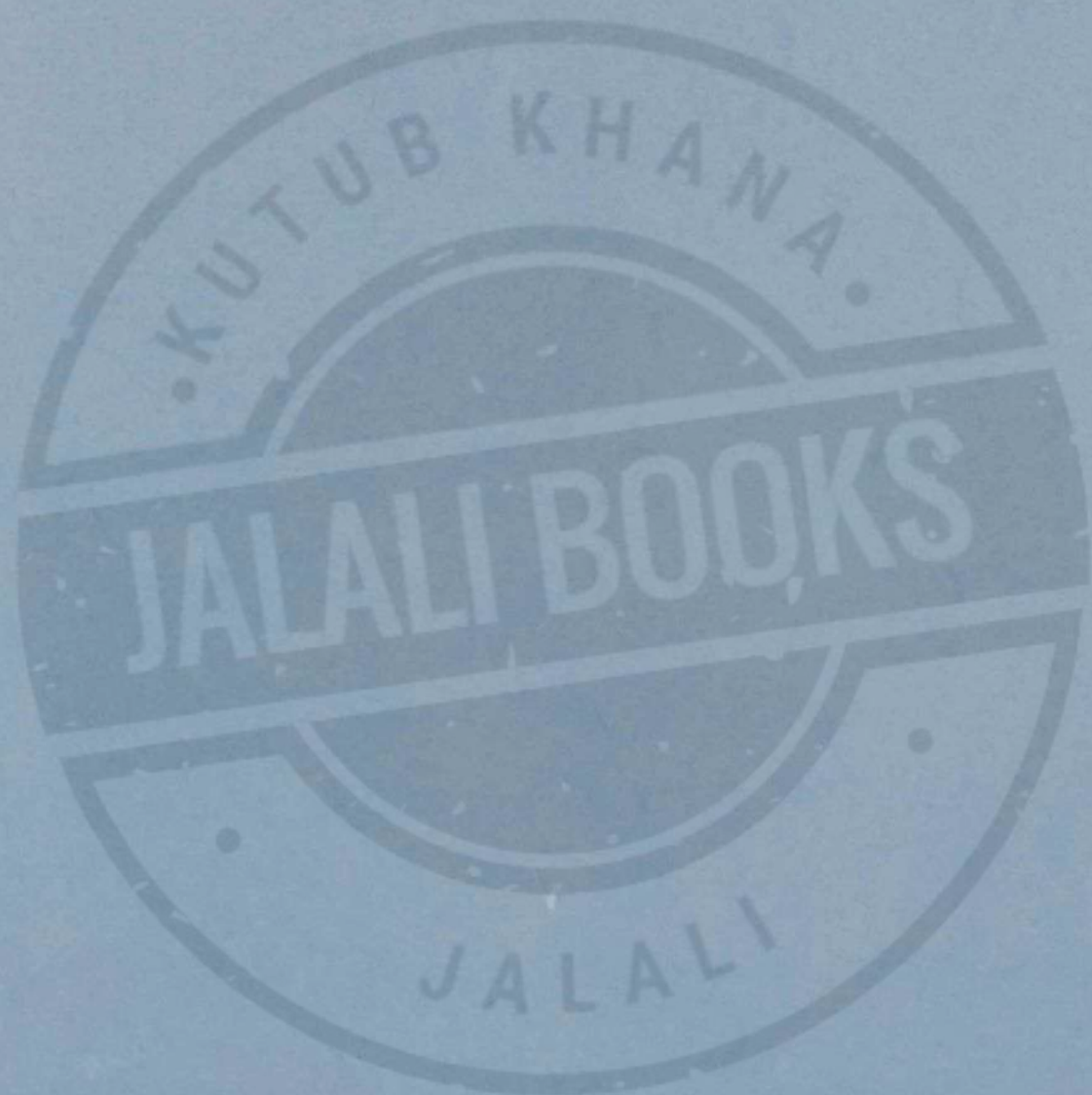
''دیکھو! تم پریشان رہتی تھیں کہ ہمارا اپنا کوئی بچہ نہیں ہے یہ بچّے جو اس وقت ذات پات بھول کر جس طرح میری خدمت کر رہے ہیں۔ کیا

ہمارے اپنے بچے ان سے زیادہ کر سکتے تھے؟ شاید نہیں ...یہ کون ہیں ہمارے؟ کیا رشتہ ہے ان سے؟ پھر بھی رات رات بھر جاگ کر میری خدمت کر رہے ہیں بغیر کسی غرض کے! کیا یہ میرے اپنے نہیں ہیں؟ ان بچوں نے ثابت کر دیا ہے کہ سماج بدل رہا ہے جسے پہچاننا ضروری ہے۔''

میری تمام شکایتیں شکست خوردہ ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر پلو اور ڈاکٹر دیویندر چوبے میری اس تکلیف میں ہر پل میرے ساتھ تھے۔ نمیتا گوکھلے، اشوک واجپئی، ریکھا اوستھی، مرلی منوہر پرساد سنگھ، وشوناتھ پرساد تیواری، رابندر کالیا، آلوک جین (گیان پیٹھ) اور اشوک مہیشوری (راج کمل) میرے ساتھ کھڑے تھے اور اس بیماری سے لڑنے کے لیے میرا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ ان سب کا میرے ساتھ کھڑا ہونا میری سوچ اور اعتقاد کو بدل رہا تھا۔

مکیش اور کوشل پوار نے رات دن ہر طرح میرا ساتھ دیا اور میری طاقت بنے۔ ڈاکٹر گلاب، ہیم لتا مہیشوری کا اپنا پن اور تعاون میری زندگی کی کامیابی ہے۔ کیلاش چند چوہان کے بارے جو بھی کہوں گا وہ کم ہی ہوگا۔ اس مشکل گھڑی نے ایک گھریلو اور قریبی دوست دیے۔ جن کو زندگی بھر اپنا بنا کر رکھنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ اسنگ گھوش نے جو کچھ بھی میرے لیے کیا، اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے زندگی جینے کا ایک مقصد دے دیا۔ میرے پرانے دوست شیو بابو مشر الگاتار میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ کیلاش وان کھیڑے وغیرہ کا ساتھ ملتا رہا ہے۔ بلاگس اور فیس بک کے ذریعے انیتا بھارتی، رجنی تلک اور اشوک۔ پانڈے نے جس طرح مجھے قارئین سے جوڑے رکھا وہ میرے لیے گہرے یقین کی اصل وجہ بنا۔ آج سوچتا ہوں اس غمگین گھڑی نے جہاں مجھ سے بہت کچھ چھینا ہے وہی بہت کچھ ایسا دیا ہے جس نے میرے اندر زندگی گذارنے کی گہری للک پیدا کر دی ہے۔ ایک بہت بڑی فیملی سے مجھے جوڑ دیا ہے جہاں نہ ذات کی دیواریں ہیں اور نہ مذہب کی۔

☆☆☆

(Vol. 2)

JHOOTAN

(AUTOBIOGRAPHY)

by

OMPRAKASH VALMIKI

Translated by

RAHEEN SHAMA

نام : راہین شمع

والد : محمد عثمان

جائے پیدائش : منصور پور معافی، شہباز پور کلاں۔ اسمولی، ضلع مراد آباد موجودہ ضلع سنبھل (یو پی)

تعلیم : عالمیت۔ جامعۃ الصالحات، رام پور (یو پی)

بی۔ اے۔ (آنرس) اردو۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (یو پی)

ایم۔ اے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (یو پی)

ایم۔ فل۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

پی۔ ایچ۔ ڈی (جاری) آل احمد سرور کی ادبی خدمات

زیر نگرانی: پروفیسر احمد محفوظ۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی)

پہلی مترجم کتاب : (ہندی سے اردو)

اوم پرکاش والمیکی کی آپ بیتی ''جھوٹن'' (جلد اوّل)

پتہ : 12/19H۔ سرسید روڈ، بٹلہ ہاؤس

جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ 110025

raheenhaya786@gmail.com

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

www.ephbooks.com

978-93-5073-901-3